"فضل الباری فی درس البخاری" مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے تلمیذ خاص حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ نے جمع فرمایا... کتاب کی اہمیت اور افادیت کے لیے صاحب افادات کا اسم گرامی اور ان کی نسبت ہی کافی ہے۔

حضرت اقدس مفتی ابو القاسم نعمانی صاحب مدظلہم
مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

برصغیر میں بخاری شریف کے دروس مختلف ناموں سے شائع ہوئے ہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب عارف باللہ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب شروانی جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات وافاضات مسمی بہ "فضل الباری فی دروس البخاری" ہے جسے حضرت مولانا حافظ قاری مفتی نصیر احمد صاحب ادریس پوری رحمۃ اللہ علیہ (سابق صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد) نے مرتب کیا تھا اور صاحب درس ہی کے زمانہ میں شائع ہوئے تھے۔

اب جدید اشاعت کے لیے کچھ دوسرے علماء نے تخریج اور حواشی مفیدہ پر کام کیا ہے۔

مرشد العلماء حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب آدام اللہ فیوضہم
شیخ الحدیث و سابق صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات

بخاری شریف از ابتدا تا کتاب الایمان کا درس حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے متعلق ہوتا تھا، والد صاحب مرحوم نے باوجود حضرت مسیح الامتؒ سے تلمذ و تعلم کے، مفتاح العلوم جلال آباد میں مدرس و مفتی ہونے کے بعد باقاعدہ حضرت والاؒ کے درس میں شرکت کر کے آپ کے ۱۳۸۲ھ، ۱۳۸۳ھ کے دروس کے انضباط و ترتیب کا کارنامہ انجام دیا، اولاً آپ درس کو ضبط کرتے پھر حضرت والا کے ملاحظہ سے گذارتے، اس طرح آپ نے دروس بخاری کو "فضل الباری" کے نام سے ترتیب دے کر حاضرین اور مابعد کے لوگوں کے لیے کتابی شکل میں ایک یادگار تحفہ دیا۔

حضرت مولانا محمد کامل صاحب ادریس پوری مدت فیوضہم
(فرزند ارجمند حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحبؒ)

اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

فضل الباری فی درس البخاری

جلد سوم

افادات: مسیح الامت حضرت اقدس مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ
خلیفہ اجل حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مرتب: مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

تخریج و تعلیق زیر سرپرستی: حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم
خلیفہ اجل مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ

ناشر
مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، انگلینڈ
ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت، باغپت، یوپی، الہند





اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

فضل الباری

فی

درس البخاری

جلد سوم

افادات

مسیح الامت حضرت اقدس مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ
خلیفہ اجل حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مرتب

مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نفیس احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ
تلمیذ خاص حضرت مسیح الامت وسابق استاذ حدیث وفقہ وصدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد

تخریج وتعلیق
زیر سرپرستی

حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم
خلیفہ مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادیؒ

ناشر

مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، انگلینڈ
ادارہ فیض مسیح الامت بڑوت، باغپت، یوپی، الہند

تفصیلات

کتاب کا نام : **فضل الباري في درس البخاري جلد سوم**

صاحب افادات : مسیح الامت حضرت اقدس مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ

مرتب : مفکر ملت حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

جدید ایڈیشن مع تخریج و تعلیق

زیر سرپرستی : حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم (باٹلی، انگلینڈ)

تخریج و تعلیق : مولانا عظیم الدین صاحب ارنالوی

معاونت و مراجعت : مولانا خلیل احمد قاضی صاحب (ڈیوزبری، انگلینڈ)

مساعی جمیلہ و نظر آخر : مولانا محمد کلیم نعمانی قاسمی (نواسۂ حضرت مفکر ملتؒ)

سن اشاعت جدید : ۱۴۴۳ھ مطابق ۲۰۲۲ء

صفحات :

ملنے کے پتے

(۱) مدینہ اکیڈمی، ڈیوزبری، انگلینڈ

Madina Academy, Swindon Road, Dewsbury, West Yorkshire,
WF13 2PA, England
Tel: 00 44 7852 762 632 / Website: madinaacademy.org.uk

(۲) ادارہ فیض مسیح الامت، بڑوت باغپت، انڈیا

Tel: 0091 70789 18086

(۳) قاری عبدالحق دیوان صاحب لاجپور، ضلع: سورت، گجرات، انڈیا

Tel: 0091 73837 03789

دیوبند کے سبھی بڑے کتب خانے

فہرست مضامین

❀ ❀ ❀

الدرس الرابع والثلاثون

بَابٌ: مِنَ الإِيمَانِ أَنْ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ

۱۲ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَعَنْ حُسَيْنٍ الْمُعَلِّمِ، قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ.

حدیث پر ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں پر لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ اپنے لیے اپنی بیوی کو پسند کرتا ہے تو کیا اپنے بھائی کے لیے بھی اس کو گوارا کرے اور پسند کرے؟۔

(اس کا جواب یہ ہے:) سو وہ تو اس کے لیے حرام ہے اور گفتگو مباحات میں ہے۔ جو اس کے لیے حرام ہیں، وہ تو اس سے مستثنیٰ ہیں اور بھائی سے مراد اسلامی بھائی ہے کما فی قولہ تعالیٰ: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات: ۱۰] (۱)۔

کافر کو بھائی کہنا غلط ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ کافر کو بھائی کہنا غلط ہے، ہاں پڑوسی کہہ سکتے ہیں، نہ اس سے رشتہ داری جائز ہے (۲)۔ ایک صاحب نے اس پر اعتراض کیا کہ قرآن

(۱) قوله: (لأخيه) أي للمسلمين تعميماً للحكم قال الله تعالى: "إنما المؤمنون إخوة" (الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري للكرماني: ۱/۹۵).

(۲) لِأَنَّهُ جَعَلَ الْأُخُوَّةَ بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ فَقَالَ {إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ} [الحجرات: ۱۱] وَقَطَعَ ذَلِكَ بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْكَافِرِينَ. (الأم للشافعي رحمه الله: ۶/۴۰)

شریف میں جگہ جگہ انبیاء کو کفار کا بھائی کہا مثلاً: ﴿وَلَقَدۡ أَرۡسَلۡنَآ إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمۡ صَٰلِحًا﴾ [النمل: ۴۵] وأمثالہ، اس کے جواب میں فرمایا کہ امم سابقہ میں نکاح بہ وجہ ضرورت کے کفار سے جائز تھا، ان سے رشتہ داری اسی واسطے جائز تھی؛ لیکن ہماری اس شریعت میں رشتہ داری کافر سے جائز نہیں۔

بَابٌ: حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ

۱۳ - حَدَّثَنَا أَبُو اليَمَانِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ، عَنِ الأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ.

۱۴ - حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُلَيَّةَ، عَنْ عَبْدِ العَزِيزِ بْنِ صُهَيْبٍ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، وحَدَّثَنَا آدَمُ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ.

حب سے مراد حب عقلی ہے (۱) اور بعضوں کی حب عقلی سے طبعی ہو جاتی ہے، یاد رکھیئے کہ جب تک حب طبعی نہ ہو تو اس میں اختلال رہتا ہے (۲)، اس حدیث

(۱) وليس المراد الحب الطبيعي؛ لأنه لا يدخل تحت الاختيار، {لا يكلف الله نفسا إلا وسعها} [البقرة: ۲۸۶] بل المراد الحب العقلي الذي يوجب إيثار ما يقتضي العقل رجحانه، ويستدعي اختياره، وإن كان على خلاف الهوى كحب المريض الدواء، فإنه يميل إليه باختياره، ويتناول بمقتضى عقله، لما علم وظن أن صلاحه فيه، وإن نفر عنه طبعه إلخ (مرقاة: ۱/۳۷، كتاب الإيمان، الفصل الأول)

(۲) یعنی علماء نے حدیث میں حب سے چاہے حب عقلی مراد لی ہو لیکن اصلاً حب طبعی مقصود ہے، حضرت کشمیریؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ←

میں والدین سے احب ہونا فرمایا گیا ہے، چوں کہ یہ دونوں سب سے محبوب ہوتے ہیں تو جب ان سے زیادہ احب ہونے کو بتلایا تو گویا ہر شئے سے احب ہونے کا حکم ہوا(۱)، نیز دوسری حدیث میں ''الناس أجمعين'' کا لفظ بھی ہے تو پھر کوئی اشکال باقی ہی نہیں رہتا۔

بَابُ حَلاَوَةِ الإِيمَانِ

١٥ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ المُثَنَّى، قَالَ:حَدَّثَنَا عَبْدُ الوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ، قَالَ:حَدَّثَنَا أَيُّوبُ، عَنْ أَبِي قِلاَبَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:" ثَلاَثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلاَوَةَ الإِيمَانِ:أَنْ يَكُونَ اللَّهُ

← وليس الحبُّ فيه هو الشرعي، أو العقلي، كما قاله البيضاوي :إن الحب عقلي، وطبعي، والمراد هو العقلي، وقد مر مني أن الحب صفة واحدةٌ، تختلف باختلاف المتعلَّق، إن صرفتَها إلى الآباء والأبناء، سميت طبعية، وإن صرفتها إلى الشرع، سُميت شرعية، فالفرق باعتبار المتعلَّق، كيف وقول الله تعالى :{قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا} ..إلخ [التوبة: ٢٤] أوجب أن يكونَ حبهما أزيدَ من الكل، وحب هذه الأشياء ليس إلا طبعيًا إلخ. حضرت نے اپنے اس دعوی کو اور دلائل کے ساتھ بھی مدلل کیا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے:(فیض الباري: ١/١٥٧)

(١) إنما خص الولد والوالد بالذكر لكونهما أعز خلق الله عز وجل على الرجل غالباً وربما يكون أعز من نفس الرجل على الرجل فذكرهما إنما هو على سبيل التمثيل فكأنه قال حتى أكون أحب إليه من أعزته ويعلم أيضاً منه حكم غير الأعزة لأنه يلزم في غيرهم بالطريق الأولى أو اكتفى بما ذكر في سائر النصوص الدالة على وجوب كونه أحب من نفسه أيضاً كالرواية التي بعده.(الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري للكرماني: ١/٩٧.)

وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لاَ يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ.

حلاوت کا معنی ومفہوم اوراس کی قسمیں

حلاوت بمعنی لذت: لذت دوقسم کی ہوتی ہے (۱) حسی (۲) معنوی (۱)، اول کا تعلق حس سے ہوگا اور وہ ذائقہ انسان کے ساتھ متعلق ہے اور وہ لمس جسم کے ساتھ، مثلاً بدن کے اندر سردی ہے تو حرارت کے چھونے سے لذت حاصل ہوگی، اس کے واسطے سے پھر قلب یا بدن میں گرمی ہے تو برودۃ وسردی کے چھونے سے لذت حاصل ہوگی پھر بدن کے واسطے سے قلب کو لذت حاصل ہوگی، اسی طرح غذا کھانے سے لذت زبان کو حاصل ہوتی ہے، پھر اس کے واسطے سے قلب کو لذت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری قسم معنوی ہے، اس کا تعلق غیر مادی سے ہے نہ کہ مادی یعنی جسم سے، اس واسطے کہ حس کا تعلق مادی سے ہوتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ محسوسات وہی اشیا ہوتی ہیں جو کہ مادی ہوں، برخلاف معنی کے کہ وہ خود غیر مادی ہے، اس واسطے اس کا تعلق بھی غیر مادی سے ہوگا یعنی روح وقلب سے تو معلوم ہوا کہ مادی کا مادی کے ساتھ استعمال کرنے سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر مادی کو غیر مادی کے ساتھ استعمال کرنے سے لذت معنوی حاصل ہوگی اور وہ غیر مادی جس کے استعمال سے لذتِ معنوی حاصل ہوتی ہے، وہ اعمال ہیں اور اعمال دوقسم کے ہوتے ہیں اور اس کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ مال کے حاصل کرنے میں اگرچہ تعب

---

(۱) وحلاوة الإيمان استلذاذه بالطاعات عند قوة النفس بالإيمان وانشراح الصدر له بحيث يخالط لحمه ودمه. وهل هذا الذوق محسوس أو معنوي إلخ. (إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري: ۱/۹۸، ۹۷.)

وشدت حاصل ہو، لذت حاصل ہوتی ہے، خوشی ہوتی ہے اور اسی خوشی کی وجہ سے تعب و مشقت معلوم نہیں ہوتی، ٹھیک اسی طرح روح کی لذت ہے ایمانیات واسلامیات کے ساتھ، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کرتے وقت قلب کو فرحت محسوس ہوتی ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ ان میں مشقت معلوم نہیں ہوتی، یہ معنی ہیں قلب کو حلاوۃ حاصل ہونے کے؛ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ اعمال سے قلب کو لذت حاصل ہوتی ہے۔

ثَلاَثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلاَوَةَ الإِيمَانِ: یہاں "حَصَلَ" کا یا "اِسْتَلَذَّ" یا "ذَاقَ" کا لفظ نہیں کہا؛ بلکہ "وَجَدَ" کہا جو وجدان سے ہے جس کا تعلق قلب سے ہے، اس میں اشارہ ہے کہ لذت معنوی ہوتی ہے، أَنْ يَكُونَ اللهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا: "أَحَبَّ" فرمایا، اس میں اشارہ ہے اس کی طرف کہ اور شئے سے محبت کرنا ایمان کے منافی نہیں ہے؛ لیکن سب سے زیادہ محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہونی چاہیے، غلبہ جو ہو، وہ شئے آخر کی محبت کا نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا ہو۔

حب للہ اور بغض فی اللہ کی اہمیت

وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لاَ يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ: معلوم ہوا کہ جہاں "حبُّ الله" اور "حبُّ الرسول" ضروری ہے، وہیں "الحب لله وللرسول" بھی ضروری ہے، یہی معنی ہیں "الحب فی الله والبغض فی الله" کے یعنی کہ کسی مؤمن آدمی سے محبت اپنی کسی غرضِ دنیوی کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے لیے ہو۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا: تم میرے لیے کیا کرتے ہو؟ عرض کیا کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں، وغیرہ، ارشاد ہوا کہ یہ تو تم جنت کے لیے کرتے ہو، میرے لیے کیا کرتے ہو؟ عرض کیا:

آپ کی نافرمانیوں سے باز رہتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ یہ تو تم دوزخ سے بچنے کے لیے کرتے ہو، میرے لیے کیا کرتے ہو؟ عرض کیا: تورات کی تلاوت اور تسبیح پڑھتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ یہ تو اس لیے کرتے ہو کہ درجاتِ علیا حاصل ہوں، میرے لیے کیا کرتے ہو؟ عرض کیا : یا اللہ! آپ ہی ارشاد فرمادیں کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کے لیے ہو؟، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :**هل وَالَيْتَ لي ولياً قط وهل عَادَيْتَ فِيَّ عَدُواً قط**؟: اے موسیٰ! کیا تم نے کبھی میرے لیے کسی سے دوستی اور دشمنی کی ہے؟"**فعلم موسى أن أفضل الأعمال الحب في الله والبغض في الله**" : اللہ تعالیٰ کے اس جواب سے حضرت موسیٰؑ سمجھ گئے کہ "**الحب في الله والبغض في الله**" ہی سب سے افضل عمل ہے(۱)۔

یہ ہے وہ "**الحب للہ والبغض فی اللہ**"، اگر یہ نہ ہو تو ایمان میں اسی قدر کمی ہوگی، جتنی یہ زیادہ ہوگی، اسی قدر حلاوت زیادہ ہوگی اور ایمان میں بھی، اس طرح ایمان کے اندر کمی زیادتی ثابت ہوگئی۔

اور "**الحب للہ**" کی پہچان یہی ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے، کسی کی چوری نہ کرے، کسی کو ذلیل نہ کرے، جو چیز اپنے لیے پسند آئے، وہی دوسرے کے لیے بھی پسند کرے، جس کو اپنے لیے ناپسند کرے، اس کو دوسرے کے لیے بھی ناپسند کرے، اور حاجت والے کی حاجت روائی کرے، صلہ رحمی کرے، خلاصہ یہ کہ اپنے سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، حاضرانہ بھی اس کی عزت کرے اور غائبانہ بھی اس کی عزت کرے۔ اور دونوں حالتوں میں ایذا رسانی سے احتراز کرے۔

"**وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّار**": یعنی جیسے طبعاً آگ میں ڈالے جانے سے نفرت ہے، ایسی ہی ارتداد سے بھی نفرت ہو۔

---

(۱) إحياء علوم الدين:۱۶۰/۲، كِتَابُ آدَابِ الْأُلْفَةِ وَالْأُخُوَّةِ وَالصُّحْبَةِ وَالْمُعَاشَرَةِ مَعَ أصناف الخلق.

بَابٌ :عَلاَمَةُ الإِيمَانِ حُبُّ الأَنْصَارِ

۱۶ - حَدَّثَنَا أَبُو الوَلِيدِ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ :أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَبْرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: آيَةُ الإِيمَانِ حُبُّ الأَنْصَارِ، وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الأَنْصَارِ.

انصار ان کو کہا جاتا ہے جنہوں نے حضور اقدس ﷺ کی نصرت اور اسلام کی ہر طریقہ سے جان سے مال سے امداد کی (۱)۔

اوپر حدیث میں تعمیم تھی :"وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لاَ يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ" اور یہاں تخصیص ہے اور ایسا ہو ہی جاتا ہے یعنی تخصیص بعد التعمیم اور اس لیے فرمایا کہ انھوں نے اسلام کی بہت زیادہ مدد کی اور سب سے زیادہ مدد کی اور سب سے اول ان حضرات نے ہی حصہ لیا اسلام کے پھیلانے میں، اس واسطے جب اسلام سے، ایمان سے محبت ہوگی اور اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ہوگی تو ضروری ہے کہ ان کی بھی محبت ہو (۲)۔

۱۷ - حَدَّثَنَا أَبُو اليَمَانِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ : أَخْبَرَنِي أَبُو إِدْرِيسَ عَائِذُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، أَنَّ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَهُوَ أَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ العَقَبَةِ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ،

---

(۱) والأنصار جمع نصير كشريف وأشراف أو جمع ناصر كصاحب وأصحاب واللام للعهد أى أنصار الرسول ﷺ واختص عرفا بأصحاب المدينة الذين آووا ونصروا وهم المبتدئون بالبيعة على إعلان توحيد الله تعالى وشريعته.(الكواكب الدراري : ۱/۹۵.)

(۲) لما فرغ من الحُبِّ مطلقًا وكان عامًا، أَرْدَفَه بذكر محبة الطائفة، وانتخب منها الأنصار، وجعلها علامةُ الإيمان، فذكر أولًا :الإيمان، ثم حلاوتَه، ثم علامته ومأخذ الحديث.(فيض الباري: ۱/۱۵۹)

وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ: بَايِعُونِي عَلَى أَنْ لاَ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلاَ تَسْرِقُوا، وَلاَ تَزْنُوا، وَلاَ تَقْتُلُوا أَوْلاَدَكُمْ، وَلاَ تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلاَ تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ.

بابِ ھٰذا کی ماقبل سے مناسبت

یہ باب بلاعنوان قائم کیا۔ اس کی وجہ مناسبت ماقبل سے یہ ہے کہ اوپر انصار کے متعلق آچکا: " عَلاَمَةُ الإِيمَانِ حُبُّ الأَنْصَارِ" اوراس میں بھی انصار کا ذکر ہے(۱)۔

" أَنَّ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا": یہ اس واسطے ذکر کیا کہ اس سے راوی کی فضیلت معلوم ہوجائے، یا اس کے ذریعہ سے پھر روایت کا قوی ہونا خود معلوم ہوجائے گا۔

بیعت عقبہ کا پس منظر

" وَهُوَ أَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ العَقَبَةِ": ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے، مکہ رہتے ہوئے حضور اقدس ﷺ کا یہ دستور تھا کہ حج کے زمانے میں چوں کہ مختلف دیار سے مختلف قبائل کے آدمی حج کو آتے تھے، آپ ان کو تبلیغ کرتے تھے(۲)

(۱) وله أيضا تعلق بحب الأنصار من حيث ان النقباء كانوا منهم ولمبايعتهم أثر عظيم في اعلاء كلمة الدين فلابد من محبتهم والله أعلم.(الكواكب الدراري : ۱/۱۰۳.)

(۲) (الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري للكرماني: ۱/۱۰۴.)

چناں چہ اسی طرح مدینہ سے بھی کچھ آدمی آئے، مدینہ کے بڑے بڑے سردار تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو تبلیغ کی، وہ ایمان لے آئے، جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں تعلیم کی اور تبلیغ کا حکم کیا، انھوں نے جا کر اس کی تبلیغ کرنا شروع کی، اسلام پھیلنا شروع ہوا، یہ بارہ آدمی تھے، احد النقباء مشیر ہے اس کی طرف کہ بہت سے تھے، چناں چہ ان کی تعداد جیسا کہ ابھی بتلائی گئی ۱۲ ر کی تھی (۱)، اور رہا یہ کہ عبادہ بن صامت رضؓ کا ہی کیوں تذکرہ کیا؟ سو ان کی عظمت شان کی وجہ سے ان کا ذکر کیا۔

بیعت اصلاحی وتربیتی کا ثبوت

''بَايِعُونِي عَلَى أَنْ لاَ تُشْرِكُوا بِاللهِ شَيْئًا'': اس سے معلوم ہوا کہ بیعت اصلاحی اور تربیتی بھی ہے کہ باوجود ان حضرات کے مؤمن ہونے کے بَايِعُونِي فرمایا، لہٰذا اہل حدیث غیر مقلدین کا یہ اعتراض کہ یہ بیعت کا سلسلہ بدعت ہے، ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں سے ثابت ہوتا ہے، بخاری کی حدیث ہے۔

رہا یہ کہ ''أَنْ لاَ تُشْرِكُوا بِاللهِ شَيْئًا''، کیوں فرمایا؟ وہ تو اس سے پاک تھے، مؤمن تھے، مشرک نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تاکیداً ہے، جیسے جب ہمارے یہاں بیعت کے وقت عہد لیا جاتا ہے کہ شرک تو نہیں کروگے، چوری تو نہیں کروگے وامثالہ، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ شرک سے اب توبہ کر رہے ہیں؛ بلکہ بہ طور تجدید کے عہود لیے جاتے ہیں۔

---

(۱) وهم اثني عشر رجلا وهم العصابة المذكورة :أسعد بن زرارة. وعوف بن الحارث. وأخوه معاذ وهما ابنا عفراء. وذكوان بن عبد قيس وذكر ابن سعد في طبقاته أنه مهاجري أنصاري. ورافع بن مالك الزرقيان. وعبادة بن الصامت. وعباس بن عبادة بن نضلة. ويزيد بن ثعلبة من بلى. وعقبة بن عامر. وقطبة بن عامر، فهؤلاء عشرة من الخزرج. ومن الأوس:أبو الهيثم بن التيهان من بلي. وعويم بن ساعدة.(عمدة القاري شرح صحيح البخاري: ۱/ ۱۵۶)

"أَيۡدِيكُمۡ وَأَرۡجُلِكُمۡ" :اس سے انسان کی ذات مراد ہے اور خصوصی طور پر ہاتھ اور پیروں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ انسان زیادہ تر ان ہی دوعضو سے اپنے کام انجام دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی پر اپنی ذات کی طرف سے کوئی تہمت مت گھڑو، یا اس سے قلب مراد ہے کہ وہ ہاتھ اور پیر کے درمیان ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے دل سے کسی گناہ کا افتراء کر کے اس کا الزام کسی پر نہ دھرو، کیوں کہ جب انسان کسی پر افتراء کرنا چاہتا ہے تو اپنے دل میں پہلے اس گناہ کا تعین کرتا ہے کہ کون سے گناہ کا الزام لگانا ہے، یا "أَيۡدِيكُمۡ" سے حال اور "أَرۡجُلِكُمۡ" سے مستقبل مراد ہے اور مطلب ہے کہ کبھی بھی کسی پر افتراء مت کرو(۱)۔

اس کے بعد " فَمَنۡ وَفَى مِنۡكُمۡ فَأَجۡرُهُ عَلَى اللهِ" ہے، اس میں "فَأَجۡرُهُ عَلَى اللهِ" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ گویا ان اعمال کا اجر دینا اللہ تعالی پر لازم ہے لیکن یہ لزوم حقیقی پر مبنی نہیں بلکہ اللہ تعالی اپنی رحمت سے ہمارے ساتھ ایسا معاملہ فرمائیں گے، اس کو بیان کرنا ہے(۲)، یہ محض تمثیل ہے، جیسے ﴿وَأَقۡرِضُوا اللهَ قَرۡضًا حَسَنًا﴾ [المزمل: ۲۰] اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالی کو ہمارے قرضے کی ضرورت ہے بلکہ محض تمثیلاً کہہ دیا۔

"وَمَنۡ أَصَابَ مِنۡ ذَلِكَ شَيۡئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنۡيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ": اس میں اختلاف ہے کہ گنہگار پر اس کے گناہ کی حد جاری ہونے کے بعد آخرت میں اس گناہ پر اس کی سزا ہوگی یا نہیں؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دنیا میں حدود و تعزیرات یہ ہی کفارہ ہو جاتی ہیں، اگر وارد کی جائیں، آخرت میں اس گناہ کا

(۱) عمدة القاري شرح صحيح البخاري: ۱/۱۶۰، ۱۵۹.

(۲) فأجره على الله أي :بطريق التفضل والإحسان كما يقوله أهل السنة لا بطريق الاستحقاق والوجوب كما يقوله المعتزلة، فإن الله لا يجب عليه إثابة المطيع ولا تعذيب العاصي، إن أثاب المطيع فبفضله، أو عذب العاصي فبعدله.(شرح البخاری للسفيری : ۱/۱۳۱۴.)

عذاب نہیں دیا جائے گا، وہ اس حدیث کے ظاہر کو لیتے ہیں، اس سے استدلال کرتے ہیں، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حدود وتعزیرات نظامِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے ہے، ان سے گناہ معاف نہیں ہوتے، معافی کے لیے توبہ ضروری ہے(۱)۔

بَابٌ :مِنَ الدِّينِ الفِرَارُ مِنَ الفِتَنِ

١٨ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ :يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ المُسْلِمِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الجِبَالِ وَمَوَاقِعَ القَطْرِ، يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الفِتَنِ.

بابِ ہٰذا کی کتاب الایمان کے ساتھ مناسبت

”مِنَ الدِّين“ سے اشارہ ہے کہ دین وایمان ایک ہی شئے ہے، اس واسطے کتاب الایمان کے تحت اس باب کو رکھا(۲)۔

تجارتِ غنم بہترین تجارت کیوں ہے؟

یہاں بتلاتے ہیں کہ من جملہ دین کی چیزوں کے فتن سے بھاگنا بھی ہے یعنی جب کہ دین میں اختلال کا غالب اندیشہ ہو تو دین کی حفاظت کے واسطے بھاگ جانا امن کی جگہ، اس واسطے فرمایا خَيْرُ مَالِ المُسْلِمِ غَنَمٌ کہ پیشوں میں

(۱) اس بحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے:(فيض الباري: ١/١٦٠، بحثٌ نفيسٌ في أنَّ الحدودَ كفَّاراتٌ أم لا؟)

(۲) قوله :(من الدين) هذا حيث لم يقل من الايمان مع أن عقد الكتاب انما هو فى الايمان مشعر بأن الدين والايمان واحد كما أن الايمان والاسلام أيضا عنده واحد. (الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري: ١/١٠٨)

تجارت، زراعت، ملازمت میں اپنی تجارت کا پیشہ اچھا ہے، پھر اس میں بھی تجارتِ غنم اچھی چیز ہے، اس واسطے کہ بھاگ جانا وہ مفید ہے کہ شہر میں جنگل میں سے آنا ہی نہ ہو، اور تجارتِ غنم کے علاوہ دوسری تجارتوں میں ضرورت ہوتی ہے کہ کھانے کے لیے شہر میں آنا ہوتا ہے، برخلاف تجارتِ غنم کے کہ دودھ نکال کر اس کے سہارے بسر ہوسکتی ہے، اس لیے کہ دودھ میں غذائیت وطعمیت دونوں موجود ہیں، شہر میں آنے کی حاجت باقی نہیں رہتی، اسی واسطے فرمایا کہ دنیا تحصیل دین میں معین ہے۔

مواقع بارش میں جانے کو کیوں فرمایا؟ اس واسطے کہ بارش سے چراگاہیں اگتی ہیں، ان کے لیے کھانے کا انتظام ہوتا ہے(۱)۔

تو معلوم ہوا کہ دین کو بچا کر فتنوں سے بھاگنا دین کی بات ہے اور دین وایمان ایک چیز ہے تو بھاگنا ایمان کی بات اور نہ بھاگنا نقص کی بات، لہٰذا معلوم ہوا کہ ایمان کی ہی زیادتی ہوتی ہے۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ:أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ. وَأَنَّ المَعْرِفَةَ فِعْلُ القَلْبِ،لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى:{وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ} [البقرة :۲۲۵]

۱۹ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلاَمٍ، قَالَ:أَخْبَرَنَا عَبْدَةُ، عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ:كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَمَرَهُمْ، أَمَرَهُمْ مِنَ الأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ، قَالُوا:إِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، فَيَغْضَبُ حَتَّى يُعْرَفَ الغَضَبُ فِي وَجْهِهِ، ثُمَّ يَقُولُ :إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللَّهِ أَنَا.

(۱) ومواقع القطر أي :بطون الأودية والصحاري، وخص هذه المواضع بالذكر لأنها مظان المرعى.(شرح البخاری للسفیری: ۱/۴۴۳.)

کتاب الایمان کے ساتھ اس باب کی مناسبت

اوپر کہا تھا کہ اسلام قول و فعل ہے یعنی ایمان قول و فعل ہے، اس لیے کہ عند النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام، ایمان، دین ایک ہی چیز ہے تو اب یہاں علم ہے اور علم نہ قول ہے، نہ فعل ہے تو اشکال ہو گیا کہ اس باب کو کتاب الایمان سے کیا مناسبت؟ اس اعتراض کو دفع کرنے کے واسطے فرمایا: ''وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ''، گویا فعل سے مراد عام تھا کہ خواہ فعل جوارح ہو یا فعل قلب، لہٰذا علم فعل قلب ہے اور اسی کا نام تصدیق ہے، جب تصدیق فعل ہوا اور ایمان نام تھا فعل و قول کا، لہٰذا علم کا ایمان سے ہونا ثابت ہو گیا(۱)۔ اس پر دلیل اللہ تعالی کے قول کو ٹھہرایا کہ جس طرح فعل جوارح پر مواخذہ ہوگا، اسی طرح فعل قلب پر یعنی خطراتِ قلب پر بھی مواخذہ ہوگا، مثلاً کسی کا نقشہ آپ کے دل میں قائم ہو گیا، اب اس سے آپ محظوظ ہوتے ہیں، لذت حاصل کرتے ہیں تو اس پر مواخذہ ہوگا تو اگر معاصی کا خطرہ قلب میں ہے تو ایمان میں کمی ہے، اور اگر توجہ الی اللہ ہے، ذکر قلبی ہے تو زیادتی، لہٰذا ایمان میں کمی زیادتی ثابت ہو گئی۔

دین اسلام میں رہبانیت شجرۂ ممنوعہ ہے

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَمَرَهُمْ، أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ: یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسے اعمال کی کا حکم فرماتے تھے جن پر وہ دوام کی طاقت رکھتے ہوں اور دوام ان اعمال پر ہوتا ہے جن کی طاقت ہو، اس واسطے ''**بِمَا يُطِيقُونَ**'' کہا۔ قصہ یہ ہے کہ مشکوۃ میں ہے: ''**عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ، يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ**،

---

(۱) عمدة القاري: ۱/۱۶۴.

فَلَمَّا أُخْبِرُوا بِهَا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوهَا، فَقَالُوا:أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ؟ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ:أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا، وَقَالَ الآخَرُ :أَنَا أَصُومُ النَّهَارَ أَبداً وَلاَ أُفْطِرُ، وَقَالَ الآخَرُ:أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلاَ أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَيهِمْ فَقَالَ»:أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا، أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي. (۱)۔

ایک مرتبہ تین صحابی آئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے حضور اکرم ﷺ کی عبادت کے بارے میں دریافت کرنے لگے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے فرمایا کہ کچھ حصہ رات کو سوتے ہیں، کچھ حصہ میں جاگتے ہیں، عبادت کرتے ہیں اور کبھی بیویوں کے پاس رہتے ہیں، کبھی علیحدگی اختیار کرتے ہیں، اس بات کو سن کر تینوں نے آپس میں گفتگو شروع کی: ایک نے کہا کہ تمام رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں صائم النہار رہا کروں گا،تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے علیحدگی اختیار کروں گا۔ اتنے میں آپ تشریف لائے، فرمایا: **لا رهبانية في الإسلام(۲)**، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں سوتا بھی ہوں، عبادت بھی کرتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں اور میں عورتوں سے بھی بالکل علیحدگی نہیں رکھتا (او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام) دراں حالے کہ **أَعْلَمَكُمْ بِاللهِ أَنَا**: اور تم اس طرح اس طرح کہتے ہو! آپ ﷺ نے غصہ فرمایا، یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے اور

---

(۱) مشكوة المصابيح،باب الاعتصام بالكتاب والسنة،الفصل الأول.

(۲) ”لا رهبانية في الإسلام.“قال ابن حجر لم أره بهذا اللفظ، لكن في حديث سعد بن أبي وقاص عند البيهقي:"إن الله أبدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة"(كشف الخفاء ومزيل الإلباس:۲/ ۲۶۶،رقم الحديث:۳۱۵۴.)

طاقت سے زیادہ کام کرنا غلو فی الدین ہے۔

"قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ" پر

ایک اشکال اور جواب

"إِنَّ اللهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ": یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اس سے تو معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاصی کا ارتکاب ہوا یا ہوتا ہے، چوں کہ بخشش اسی وقت کسی شئے کی ہوتی ہے، جب کہ وہ موجود بھی ہو، وجود میں آئی بھی ہو، حالاں کہ اہل سنت والجماعت کا یہ مذہب ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے بالعموم اور ہمارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بالخصوص معاصی کا صدور نہیں ہوتا، وہ اس سے پاک اور بالاتر ہیں، تو یہاں اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ورنہ پھر اس کی کیا توجیہ ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی دو شان ہیں: ایک قبل البعثت اور ایک بعد البعثت تو ایک جماعت کی رائے یہ ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ قبل نبوت صدور معاصی انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام سے ممکن ہے اور بعد نبوت کے صدور نہیں ہوتا تو اس صورت پر کہا جائے گا کہ قبل البعثت اگر صدورِ معاصی ہو تو وہ معاف ہے(۱)؛ لیکن ان حضرات پر اشکال باقی رہا جو کہتے ہیں کہ انبیاء سے نہ قبل البعثت معاصی کا صدور ہوتا ہے اور نہ بعد البعثت، اس واسطے کہ قرآن شریف میں ہے: وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ [طٰهٰ]، خود قرآن شریف میں موجود ہے۔

(۱) قَالَ الطَّبَرِيُّ: هُوَ رَاجِعٌ إِلَى قَوْلِهِ تَعَالَى "إِذا جاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ- إلى قوله- تَوَّاباً" [النصر: ۳.] "لِيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ" قَبْلَ الرِّسَالَةِ" وَما تَأَخَّرَ" إِلَى وَقْتِ نُزُولِ هٰذِهِ الْآيَةِ.(تفسیر القرطبی: ۲۶۲/۱۶، فی تفسیر هٰذه الآیة "لِيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ".)

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے گناہ کی حقیقت سمجھیے! درحقیقت گناہ اس کو کہتے ہیں جس سے نافرمانی میں اپنے عزم کو دخل ہو، اس کو معصیت کہتے ہیں اور جس میں اپنے عزم کو دخل نہ ہو، اسے معصیت نہیں کہتے، اب دیکھیے کہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر ہمارے حضور اقدس ﷺ تک جتنے انبیاء گذرے ہیں، اگر ان سے نافرمانی ہوئی تو کیا اس میں ان کے قصد کو بھی دخل تھا؟ تو جب ہم کتب تاریخ وسیر وتفاسیر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قصد نہیں تھا(۱)۔

بَابٌ: مَنْ كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ مِنَ الإِيمَانِ

٢٠ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: " ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ

(۱) حضرت آدمؑ والی خطا کے بارے میں خود اللہ تعالی نے عزم کی نفی فرمائی ہے: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ]۔ علامہ عینیؒ نے اس اشکال اور جواب کو اس طرح نقل کیا ہے: قلت: النبي صلى الله عليه وسلم معصوم عن الكبائر والصغائر فما ذنبه الذي غفر له؟ قلت: المراد منه ترك الأولى والأفضل بالعدول إلى الفاضل. (عمدة القارى: ١/١٦٧) حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں: عندي: أن الذنبَ غيرُ المعصية، وههنا مراتب، بعضها فوق بعض، ووضع لكلٍ لفظ، فالمعصيةُ عدولٌ عن الحكم، وانحرافٌ عن الطاعة، ومخالفةٌ في الأمر، وترجمته: نافرمانی فهذا أشدها. ثم الخطأ، وهو ضِدُّ الصواب، وترجمته في الهندية: نادرست. ثم الذنب، وهو أخفها، ومعناه: العيب، فالسؤال ساقطٌ من أولِ الأمر، لأن في الآية ذكرُ مغفرة الذنوب، أي ما يعدُّ عيوبًا في ذاته الشريفة، وشأنِهِ الرفيعة. وقد سمعت: أن حسناتِ الأبرار سيئاتِ المقربين، فلعل ذنوبه من هذا القبيل. فالبحث ههنا بالصغائر والكبائر في غير موضعه، فإن هذا التقسيم يجري في المعصية، دون الذنوب بالمعنى اللغوي، بل هو موهم بخلافِ المقصود. (فيض البارى: ١/١٧٠)۔

حَلاوَةَ الإِيمَانِ :مَنْ كَانَ اللّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لاَ يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الكُفْرِ، بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللّهُ، مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ"

بَابٌ :تَفَاضُلِ أَهْلِ الإِيمَانِ فِي الأَعْمَالِ

٢١ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ، قَالَ:حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى المَازِنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:يَدْخُلُ أَهْلُ الجَنَّةِ الجَنَّةَ، وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ، ثُمَّ يَقُولُ اللّهُ تَعَالَى:أَخْرِجُوا مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ . فَيُخْرَجُونَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوا، فَيُلْقَوْنَ فِي نَهَرِ الحَيَا، أَوِ الحَيَاةِ - شَكَّ مَالِكٌ - فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الحِبَّةُ فِي جَانِبِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً قَالَ وُهَيْبٌ :حَدَّثَنَا عَمْرٌو :الحَيَاةِ، وَقَالَ: خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ.

٢٢ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللّهِ، قَالَ:حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيدٍ الخُدْرِيَّ، يَقُولُ :قَالَ رَسُولُ اللّهِ ﷺ: بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ، رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُونَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ، مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ، وَمِنْهَا مَا دُونَ ذَلِكَ، وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيصٌ يَجُرُّهُ. قَالُوا:فَمَا أَوَّلْتَ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللّهِ؟ قَالَ:الدِّينَ.(١)

---

(١) باب ہذا کی دونوں حدیثوں میں سے دوسری حدیث کے صرف آخری حصہ کی تشریح وتقریر مندرج ہے، باقی تقریر مخطوطہ کاپیوں میں تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ واللہ اعلم بالصواب.
(محمد کلیم نعمانی قاسمی)

باب کی دوسری حدیث سے فضلیتِ عمرؓ پر ابی بکرؓ کا اشکال

''وَعَلَيْهِ قَمِيصٌ يَجُرُّهُ'' کو لے کر ایک اشکال ہے کہ سب لوگ حضور ﷺ پر پیش کیے گئے، جیسا کہ ''النَّاس'' کے الف لام استغراقی سے ظاہر ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پیش کیے گئے مگر کسی کا کرتہ اس قدر نیچا نہ تھا، جتنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہ وہ کرتہ کھینچ کھینچ کر چل رہے تھے اور مراد کرتے سے دین ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جس قدر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دین کامل اور اکمل تھا، کسی اور انسانِ مؤمن کا نہ تھا، اس سے لازم آیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ان کا دین زیادہ اکمل تھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی بڑھ گئے، پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوقیت اور فضیلت ثابت ہوگئی، یہ بخاری شریف کی حدیث سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی جو اس سے قبل کبھی کان میں نہ پڑی تھی، غرض یہ اشکال ہوتا ہے جو میرا خانہ زاد نہیں بلکہ اساتذہ سے سنا سنایا ہے۔

مذکورہ اشکال کے جوابات

اس کے جواب میں گویا امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حدیث پڑھنے والے سے ایسی بات نہایت عجیب ہے، یہ میرے الفاظ ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ بات جو کچھ بھی ہو رہی ہے، یہ تو منامی ہے اور حضرت ابوبکرؓ کے فضائل ومناقب حالت

بیداری کے منصوص ومنقول ہیں، وہ اپنی جگہ پر ثابت ہیں۔ پس منامی بات بیداری کی بات کے برابر کیسے ہوسکتی ہے؟ تو دونوں میں تعارض بھی متحقق نہیں ہوسکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کافی عرصہ تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اسلام اور اہل اسلام کے مخالف اور مقابل رہتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک دفعہ آں حضرت ﷺ کے قتل کے ارادہ سے تلوار لیے گھر سے نکلے تھے، اسی مقصد کے لیے چلے جارہے تھے، القصہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے تو ان حالات سے خیال ہوسکتا تھا کہ ان کو دیگر صحابہؓ پر فوقیت وفضیلت حاصل نہیں ہوگی، برخلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کے وہ بہت اول مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور بعض دوسرے صحابہ بھی اور ان کی وفاداریاں اور جاں نثاریاں تو نمایاں تھیں تو ان کا معاملہ ہی الگ ہے، ان کے ساتھ تقابل کا تو خیال میں بھی مشکل ہے، تقابل تو بعد میں اسلام لانے والے حضرات کے ساتھ خیال کیا جاسکتا تھا، انھیں کے اعتبار سے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی فضیلت ظاہر فرمائی جارہی ہے تو ''النَّاسَ'' میں الف لام استغراقی نہیں، عہد خارجی کا ہے جس پر مذکورہ قرائن شاہد ہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی فضیلت کے باب میں یہ حدیث منامی تو ہے ہی، اس کے علاوہ یہ خبر واحد بھی ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کے مناقب متواترات سے ثابت ہیں، پس کہاں یہ کہاں وہ، پس یہ حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کے فضائل ومناقب کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے تمام امت میں سب سے افضل

ہونے پر اجماع امت ہو چکا ہے، پس اب کسی بات سے اس میں خلل آ ہی نہیں سکتا(۱)۔

ایک اور اشکال: حضرت عمرؓ زیادہ مشقت اٹھانے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ سے افضل ہونے چاہئیں

ان باتوں کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد ایک اور اشکال کا بھی حل کر دیا جائے، وہ یہ کہ ظاہری حالات کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے تقریباً ایک ہزار شہر فتح کیے، بڑی مشقتیں اٹھائیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کے دور خلافت میں اس قدر فتوحات نہیں ہوئیں تو اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) فإن قيل :يلزم من الحديث أن يكون عمر رضي الله عنه، أفضل من أبي بكر رضي الله عنه، لأن المراد بالأفضل الأكثر ثوابا، والأعمال علامات الثواب، فمن كان دينه أكثر فثوابه أكثر، وهو خلاف الاجماع. قلت :لا يلزم، إذ القسمة غير حاصرة لجواز قسم رابع سلمنا انحصار القسمة، لكن ما خصص القسم الثالث بعمر رضي الله عنه، ولم يحصره عليه سلمنا التخصيص به، لكنه معارض بالأحاديث الدالة على أفضلية الصديق رضي الله عنه، بحسب تواتر القدر المشترك بينها، ومثله يسمى بالمتواتر من جهة المعنى، فدليلكم آحاد ودليلنا متواتر، سلمنا التساوي بين الدليلين. لكن الإجماع منعقد على أفضليته وهو دليل قطعي، وهذا دليل ظني، والظن لا يعارض القطع، وهذا الجواب يستفاد من نفس تقرير الدليل، وهذه قاعدة كلية عند أهل المناظرة في أمثال هذه الإيرادات، بأن يقال :ما أردته إما مجمع عليه أو لا، فإن كان فالدليل مخصوص بالإجماع وإلا فلا يتم الإيراد إذ لا إلزام إلا بالمجمع عليه. لا يقال: كيف يقال :الإجماع منعقد على أفضلية الصديق رضي الله تعالى عنه، وقد أنكر ذلك طائفة الشيعة والخوارج من العثمانية، لأنا نقول :لا اعتبار بمخالفة أهل الضلال، والأصل إجماع أهل السنة والجماعة.(عمدة القاری: ۱/۱۷۵)

حضرت عمرؓ کے درجات بھی زیادہ ہوں گے، کیوں کہ قاعدہ ہے کہ دین میں جتنی مشقتیں برداشت کی جاتی ہیں، اسی قدر ثواب زیادہ ہوتا ہے اور جس قدر ثواب زیادہ ہوگا، خدا تعالیٰ کا قرب زیادہ ہوگا اور درجات بلند ہوں گے۔

مذکورہ اشکال کا جواب: علی الاطلاق زیادتِ مشقت مطلوب اور باعث افضلیت نہیں ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ علی الاطلاق یہ قاعدہ ہی تسلیم نہیں کہ جتنی مشقت ہوگی، اتنا ہی نیکیوں اور حسنات میں اضافہ ہوگا، قرب وثواب بڑھے گا، ورنہ ہم کہیں گے کہ پھر تو جنگل سے پانی لاکر وضو کیا کریں کہ اس میں مشقت زیادہ ہوگی، یہاں مسجد چھوٹی ہے، جگہ کم ہے تو بارش میں وہیں بھیگتے ہوئے نماز پڑھا کریں، کیا اس کو بھی مستحسن اور افضل کہیں گے؟۔

آپ کہیں گے کہ آپ بھی عجیب بات فرما رہے ہیں! کیا مشقت دین کی خاطر بے کار ہے؟ کیا اس میں ثواب وقرب زیادہ نہیں؟ جی ہاں بحمدہ تعالیٰ محققین کی باتیں میرے کانوں میں پڑی ہیں اور یہ بات کہ مدار ترقیٔ درجات مشقت نہیں، بے دلیل نہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو پہلے آپ پڑھ چکے کہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے معمولات معلوم کر کے قیامِ لیل، صیامِ دہر، ترک ازواج کا ارادہ فرمایا۔ حضور اکرم ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ خوش نہیں ہوئے بلکہ ناراضگی فرمائی۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ میں کہہ دوں تو قبول نہ کی جائے؟ یہ قول ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ میں چھوٹا ہوں، ہم عصر ہوں، اس لیے میری بات نہیں مانی جاتی۔ میں تم کو مہلت دیتا ہوں، کسی استاذ سے معلوم کر کے جواب دے دینا کہ مطلق مشقت مطلوب اور مدارِ قرب وازدیادِ ثواب ودرجات ہے؟ ہرگز نہیں

ثابت کر سکتے، نہیں معلوم میں کہاں سے کہہ رہا ہوں، ثابت ہو گیا کہ محض مشقت سے درجات بلند نہیں ہوتے، اس سے قرب نہیں بڑھتا۔ وہ کوئی اور ہی چیز ہے اور وہ علم و معرفت ہے جس سے قرب بڑھتا ہے، یہی مراد ہے رفع درجات کا۔

علم و معرفت کی فضیلت

اسی وجہ سے غیر عارف کی ایک ہزار رکعت (۱) بلکہ بہ روایت ایک لاکھ رکعت پر بھی عارف کی ایک رکعت فوقیت رکھتی ہے (۲)، یہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی قدس سرہ کا ارشاد ہے اور یہ بے دلیل نہیں، حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک صحابیؓ کا ایک مٹھی جو خیرات کر دینا دوسروں کے جبل احد کے برابر سونا خیرات کر دینے سے بھی افضل ہے (۳)، وجہ اس کی یہی ہے کہ جو والہانہ محبت حق اور اخلاص و معرفت اور خشیت ان میں تھی، وہ اوروں میں ممکن نہیں، اس لیے ان کی بظاہر ہر چھوٹی نیکی فی الحقیقت اتنی بڑی ہے کہ دوسرے کی بظاہر بڑی سے بڑی نیکی بھی اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

(۱) وفي رواية ركعة من عالم بالله خير من ألف ركعة من متجاهل بالله مع الاتفاق في فضل صلاة غير العالم. (بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية و شريعة نبوية في سيرة أحمدية: ۱/۲۴۲) ولهذا كانت ركعتان من عالم أفضل من ألف ركعة من غير عالم. (احياء علوم الدين: ۴/۴۰۱، المقام الأول من المرابطة: المشارطة)

(۲) یہ قول تو قدیم علماء کی کتابوں میں نہیں مل پایا، البتہ مطلق حصولِ علم کے باب میں اس طرح کا قول ملتا ہے: جلوس ساعة عند مذاكرة العلم خير من مائة ألف ركعة تطوعا و خير من مائة ألف تسبيحة و خير من عشرة آلاف فرس يغزو بها المؤمن. (بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية و شريعة نبوية في سيرة أحمدية: ۱/۲۹۰)

(۳) لاتَسُبُّوا أَصْحَابِي، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ، ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ، وَلاَ نَصِيفَهُ. (صحيح البخاري، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ تعالى عَنْهُ، كتاب أصحاب النبي ﷺ، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلا، رقم الحديث: ۳۶۷۳)

بڑے سے بڑا ولی بھی کسی ادنیٰ صحابی کا درجہ نہیں حاصل کرسکتا

عارفین کے قلوب بھی انھیں حضرات کے ان فیوض سے مستفیض اور منور ہوتے ہیں ان کے قلوب میں بھی یہ دولتیں ہوتی ہیں جو دوسروں کو میسر نہیں؛ لیکن صحابیؓ اور ولی میں پھر بھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ اخلاص ومحبت اور وہ معرفت وخشیت جو ایک صحابیؓ میں ہوتی ہے، کسی بھی ولی کو وہ حاصل نہیں ہوتیں اور یہ بھی ثابت بالدلیل ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''أَصحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُم'' (۱)۔ ان کی اقتداء میں ولیوں کی ہدایت مضمر ہے، نیز اولیاء اللہ کے

---

(۱) حَدِيثُ :أَصحَابِي كَالنُّجُومِ، بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ« . عَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ فِي مُسْنَدِهِ مِنْ طَرِيقِ حَمْزَةَ النَّصِيبِيِّ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ،وَحَمْزَةُ ضَعِيفٌ جِدًّا، وَرَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ فِي غَرَائِبِ مَالِكٍ مِنْ طَرِيقِ جَمِيلِ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَابِرٍ، وَجَمِيلٌ لَا يُعْرَفُ، وَلَا أَصْلَ لَهُ فِي حَدِيثِ مَالِكٍ وَلَا مَنْ فَوْقَهُ، وَذَكَرَهُ الْبَزَّارُ مِنْ رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّحِيمِ بْنِ زَيْدٍ الْعَمِّيِّ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، عَنْ عُمَرَ، وَعَبْدُ الرَّحِيمِ كَذَّابٌ، وَمِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ أَيْضًا وَإِسْنَادُهُ وَاهٍ، وَرَوَاهُ الْقُضَاعِيُّ فِي مُسْنَدِ الشِّهَابِ لَهُ مِنْ حَدِيثِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، وَفِي إِسْنَادِهِ جَعْفَرُ بْنُ عَبْدِ الْوَاحِدِ الْهَاشِمِيُّ وَهُوَ كَذَّابٌ، وَرَوَاهُ أَبُو ذَرٍّ الْهَرَوِيُّ فِي كِتَابِ السُّنَّةِ مِنْ حَدِيثِ مِنْدَلٍ، عَنْ جُوَيْبِرٍ، عَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ مُزَاحِمٍ مُنْقَطِعًا، وَهُوَ فِي غَايَةِ الضَّعْفِ، قَالَ أَبُو بَكْرٍ الْبَزَّارُ :هَذَا الْكَلَامُ لَمْ يَصِحَّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَقَالَ ابْنُ حَزْمٍ: هَذَا خَبَرٌ مَكْذُوبٌ مَوْضُوعٌ بَاطِلٌ. وَقَالَ الْبَيْهَقِيُّ فِي الِاعْتِقَادِ عَقِبَ حَدِيثِ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ الَّذِي أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ بِلَفْظِ:النُّجُومُ أَمَنَةُ أَهْلِ السَّمَاءِ، فَإِذَا ذَهَبَتْ النُّجُومُ أَتِيَ أَهْلُ السَّمَاءِ مَا يُوعَدُونَ، وَأَصْحَابِي أَمَنَةٌ لِأُمَّتِي، فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي أَتِيَ أُمَّتِي مَا يُوعَدُونَ. قَالَ الْبَيْهَقِيُّ:رُوِيَ فِي حَدِيثٍ مَوْصُولٍ بِإِسْنَادٍ غَيْرِ قَوِيٍّ - يَعْنِي حَدِيثَ عَبْدِ الرَّحِيمِ الْعَمِّيِّ - وَفِي حَدِيثٍ مُنْقَطِعٍ ←

بارے میں بہ ایں نوع تصریح وارد نہیں، اس سے حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی فوقیت اور برتری اولیاء پر صاف ظاہر ہے، اسی لیے ایک وہ صحابی جس سے کسی غلطی کا صدور ہوا ہو، مثلاً زنا ہو گیا اور توبہ کر لی (کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے مگر علمی بات ہے، اس لیے کہنی پڑی) ایک غیر صحابی جو مادرزاد ولی ہو، کبھی گناہ اس سے صادر نہ ہوا ہو، یہ اس صحابی رضی اللہ عنہ سے ہرگز نہیں بڑھ سکتا؛ کیا اہل حق میں سے کوئی بھی یہ بات کہہ سکتا اور ثابت کر سکتا ہے کہ یہ ولی اس صحابہ سے بڑھ گیا؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟ بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور فیض صحبت سے وہ معرفت وخشیت اور خلوص ان کو حاصل ہو گیا تھا کہ کسی کو حاصل ہونا ممکن نہیں۔

اب مشقتوں کا حال دیکھیے! ہم نے پڑھا بھی اور سنا بھی ہے کہ بعض بعض اولیاء نے ایک ایک بادام پر چھے چھے ماہ تک قناعت کی اور پانی انگوٹھے کی پشت کی گہرائی میں لے کر ایک قطرہ پر اکتفاء کیا ہے، یہ ریاضت ہی تو تھی لیکن بہ ایں ہمہ صحابی رضی اللہ عنہ سے نہ بڑھ سکے، اس سے معلوم ہوا کہ خشیت ومعرفت اور والہانہ محبت اصل مطلوب ہیں اور مجاہدہ ومشقت فی ذاتہ مطلوب نہیں، صرف علاجاً درکار ہیں، پھر مشقت وسائل میں نہیں بلکہ مقاصد میں مطلوب ہے، آ گئی مثالِ وضو جنگل

← - يَعْنِي حَدِيثَ الضَّحَّاكِ ابْنِ مُزَاحِمٍ - مَثَلُ أَصْحَابِي كَمَثَلِ النُّجُومِ فِي السَّمَاءِ، مَنْ أَخَذَ بِنَجْمٍ مِنْهَا اهْتَدَى« . قَالَ:وَالَّذِي رَوَيْنَاهُ هَا هُنَا مِنَ الْحَدِيثِ الصَّحِيحِ يُؤَدِّي بَعْضَ مَعْنَاهُ. قُلْت:صَدَقَ الْبَيْهَقِيُّ، هُوَ يُؤَدِّي صِحَّةَ التَّشْبِيهِ لِلصَّحَابَةِ بِالنُّجُومِ خَاصَّةً، أَمَّا فِي الِاقْتِدَاءِ فَلَا يَظْهَرُ فِي حَدِيثِ أَبِي مُوسَى، نَعَمْ يُمْكِنُ أَنْ يَتَلَمَّحَ ذَلِك مِنْ مَعْنَى الِاهْتِدَاءِ بِالنُّجُومِ، وَظَاهِرُ الْحَدِيثِ إنَّمَا هُوَ إشَارَةٌ إلَى الْفِتَنِ الْحَادِثَةِ بَعْدَ انْقِرَاضِ عَصْرِ الصَّحَابَةِ، مِنْ طَمْسِ السُّنَنِ، وَظُهُورِ الْبِدَعِ، وَفُشُوِّ الْفُجُورِ فِي أَقْطَارِ الْأَرْضِ، وَاَللَّهُ الْمُسْتَعَانُ. (التلخیص الحبیر: ۴/ ۳۵۰، ۳۵۱، بَابُ أَدَبِ الْقَضَاءِ، رقم الحدیث: ۲۵۹۴)

یا دوسری بستی سے پانی لا کر؟۔

اور معرفت وخشیت اور والہانہ محبت بغیر علم اور بغیر شیخ کامل ومحقق کے حاصل نہیں ہوتیں، عادۃ اللہ یہی ہے، پس یہ قاعدہ کلیہ علی الاطلاق غلط ہے کہ جتنی مشقت دین میں اٹھائی جائے گی، اتنا ہی درجہ بلند اور قرب زیادہ ہوگا، لہٰذا اگرچہ بظاہر حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی مشقتیں زیادہ ہیں کہ فتوحات کثرت سے کیں مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ سے پھر بھی ان کا درجہ کم ہے، ان پر ہرگز فوقیت حاصل نہیں ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کو جو محبت ومعرفت ہے، وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کو حاصل نہیں، اسی وجہ سے وہ کوہِ وقار واستقلال ہیں، اس درجہ استقلال اور وقار ان کو حاصل ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کو وہ مرتبہ حاصل نہیں، الحمد للہ تعالی! میرے ذہن میں ان کے وہ حالات ہیں کہ اگر میں بیان کروں تو کئی دن صرف ہو جائیں ۔

حضور ﷺ کی وفات سے حضرت صدیق اکبرؓ وحضرت عمرؓ کو لاحق ہونے والے صدمے کا فرق

دیکھیے! ایک چیز بنیادی ہوتی ہے، ایک تعمیری۔ ایک قوتِ قلبی اشد ہوتی ہے، ایک ایسی نہیں ہوتی، دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ یہی فرق ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ وحضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ میں: حضرت ابوبکر صدیقؓ میں بنیادی چیز اور قوت قلب اشد تھی، چناں چہ آں حضرت ﷺ کی وفات پر حضرت عمر فاروقؓ صدمہ ورنج سے بے حال ہو گئے تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ وقارانہ اندر تشریف لے گئے اور چہرۂ انور سے چادر ہٹا کر بوسہ دیا؛ اب باہر تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا ﷺ فَإِنَّ

مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ'' (۱)۔آپ بے حال نہیں ہوئے مگر اندر جدائی کا صدمہ اور جو اثر تھا اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کے سانس سے کلیجہ جل جانے کی بو آتی تھی۔

حضرت گنگوہیؒ کو حضرت حاجی صاحبؒ کی وفات کا صدمہ

اسی طرح حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اطلاعِ وفات پر کوہِ وقار حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شدتِ رنج وغم سے خونی دست ہوئے تھے اور کافی دنوں تک یہ حالت تھی کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بھی سننے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔مولانا محمد یحیی صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کو منع فرمادیا تھا کہ کوئی شخص ایسا (حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ میرے سامنے) نہ کرنے پائے، یہ تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محبت تھی مگر استقلال اور پابندئ شریعت میں فرق نہیں آیا۔

حضرت گنگوہیؒ اور شریعت کی عظمت

شریعت کی عظمت اس درجہ تھی کہ ایک کتاب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی تھی بظاہر خلاف شریعت تھی، حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھوں میں جب پہنچی تو آپ نے پڑھ کر فرمادیا کہ ہمارے حمام میں اس کو جلادو، لوگوں نے، حاسدین نے بڑھا چڑھا کر شکایات حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچائیں، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا کہ مجھے کسی کی شکایت کا

(۱) صحیح البخاری، کتاب أصحاب النبي ﷺ ،بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا ،رقم الحديث:۳۶۶۸.

کوئی اثر نہیں، مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ آں عزیز نے شریعت کی حفاظت فرمائی، یہ کتاب ایسی تھی کہ اس کو عوام اور چھوٹے علماء سمجھ نہیں سکتے تھے، بدعت کا مواد کافی مل جاتا۔ اسی لیے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے **زجراً للعوام و حفظاً للشریعۃ** اس کو جلوادیا۔

اسی بناء پر جب ایک عالم صاحب حج کو جانے لگے تو آپ نے فرمایا کہ جاتو رہے ہو، جیسا ایمان یہاں سے لے جارہے ہو، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے ویسا ہی لے کر لوٹ آنا، اللہ والوں کے کلام کے اشارات بڑے گہرے اور عمیق ہوتے ہیں، ان کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا، ان کے یہاں ہر چیز اپنے اپنے درجے پر رکھی جاتی ہے، ادھر محبت شیخ، ادھر عظمت شریعت۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محبت کا حال اپنی جگہ پر تھا لیکن آپ نے جو خطبہ فرمایا، سب خاموش ہوگئے۔ سب نے آپ کی بات مان لی، کسی نے مداخلت نہیں فرمائی۔ یہاں سے شخصیت ثابت ہوتی ہے جس کو آج کی اصطلاح میں ڈکٹیٹری (dictator) کہا جاتا ہے۔ اجتماعی امور میں نظم جب ہی قائم رہتا ہے کہ ایک شخص کو ذمہ دار پورے طریقہ پر بنا کر سب اسی کی اتباع کریں، یہ کثرت رائے اور جمہوریت آج کی جدید شئے ہے، اسلام میں اس کا کہیں ثبوت نہیں۔

مانعین زکوۃ کے فتنے کے وقت
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ثابت قدمی

اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے کہ مانعین زکوۃ کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ جہاد کے عازم ہوئے، حالاں کہ ارتداد بھی پھیل رہا ہے، سب صحابہ رضی اللہ عنہم گھبرا رہے ہیں کہ سب لشکر باہر روانہ ہو رہا ہے، مقامی جگہ

خالی ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ نے بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کی رائے سے اختلاف کیا، حضرت صدیق رضؓ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ کو یہ کہہ کر " أَجَبّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوّارٌ فِي الْإِسْلَامِ "؟ (۱)۔

ادھر حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر کفار کے مقابلہ روانہ کیا جارہا ہے، صحابہؓ نے مشورۃً عرض کیا کہ یہاں مقامی جگہ میں بھی فتن کے انسداد کے لیے ضرورت ہے کہ کچھ خاص جمعیت موجود رہے، اس لیے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالی عنہ کو مع ان کے لشکر کے واپس بلالیا جائے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ یہ جھنڈا میرے محبوب کا باندھا ہوا ہے، یہ واپس نہیں ہوں گے۔ یہ سن کر سب خاموش ہوگئے، چنانچہ وہ فاتح ہوکر واپس ہوئے۔ دیکھیے! کس قدر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کے قلب میں حضور ﷺ کی قدر اور ادب واحترام وعظمت ہے، اشد محبت۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی ثابت قدمی کا دشمنوں پر اثر

ان دونوں واقعوں سے شخصیت ثابت ہوتی ہے، جمہوریت اور کثرتِ رائے کی تردید ہورہی ہے، نیز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کا استقلالِ عظیم الشان ثابت ہورہا ہے، اپنی جگہ کوہِ وقار ہیں، ڈٹ رہے ہیں، نہایت حوصلہ اور شجاعت کا مظاہرہ فرمارہے ہیں، اسی سبب سے مخالفین اسلام پر رعب چھا گیا، روم، فارس اپنی اپنی جگہ سوچ رہے ہیں کہ اس قدر خلفشار بھی بیک وقت سب پر حاوی ہے، سب پر تسلط کرلیا، گھبراہٹ اور کمزوری نام کو نہیں اور پورے کامیاب ہیں، معلوم ہوا کہ ان کے پاس کوئی غیبی طاقت ہے، بس قریب والوں اور بعید والوں پر یکساں طور پر دھاک بیٹھ گئی، دیکھیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے میدان ہموار اور صاف کردیا اور بہترین بنیاد قائم کردی۔ دوسال اور چار ماہ

(۱) مشكوة المصابيح، بَاب مَنَاقِب أبي بكر، الفصل الثاني، رقم الحديث: ۶۰۳۴.

کی نہایت قلیل مدتِ خلافت ہی میں سب کی چولیں ہلا دیں، اسی بنی بنائی بنیاد اور ہموار شدہ میدان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نقشہ قائم کر دیا۔

تو آپ نے دیکھا کہ جو اولوالعزمی اور استقلال اور ثبات قدمی اور شجاعت کے حالات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کے ہیں، وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے حالات نہیں، اگرچہ انھوں نے ایک ہزار شہر فتح کیے اور بہت لشکر کشیاں کیں اور اسلام دور تک پھیلا دیا لیکن ان تمام چیزوں کی بنیادیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ نے قائم فرمادی تھیں۔ گویا قلوب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فتح فرمالیے تھے، اور ظاہری فتوحات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئیں، پس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ظاہری مشقتوں کی زیادتی سے حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر ان کی فضیلت ثابت نہیں ہوئی؛ بلکہ برعکس حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فضیلت تواتر، اجماع اور اولوالعزمی و استقلال عظیم سے ثابت ہوئی، تو اس حدیث سے متعلقہ اشکالات اور جوابات حسب بیانات اساتذہ پورے ہو چکے۔

بابِ سابق سے مناسبت

اب رہی مناسبت ماقبل باب سے سو مثل باب سابق اس سے بھی بقدر دین یعنی بقدر اعمال مؤمن کی آپس میں ایک کی دوسرے پر فضیلت ثابت ہوتی ہے، پس مرجیہ و کرامیہ جو اعمال کو بالکل غیر مفید مانتے ہیں، ان پر اس باب سے بھی رد ہو گیا کہ اعمال نہایت درجہ مفید ہیں کہ مدارِ فضیلت یہی ہیں، ذات باری تعالی صاف صاف ''وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا'' ۚ [الاحقاف ۱۹:] فرما رہے ہیں۔ دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❁ ❁ ❁

الدرس الخامس والثلاثون

بَابٌ :الحَيَاءُ مِنَ الإِيمَانِ

۲۳ :حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ، قَالَ:أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ، وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الحَيَاءِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ دَعْهُ فَإِنَّ الحَيَاءَ مِنَ الإِيمَانِ.

حدیث شریف کی قراءت فرما کر ترجمہ فرمایا۔

"وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الحَيَاءِ" کے لفظ پر ارشاد فرمایا کہ غصہ کے لہجہ میں تنبیہ فرما رہے ہیں، چوں کہ دوسری روایت میں يُعَاتِبُ کا لفظ آیا ہے (۱)۔

ترجمۃ الباب

کرامیہ اور جہمیہ کے خلاف امام بخاریؒ کا دعویٰ

امام بخاریؒ کرامیہ اور جہمیہ کی تردید فرما رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اعمال کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں، نہ طاعت سے ایمان میں جلاء اور رونق اور بھڑک پیدا ہوتی ہے اور نہ معاصی سے بدرونقی، تکدر اور ظلمت ہوتی ہے۔ امام بخاریؒ اس کے رد میں گویا یوں فرماتے ہیں کہ میں دعوی کرتا ہوں کہ اعمال تو اعمال، اعمال کا سبب اور ذریعہ ومبدأ حیاء بھی ایمان کا جز ہے، اگرچہ حیاء اپنی ذات میں بھی ایک عمل باطنی ہے اور اخلاقِ حسنہ بھی تمسکاتِ فاضلہ میں سے ہے؛ لیکن یہ بہت سے اعمال حسنہ کا سبب بھی بنتی ہے اور یہ جزوِ ایمان ہے تو اعمال جوارح جو حیاء کا ثمرہ

---

(۱) صحيح البخاری،عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا،كِتَابُ الأَدَبِ،بَابُ الحَيَاءِ،رقم الحديث:۶۱۱۸.

اور نتیجہ ہیں، وہ تو بطریق اولیٰ ایمان کا جز ہوں گے۔

اس کی دلیل میں اس مُسندِ حدیث کو بیان فرمارہے ہیں کہ دیکھو میرا یہ دعوی بلا دلیل نہیں بلکہ اس حدیث سے مستند ہے، حدیث یہ ہے کہ ایک صحابیؓ اپنے بھائی کو غصہ اور تیزی کے لہجہ میں زجر و توبیخ فرمارہے تھے کہ تم بھی کیا عجیب ہو اتنی شرم کرتے ہو، ایسی بھی کیا شرم وحیاء! اس کا بھی محل وموقع آتا ہے، جس شرم سے حقوق تلف ہونے لگیں، وہ شرم تو اچھی نہیں، جس کو چاہو قرض دے دیتے ہو، مطالبہ کرتے نہیں اور مقروضین بلا مطالبہ ادا نہیں کرتے۔

قرض کے معاملے میں مسلمانوں کی حد درجہ کوتاہی

ایسے لوگ اس وقت بہت قلیل تھے اور ہمارے زمانہ میں شیوع ہے، ایسوں کی بہت کثرت ہے، دینے کے بعد ملنا بہت مشکل ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: بہ قول بعض کہ قرض تو ہم اب بھی دے دیں مگر دینے کے بعد لیں کس سے؟ مسلمان آج تو لے کر دینا جانتے ہی نہیں الا ما شاء اللہ۔

اب طالب علم دوکان داروں سے قرض لیتے ہیں، جب وہ تقاضا کرتے ہیں، ہم تک اس کی اطلاع ہوتی ہے، ہمارے پاس آتے ہیں، ہم ان کو تسلی دیتے ہیں اور طالب علم کا پیچھا چھڑاتے ہیں، کہہ دیتے ہیں کہ فکر نہ کرو، آپ کے دام آجائیں گے مگر طلبہ اپنے گھر جا کر نام تک نہیں لیتے، بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں اور ہمیں وہ دام دینے ہوتے ہیں، تو جب عربی طلبہ اور ہم جیسوں کا یہ حال ہے تو عوام کا کیا ذکر! وہ تو ظاہر ہے کہ ان سے بھی زیادہ ہوں گے۔ (یہاں اور کچھ فرمانا چاہتے تھے مگر نہیں فرمایا بلکہ یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ خیر میں نے ذہن کو روک لیا)

مذکورہ حدیث کا پس منظر

ہاں! تو بات ان صحابیؓ کی چل رہی تھی، بیچ میں جملہ معترضہ کے طور پر دیگر

باتیں آئیں۔ وہ صحابیؓ نکیر فرمارہے ہیں اور روک رہے ہیں اپنے بھائی کو کہ اہل وعیال بھی ہیں دے دوگے اور مطالبہ نہ کروگے، وصول نہ ہوگا تو ان کا حق مارا جائے گا، اس پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : ان کو چھوڑ دو یعنی ان کی گرفت نہ کرو، عتابانہ لہجہ اور غضب نا کی چھوڑ دو، اگرچہ تمہارا روکنا بھی ایک گونہ صحیح ہے لیکن مخاطب کا بھی لحاظ کیا کرتے ہیں کہ کیسی طبیعت رکھتا ہے، اس پر کب اثر ہوسکتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس طرز اور عتابانہ لہجہ کا اثر تفریط کی شکل میں ہوجائے اور حیاء ختم ہوجائے پھر برائی کی طرف چلنے لگے؛ اس لیے فرمایا کہ حیاء تو ایمان سے ہے یعنی ایسے وصفِ حسن سے جو حصۂ ایمان ومبنائے ایمان ہے، اس طرز سے نہ روکو، یہ روکنا ٹھیک نہیں (۱)۔

اس سے استدلال کرتے ہوئے گویا امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حیاء اعمالِ جوارح سے نہیں بلکہ اس کے مبادی میں سے ہے اور اعمال حسنہ کا منشاء ہے، صدور وظہورِ فعل جو مقرون بالمشقت ہوتے ہیں، وہ نہیں جب وہ بھی ایمان کا جزء ہے تو صدورِ فعل تو بطریق اولی جزوِ ایمان ہوگا۔

اب حیاء کے متعلق عرض ہے کہ حیاء ایک کیفیت غالبہ کا نام ہے جو مکروہات کے ارتکاب سے مانع ہوتی ہے اور بھلائیوں اور اچھائیوں کی طرف ابھارتی ہے (۱)۔ اسی کا ترجمہ ہماری زبان اردو میں شرم سے کیا جاتا ہے۔

حیاء، عار اور خجلت میں فرق

لیکن یہ لفظ زبان اردو میں مشترک ہے حیاء، عار، خجلت کے درمیان، ان

(۱) إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري: ۹/۷۳، باب الْحَيَاءِ.
(۲) وَفِي الشَّرْعِ خُلُقٌ يَبْعَثُ عَلَى اجْتِنَابِ الْقَبِيحِ وَيَمْنَعُ مِنَ التَّقْصِيرِ فِي حَقِّ ذِي الْحَقِّ. (إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري: ۱/۹۲)

تینوں عربی لفظوں کے لیے یہی ترجمہ شرم کا کیا جاتا ہے، پس جو شرم باعث خیر اور مانع شر نہ ہو وہ حیاء نہیں ہوگی بلکہ اگر باعث شر ہو اور مانع خیر ہو تو بزدلی اور کم ہمتی کی صورت میں جُبُن ہوگی اور دلیرانہ اور شجاعانہ ہو تو عار و تکبر ہوگی، ایسی ہی شرم کے متعلق کہا گیا ہے: جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔ اور عار کے متعلق عربی کا مقولہ ہے: العار یفضی إلی النار۔ پس شرم وحیاء اور بزدلی وجبن اور عار میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے؛ ورنہ نہایت سخت غلطیوں میں ابتلاء امرِ ناگزیر ہے، جیسے کسی طالب علم کی سمجھ میں کوئی مقام کتاب کا نہیں آیا لیکن پوچھتا نہیں، اس میں شرم آرہی ہے، یہ بزدلی وجبن ہے اور اپنی شان کے خلاف اور بڑائی باقی رکھنے کے خیال سے پوچھنے اور سمجھنے میں رکاوٹ ہورہی ہے تو یہ عار اور تکبر ہے۔ اس کو حیاء کہنا بڑی غلطی ہے۔

ایمان کے درجات

اسی طرح بعض کا اپنے ساتھیوں کو اچھی بات کی ترغیب نہ دینا اور اور بری بات سے نفرت نہ دلانا اور شرم کرنا، بزدلی اور جُبُن ہے، حالاں کہ حدیث شریف میں صاف وارد ہے: ''مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ'' کہ منکر اور غیر معروف بات کو (عام اس سے کہ وہ اخلال فرائض و واجبات و مؤکدات ہو یا ارتکابِ خلاف اولی و نامناسب یا نازیبا ہو، بہرحال کیسا ہی ہو اس کو) مٹادو، کسی بھی طریقہ سے ختم کردو، زورِ حکومت اور قوت وطاقت سے مجبور کرکے ختم کردو! تو اس زمانے میں اگر قوت ید بوجہ عدمِ حکومت حاصل نہیں، اس لیے جبراً قہراً منکرات سے نہیں روک سکتے تو اس سے بھی کیا گئے کہ زبان سے ہی روک دیں اور منع کردیں اس سے ناپسندیدہ ہونے کی اور اس سے بےزاری ونفرت کو ظاہر کردیں۔

اس کے بعد حدیث کے الفاظ ہیں: ”فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَ ذَٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِكه“ اگر اتنی بھی قدرت وطاقت نہ ہوتو قلب سے ہی اس کو مٹا دے انکار کردے یعنی نفرت اور بے زاری قلب میں ہوتو یہ انتہائی درجہ ہے ایمان کا یعنی اگر یہ درجہ حاصل ہے تو بھی وہ شخص ایمان والا ہے۔

”وَ ذَٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ“ کا صحیح اور غلط ترجمہ ومفہوم

اس جملۂ حدیث کا یہ ترجمہ کرنا کہ یہ ایمان کا ادنی درجہ ہے، یہ ترجمہ غلط ہے میں نے ایک جگہ بیان کرتے ہوئے یہی ترجمہ کیا تھا کہ یہ انتہائی درجہ ہے ایمان کا، اس کو سن کر ایک عالم جو صاحب درس ہیں اور بڑی بڑی کتب کا درس دیتے ہیں، وہ بہت خوش ہوئے، اس سے تائید مقصود ہے بحمدہ تعالی میں خودستائی اور تکبر کے طور پر نہیں کہتا، حاصل یہ ہوا کہ جو نکیر لسانی نہ کرے، دل میں نفرت وبے زاری امر منکر سے رکھے، وہ علی الاطلاق بز دلی اور ضعف ایمان والا نہیں بلکہ اگر خطرات ومضرات کے باعث نکیر لسانی اور تبلیغ سے معذور رہا مگر قلب بے زا رہے تو یہ مصالح شرعیہ کی رعایت ہے، اس لیے ایسا شخص بھی قوی الایمان ہے، ضعیف الایمان بھی نہیں ہے، چہ جائے کہ اضعف الایمان ہو۔ چوں کہ اس نے شریعت کے خلاف کچھ نہیں کیا، اس کی خاموشی بہ اذن شرعی اور موافق شرع ہے، وہ حدود شکنئ شریعت کا مرتکب نہیں۔

مداہنت کی حقیقت

مداہنت یہ کہ اپنے دینوی نفع کی خاطر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک

کردے اور اگر مصلحت دین کے یا شرعی عذر سے بہ اجازتِ شرع ترک کرے ، وہ مداہنت نہیں۔ اس لیے جلدی سے بزرگوں پر مداہنت کا الزام لگانا صحیح نہیں، ناحقیقت شناسی اس کا منشاء ہے۔

دعوت و تبلیغ کے درجات

تفصیل اس کی یہ ہے کہ شریعت نے ہر چیز کے شرائط اور موانع، حدود و قیود مقرر فرمادئے ہیں، پس کسی مامورِ شرعی کا بجالانا کسی فعل کے نفس صدور وظہور پر ہی موقوف نہیں بلکہ حدود و قیود کے لحاظ اور شرائط کے حصول اور موانع سے اجتناب کے ساتھ صدور فعل یا ترک فعل مقصود ہوتا ہے، صورت مذکورہ میں کہ اندیشۂ مضرات کے باعث سکوت وخاموشی عمل میں آئی، بہ وجہ عدمِ شرائط نکیر لسانی یا وجودِ مانع کے سبب نکیر لسانی اور تبلیغ قولی پر عمل نہیں ہوا، مقصد شرعی اور مطلوب شرعی فوت نہیں ہوا، کیوں کہ من جملہ دیگر عبادات تبلیغ بھی ایک عبادت ہے اور ہر عبادت حدود و قیود اور شرائط کے ساتھ مقید اور مشروط ہے جن کا جاننا اور عملی رعایت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پس جیسے عبادت صلوٰۃ فرض ہے، واجب ہے اور سنت ہے، مستحب ومندوب ہے۔ اسی طرح تبلیغ بھی فرض ہے، واجب ہے اور مستحب ومندوب بھی اور جیسے نماز پڑھنا بعض اوقات حرام ہے، جیسے زوال سے متصل پہلے یعنی استوائے شمس کے وقت نماز پڑھنا اور بعض اوقات مکروہ ہے، اسی طرح تبلیغ بعض موقعوں پر مکروہ ومنع ہے اور جس طرح نماز میں فرائض اور واجبات، سنن ومستحبات وغیرہ ہیں، اسی طرح تبلیغ میں بھی بعض باتیں ضروری اور بعض غیر ضروری ہے بلکہ مکروہ ومنع ہیں، تفصیل کے لیے یہ موقعہ نہیں کتب فقہ موجود ہیں اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اس میں قابل مطالعہ ہے۔ اب اردو میں اس کا ترجمہ ہوگیا ہے۔

آدابِ دعوت و تبلیغ

جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو اسی سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ طرقِ تبلیغ پہلے سیکھنا ضروری ہے؛ تاکہ وہ صحیح و درست ادا ہو اور باعث ثواب و رضا ہو، یہ نہیں کہ فضائل تبلیغ سن کر بدون سیکھے اور بدون جانے پہچانے بلا حدودِ شرع عمل تبلیغ شروع کردے، جیسے تبلیغ کے فضائل اس پر عمل کرنے کے بواعث ہیں، اسی طرح انعدام واختلالِ شرائط اور حدود شکنی اس کے موانع بھی ہیں۔جیسا کہ حدیث مذکور مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا إلخ کے ترتیب جمل سے ظاہر ہے۔پس ضروری ہے کہ اول حدود اور احکام معلوم کیے جائیں، اس کے بعد ان کی رعایت کے ساتھ عمل تبلیغ شروع کیا جائے؛ تاکہ دنیوی مفاسد اور مضارِ آخرت سے سلامتی اور امن رہے۔

یہ بھی جائز نہیں کہ فرضی اور وہمی اعذار وموانع کا تخیل اور تصور کرکے اس سے تقاعد اور تغافل ہو کہ یہ من سمجھوتی ہوگی، جس کا شریعت میں بالکل اعتبار نہیں، جیسا کہ بعض خیال کرلیتے ہیں کہ کون جھگڑے میں پڑے، ہمیں کیا ضرورت؟ دوسرا کچھ ہی کرے، یا کہ شرم آتی ہے کہ ہم پندرہ بیس برس کے ہیں اور یہ عمر رسیدہ ہیں، اگر ہم ان کو کچھ کہیں تو یہ کیا کہیں گے۔ یہ بزدلی ہے، بے حیائی نہیں، حیاء تو مطابق حدیث خیر ہی کا باعث ہوتی ہے، یہ بزدلی وکم ہمتی ہے جو کہ مذموم ہے، اتنی زبردست خیر کثیر سے ناحق رک جانا اس پر مفاسد اور مضارِ دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں بے شمار مرتب ہوتے ہیں، دونوں جہاں کی زندگی تباہ ہوتی اور قہر الٰہی نازل ہوتا ہے۔

الحاصل حیاء اور جبن و بزدلی میں فرق معلوم ہوگیا کہ حیاء تو اپنے حقوقِ دنیویہ کے حصول سے ہی مانع بن سکتی ہے اور ارتکابِ افعالِ مضر آخرت سے روکتی ہے اور جبن و بزدلی جو شرم کے رنگ میں ایک جھجھک ہوتی ہے، اس سے حقوق ومنافع آخرت

فوت ہوتے ہیں۔ اس کو حیاء کہنا اور حیاء سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ پس جو امورِ دینیہ سے مانع بنے، وہ حیاء نہیں انطباقِ احوال سے فرق صاف معلوم ہوجائے گا۔

حیا صحیح معنی میں حیات کو حیات بناتی ہے

حیاء حی سے مشتق ہے جو مقتضیٔ حیات ہے، اگر لوگوں میں حیاء پیدا ہوجائے تو حیات صحیح معنی میں حیات ہوجائے یعنی بہ اطمینان زندگی حاصل ہوجائے، ہر ایک دوسرے سے مطمئن ہوکر زندگی گذار سکے اور زندگی کا لطف اٹھا سکے، حیا اپنے حقوق کی تحصیل میں رکاوٹ بنتی ہے اور لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کا باعث بنتی ہے تو جو بندوں کے ساتھ اس طرح پیش آتا ہو، وہ ظاہر ہے کہ خود خالق و مالک کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا تو حیا ایک خلق حسن اور وصف جمیل ہے۔

اقسامِ حیاء

اس کی تین قسمیں ہیں: حیا عن الحق، حیاء عن الخلق، حیاء عن النفس۔ یہ خود سے حیاء کرنا بہت بڑی چیز ہے کہ اپنے سے بھی شرماتا ہے یعنی خلوت وتنہائی میں بھی مثلاً خود کو ننگا دیکھ کر شرماتا ہے، اس لیے ننگا نہیں ہوتا تو ننگوں کے ساتھ ننگا کیوں کر ہوگا، لہٰذا عفت و پاک دامنی ہوگی اور یہ تمام اخلاق میں بلند ترین ہے، اس لیے فرمایا کہ تم ان کو ایسے خلق سے روکتے ہو۔

"فَإِنَّ الحَيَاءَ مِنَ الإِيمَانِ" کا "مِنْ" تبعیضیہ ہے یا ابتدائیہ؟

اب "مِنْ" کے بارے میں کلام ہے کہ تبعیضیہ ہے یا کیسا؟ سو امام بخاریؒ کے نزدیک چوں کہ ایمان ذو اجزاء ہے، اس لیے وہ یہاں من کو تبعیضیہ قرار دیتے ہیں، حنفیہ اس کو مِنْ ابتدائیہ فرماتے ہیں، مطلب یہ کہ ایمان حیاء کا منشاء

ہے، وہ بھی کیا مؤمن ہے جس میں بے حیائی ہو، یا یہ کہ ایمان کے کچھ مبادی اور مقدمات ہیں، حیاء ان ہی میں سے ایک ہے، جیسے امانت مقدمۂ ایمان ہے، ایسے حیاء بھی مقدمۂ ایمان ہے کہ جس میں حیاء ہوگی، ضروری ہے کہ واجب تعالی کے وجود کو تسلیم کرے گا، چوں کہ جب چہار طرف دیکھے گا کہ یہ اتنی کثرت سے اسباب کہاں سے ہیں؟ کس کی طرف سے ہیں؟ یہ کس نے بنائے اور پیدا کیے ہیں؟ غور کرے گا تو عقل کہے گی کہ کسی ایسی ذات کی طرف سے ہیں جو کسی بھی طور وحیثیت سے کسی کا محتاج نہیں، تمام صفات وکمالات کا جامع ہے تو جب وہ ایسا ہے، کیا اس کو نہ مانوں؟ اس کو ضرور ماننا چاہیے، پس ذات وحدہ لاشریک کو مان لے گا، اس پر یقین وایمان لائے گا تو حیا ایمان کی داعی اور اس کا باعث ہے، جیسے امانت باعث وداعیٔ ایمان ہے(۱)۔

یہ وصف صرف ذات انسان میں ہے اور کسی کے اندر یہ چیزیں نہیں، آپ فرمائیں گے کہ یہ کیسے معلوم ہوا؟ جواب یہ ہے کہ آیت شریفہ ملاحظہ ہو: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾[الأحزاب ۷۲:]: حق تعالی فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی امانت زمینوں اور آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کی، باوجودیکہ یہ سب عظیم الجثہ اور ہیکل الجسم ہیں اور انسان ان کے مقابلہ میں کوئی بساط اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا مگر اس امانت کے تحمل سے سب گھبرا گئے اور سب عاجز ہو گئے، انسان ضعیف البنیان نے بڑھ کر اس کو اٹھا لیا تو یہ امانت جو مقدمۂ ایمان ہے انسان میں موجود ہے، اسی طرح حیاء مقدمۂ ایمان اور مقدمۂ حسنات ہے، جس

(۱) واعلم: أن بعض الأخلاق الحسنة التي هي مبادىء للإيمان مقدَّمة على الإيمان، يجيءُ عليها لون الإيمان كالأمانة، ولذا قال: لا إيمانَ لمن لا أمانَةَ لَهُ فالأمانةُ متقدِّمةٌ على الإيمان، وينبغي أن يقدَّم عليه الحياء أيضًا. (فیض الباری: ۱/۱۵۳)

میں حیاء نہیں، وہ ایمان نہ لاوے گا اور اگر ایمان لے بھی آیا تو ایمان پر باقی نہ رہے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان حیا کا تحفظ کرے اور اس کو بڑھاتا رہے، ورنہ کم ہوتے ہوتے اور کمزور ہوتے ہوتے حیاء ختم ہوجائے گی اور "**إذا فاتك الحياء فافعل ما شئت**" کا ظہور ہو کر ایمان ختم اور کفر پیدا ہوجائے گا (۱)۔

امانت کی حقیقت

جب حیاء اور امانت دونوں کا مقدمۂ ایمان ہونا معلوم ہوگیا تو اب ضروری ہے کہ حیاء کے مثل امانت کے معنی بھی معلوم ہوجائیں، سو ایمان اور امانت دونوں کا مادہ ایک ہے یعنی امن، اس کے پیش نظر یہ واضح اور ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کو اس کے محل پر رکھنا اور ہر مستحق کو اس کا پورا پورا حق دینا، کمی بیشی اور ضیاع وتلف سے امن دینا، مثلاً عبدالمجید کے پاس کسی نے پیسے امانت رکھے اور وہ جوں کے توں محفوظ رکھے پھر بعینہٖ مستحق کو پہنچاوے، آپ کہیں گے: عبدالمجید امین ہے، امانت دار ہے اور جس میں یہ وصف ہو اس پر پورا پورا اعتماد اور کامل بھروسہ ہوتا ہے، اسی طرح ایمان دار پر مخلوق کو پورا پورا اعتماد ہوتا ہے، چوں کہ امانت دار اللہ کے حقوق پورے پورے ادا کرتا ہے۔

آج اعتماد نہیں، کسی نے کہا کہ اللہ بچائے آج کے مسلمانوں سے، یہ مؤمن ہیں؟ یہ میں نہیں کہتا کہ کافر ہوگیا مگر شان ایمانی سے دور ہے، پس امانت کے معنی سے ثابت ومعلوم ہوگیا کہ کسی کے حق میں کمی کرنا اور کسی کو اس کے مرتبہ سے گھٹا دینا، ادائے حق میں کمی کے ساتھ معاملہ کرنا ایمان کے منافی ہے۔

---

(۱) یہ ایک معروف بین الناس جملہ ہے، اس معنی میں صحیح احادیث بھی وارد ہیں، جیسے: إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ. (صحیح البخاری، عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ رضی اللہ تعالی عنہ، كِتَابُ أَحَادِيثِ الأَنْبِيَاءِ، رقم الحديث: ۳۴۸۴)

اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے: ’’**لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ**‘‘۔اور مرتبہ ظاہر اعمال سے معلوم ہوتا ہے، چوں کہ حکم شریعت اعمالِ ظاہرہ پر دائر ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے یہ بات ثابت ہو چکی کہ حسب اعمال دنیا وآخرت میں رفعت وشرافت اور مقبولیت ہوتی ہے، رہی باطنی چیز، وہ خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اس لیے کسی کے ایمان کا حکم قطعیت سے نہیں لگا سکتے سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور عشرۂ مبشرہؓ کے، البتہ ظاہر اعمال دیکھ کر غالب گمان کیا جا سکتا ہے۔

الحاصل اعمالِ ظاہرہ کے اعتبار سے درجہ ومرتبہ جانا اور پہچانا جاتا ہے، اسی کے اعتبار سے معاملہ وبرتاؤ حفظ مراتب کا کیا جائے گا تو امانت ہوگی، ورنہ خیانت۔

اس لیے ہمارے حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ ہم سے یہ سوال نہ ہوگا کہ اس کے ساتھ نیک گمان کیوں تھا؟ ہاں بدگمانی پر باز پرس ہوگی کہ تم کو فلاں شخص سے بدگمانی کیوں تھی؟۔

حضورِ اکرم ﷺ کی پاکیزہ تعلیم

اب آخری بات عرض کرتا ہوں: حضور اقدس ﷺ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کو ارشاد فرماتے ہیں: ’’**يَا بُنَيَّ، إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ لَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لِأَحَدٍ فَافْعَلْ**‘‘ (۱) کہ: صبح وشام تیرے قلب میں کسی کے حق ومرتبہ گھٹانے کا تصور وخیال بھی نہ آوے یعنی ہر وقت اپنے قلب کی بھی نگہداشت کرو کہ اس میں امانت رہے، خیال وتصور تک بھی خیانت کا آنے نہ پائے، سبحان اللہ! کیا

---

(۱) سنن الترمذی، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ تعالی عنہ، أَبْوَابُ الْعِلْمِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ البِدَعِ، رقم الحدیث :۲۶۷۸.

پاکیزہ تعلیم ہے، یہ اعلی درجہ ہے تہذیب اخلاق کا، کیسی تعلیم فرمادی کہ اس کا واہمہ اور تصور بھی نہ آنے پائے، چہ جائے کہ عمل کی نوبت، بھلا اس سے زیادہ کیا تہذیب ہوگی۔

ارشاد ہے: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ“ (۲) کہ: اخلاق فاضلہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، پس یقیناً آپ نے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ فاضلہ کی بہ احسن وجوہ نہایت درجہ تکمیل و تتمیم فرمادی کہ ایسے اخلاق بنادئے کہ کسی کے بارے میں اس کے حق و مرتبہ و درجہ سے گرانے اور اس کو گھٹانے کا تصور بھی نہ رہا۔

حضراتِ صحابہؓ کی زندگی معیاری تھی

تو ظاہر ہے کہ صحابہ کے اخلاق اور ان کی زندگی ضرور معیاری و مثالی ہوئی، پھر اب کسی کو کیا حق ہے اور کسی کا کیا منہ ہے کہ یوں کہے کہ صحابہؓ کی زندگی معیاری نہ تھی، جیسا کہ بعض کہہ رہے ہیں، میری عادت ہے کہ میں کھلا نہیں کرتا، اس لیے نام نہیں لیا، بعض حضرات تو صاف صاف کہہ دیتے ہیں، اور اس نیت سے بھی کہ ان کی خورد و برد سے محفوظ رہیں، ایسی جماعتوں کا صاف صاف نام ذکر کردیا جاتا ہے، چوں کہ ان کی کتابوں کا بہت مطالعہ کیے ہوتے ہیں، میرا تو مطالعہ بھی نہیں، مجھے درسیات ہی کے مطالعہ کی فرصت نہیں، حتی کہ ناشتہ اور کھانے اور سونے تک کی فرصت مشکل۔

میں نام نہیں لینا چاہتا تھا مگر ضرورت کی وجہ سے کہتا ہوں: ہمارے مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ مودودی جماعت کے بارے میں بہت تشدد فرماتے

(۱) السنن الكبرى للبيهقى، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، بَاب: بَيَانُ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَمَعَالِيهَا إلخ، رقم الحديث: ۲۰۷۸۲.

تھے۔ بڑے سخت سخت فتوی ان لوگوں کے بارے میں ہیں۔ مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی بھی اسی سلسلے میں بڑے سخت ہیں۔ حضرت شیخ الادبؒ وغیرہ نے مودودی کی کتابوں کو دیکھ کر ان کے اقوال جمع کیے اور جوابات میں کتابیں شائع فرمائیں۔

ناقص العلم اور غیر محقق کو بلا تمیز ہر کتاب کا مطالعہ مضر ہوتا ہے

تو چوں کہ ایسی غلط کتابیں ایسی غلط جماعتوں کی طرف سے شائع ہوتی ہیں، اس لیے محققین ایسی کتابوں کے مطالعہ سے منع فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کتاب کے مطالعہ سے پیشتر مؤلف اور مصنف کا نام، اس کا حال معلوم کرلیا کرو، اس سے کتاب کے مفید، مضر ہونے کا علم ہوسکتا ہے اور قابل مطالعہ اور غیر قابل مطالعہ کتب میں تمیز ہوسکتی ہے، ناقص العلم اور غیر محقق کو بلا تمیز ہر کتاب کا مطالعہ مضر ہوتا ہے، جب تک علم صحیح مضبوط نہ ہو، بڑی احتیاط اور محققین کے حسب تجویز کتب کے مطالعہ کی پابندی ضروری ہے، ورنہ غلط اور باطل تحریر اور تقریر سے خود غلط فہمی میں مبتلا ہوجانا غالب ہے اور گمراہی کے بعد راہِ مستقیم کا پانا مستبعد اور ناممکن الحصول ہوجاتا ہے۔

اسی لیے تو میں ناولوں کے دیکھنے، مطالعہ کرنے سے منع کیا کرتا ہوں، بعض اداروں سے بعض طلبہ کے نام خطوط آتے ہیں، عجیب عجیب ہوتے ہیں، چنانچہ ابھی چند روز قبل ایک کارڈ پر نظر پڑی، شروع ہی میں ایک شعر تھا جس کو دیکھ کر طبیعت چونک گئی، دیکھا تو مضمون ناولانہ تھا، اسی لیے فقیر کو حق ہے کارڈ دیکھ لینے کا بلکہ لفافہ کھول کر بھی دیکھنا جائز ہے من حیث الانتظام والترتیب، غرض ناول دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اردو انھیں سے آتی ہے، گویا اپنی زبان

سے اقرار کرتے ہیں کہ ہماری استعداد اتنی خراب ہے کہ اگر چہ پڑھ لیا لیکن اردو تک نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ اعطائے سند کے مستحق نہیں، یہ گفتگو تو علمی زندگی کے متعلق تھی۔

سینما بینی کو حلال کروانے کا حیلہ

اب رہی عملی زندگی، اس کے متعلق یوں کہا جاتا ہے کہ عملی زندگی سینما سے بنتی ہے، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے یوں کہے کہ گو بخاری وغیرہ سے معیاری زندگی کے حالات پڑھ کر معلوم کر لیے مگر عملاً سینما دیکھ کر حاصل ہوگی، اس سے بہت کم کہتا ہوں مگر کیا بتلاؤں میرا جی جلا ہوا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ داڑھی کو کہا جائے کہ اس کی داڑھی بکرے کی داڑھی جیسی ہے، جب اس تحقیر آمیز لہجہ وعنوان کو آپ سنیں گے تو حمیت شریعت میں اس کو ہی تو کہہ دیں گے، ٹھیک اسی طریقہ سے نمازیں پڑھ کر سینما کی تحسین کرتا ہے اور نماز، حج وغیرہ کی تصویریں دیکھنا تو درکنار، قراءتِ قرآن جو کہ عبادت ہے، اس کا بھی رکارڈ میں سننا منع ہے۔ سینما کو عملی زندگی کا نمونہ قرار دینے والا گویا یوں کہہ رہا ہے کہ میں صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی سے متأثر نہیں ہوا، میری زندگی بس سینما سے بنی اور گویا یوں کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ولی، بزرگ، عالم عملی نمونہ نہیں، اگر ہے تو سینما ہے، کس قدر بعید از عقل بات ہے کہ جنگل میں کھیل کر کے اس کے عکوس پردوں پر آجائیں جو سینما کی حقیقت ہے، اس نقلی چیز سے عملی زندگی بن جائے اور علماء، اولیاء جو اپنے اعمال میں، اخلاق میں صحابہؓ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل رکھتے ہیں، ان کی نقل سے عملی زندگی نہ بنے، یہ کیا انصاف ہے؟۔

اب سمجھ لو کہ محض پڑھ لینا کافی نہیں، اس سے اتنی استعداد پیدا ہونا ضروری ہے کہ حالاتِ زمانہ پر انطباق اور جزئیاتِ حادثہ کے لیے استنباط کرنا اور اس کو

پھیلانا آجائے۔

یہ کلام اس پر تھا کہ حقیقت امانت یہ ہے کہ صبح وشام یعنی ہمہ وقت کسی کے حق ومرتبہ کا کم کرنا تو درکنار، اس کا تصور وتخیل بھی نہ آنے پائے اور حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ مکارم اخلاق تام اور کامل کردوں تو لامحالہ آپ نے یہ چیز بہ احسن وجوہ پیدا فرما کر دنیا کے سامنے انھیں روشن ستارے بنا کر چھوڑ گئے، اسی لیے آپ نے یہ ارشاد فرما کر "أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ" سے ان کے معیار حق ہونے کی تصدیق فرمادی، پس ثابت ہوا کہ صحابہؓ کی زندگی معیاری زندگی تھی (۱)۔

غیر عربی کے سامنے قرآن وحدیث کی تفصیل کیوں ضروری ہے؟

ہمیں بھی چاہیے کہ ایسا بننے کی سعی اور کوشش ہو، اگر ان کے برابر نہیں بن سکتے تو ان کی نظیر اور ان کا نمونہ تو بنیں، تعلم میں بھی، تعمل میں بھی کہ علم وعمل کا مادہ ایک ہے، علم کی ذات کا تقاضا عمل ہے، حضور اکرم ﷺ نہایت جامع الکلم تھے، آپ کے ایک ایک لفظ میں معانی کثیرہ ہوتے ہیں، آپ کے اولین مخاطب اہل لسان ہیں، وہ ایک لفظ سن کر کہیں سے کہیں پہنچ گئے، ہم اہل لسان نہیں، اس لیے ہمارے سامنے اس کی شروح وتفاصیل کا آنا ضروری ہے، تب مطلب سمجھ میں آوے گا، اس لیے اساتذہ تفصیلاً بیان کرتے ہیں جو آپ کے سامنے پیش کیا گیا کہ حیا میں حیات کس طرح ہے اور یہ مقدمۂ ایمان کیسے بنتی ہے اور امانت کس طرح مقدمہ ایمان ہوتی ہے، اس سے امن کیسے آتا ہے۔

(۱) چند صفحات پہلے اس حدیث کی تخریج تلخیص الحبیر کے حوالے سے گذر چکی ہے۔

امام بخاریؒ نے مرجیہ وکرامیہ پر رد کرتے ہوئے اچھی طرح ثابت کردیا کہ تمہارا یہ کہنا کہ اعمال کو ایمان میں کوئی دخل اور اس سے کوئی علاقہ نہیں بالکل غلط ہے، دیکھو اعمال کو نہایت خاص علاقہ ہے ایمان سے بلکہ اعمال کا تو سبب یعنی حیاء بھی ایمان کا جزء ہے، حیاء کی کمی زیادتی سے ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، پس ایمان کا کم زیادہ ہونا اور اس سے مرکب ہونا ثابت ہو گیا، لہٰذا اپنے اندر حیاء پیدا کرنے کی پوری پوری سعی اور کوشش ہو اور جو حیاء اپنے اندر سے نکل چکی ہو، اس کو پھر سے اپنے اندر لایا جائے اور جو موجود ہو اس کو باقی رکھنے اور اس کو مضبوط کرنے کی سعی بلیغ اور جہد تام ہو کہ یہ بھی اعلیٰ فرد ایمانیات میں سے ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

☆☆☆

الدرس السادس والثلاثون

بَابٌ :{فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلاَةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ} [التوبة :٥]

۲۴ ۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسْنَدِيُّ، قَالَ :حَدَّثَنَا أَبُو رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ بْنُ عُمَارَةَ، قَالَ :حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ وَاقِدِ بْنِ مُحَمَّدٍ، قَالَ :سَمِعْتُ أَبِي يُحَدِّثُ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلاَةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الإِسْلاَمِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ.

ترجمۃ الباب قائم کرنے کی غرض

یہ ترجمۂ باب اس لیے باندھا ہے کہ اس سے فرقہ مرجیہ وکرامیہ پر رد کیا جائے (۱) کہ ان کے نزدیک اعمال کا ایمان سے کوئی علاقہ نہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ برابر آیات واحادیث ان کی تردید میں لاتے چلے جارہے ہیں، من جملہ ان کے یہ باب بھی ہے جو عجیب غریب ترتیب کے ساتھ باندھا ہے، گویا فرمارہے ہیں کہ اعمال کو ایمان سے جہاں اوروجوہ سے تعلق ہے، وہیں اس طرح بھی ہے کہ اگر ان اعمالِ حسنہ کو نہ بجایا اور نہ بجالاتا رہا تو جس طرح غیر مؤمن سے قتال وجہاد کی اجازت ہے، (سبب قتال غیر مؤمن سے متعلق آیندہ تفصیلی حکم آئے گا۔) اسی طرح بعد اقرار شہادتین بھی ان اعمال کے تارک سے بسبب ترک اعمال قتال کا حکم ہے، آخرت کا معاملہ الگ ہے مگر دنیا میں ترک اعمال کے ساتھ

(۱) دليل على أن تارك الصلاة ومانع الزكاة لا يخلى سبيله ومراد المؤلف بهذا الردّ على المرجئة في قولهم :إن الإيمان غير محتاج إلى الأعمال مع التنبيه على أن الأعمال من الإيمان. (القسطلانی :۱/۱۰۸)غرض المصنف رحمه الله:أن تلك الأعمال من الإيمان، فكما أنه لا نجاةَ في الآخرة بدون الأعمال كذلك لا يُكفُّ القتال عنهم في الدنيا إلا بها.(فيض الباری: ۱/۱۸۰)

پیچھا چھوڑ دیا جائے اور تخلیۂ سبیل ہو جائے، ایسا نہیں بلکہ ایسے مؤمن تارک اعمال حسنہ سے قتال کا حکم ہے، معلوم ہوا کہ اعمال کو شہادتین کے ساتھ ساتھ رکھا گیا کہ جس طرح ترک شہادتین پر قتال کا حکم ہے، ترک اعمال پر بھی تارکین سے قتال و جہاد کرنے کا حکم ہے، ان میں سے جو جہاد میں قتل ہو گئے، وہ قتل اور باقی ماندوں کو محبوس کرلیا جائے گا، اس کے باوجود کہ اعمال کو ایمان کے ساتھ نہایت درجہ شدید تلازم وتساوی کا تعلق ہے، پھر بھی یہ کہنا کہ اعمال ایمان سے بے تعلق ہیں، بالکل غلط ہے اور باطل ہے۔ چوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہاں مجھے اوراحکام عطا کیے گئے، یہ بھی حکم فرمایا گیا کہ جب تک وحدانیت واجبہ واقرار رسالت نہ ہو اور اسی پر بس نہیں بلکہ نماز روزہ زکوۃ حج کی پابندی نہ کرے اور نہ کرتے رہیں، اس وقت تک ان سے قتال و جہاد بند نہ کروں بلکہ قتال جاری رکھوں، ''أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلاَةَ :الحديث''۔

تو گویا امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اے مرجیہ وکرامیہ! دیکھا تم نے کہ حضور اقدس ﷺ نے شہادت کے ساتھ اعمال نماز وغیرہ کو بھی رکھا، اس سے امام بخاریؒ نے مرجیہ وکرامیہ پر کیا ہی عجیب طور سے نہایت پختگی اور عمدگی اور بہتری اور مضبوطی دلیل سے رد فرمایا۔ یہ کلام طریق حدیث کے اعتبار سے بہ ردِ مرجیہ ختم ہو گیا اور امام بخاریؒ کا مذہب ثابت ہو گیا کہ اعمال ایمان کے لیے بہت ضروری ہیں، ان سے ایمان پر اثر پڑتا ہے اور حسب اعمال حسنہ وسیئہ بگاڑ وسدھار ایمان میں رونما ہوگا۔

جہاد کا حکم صرف اقامتِ دین کے لیے ہے

اب الفاظ حدیث (أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلاَةَ:الحديث) کے اعتبار سے

مباحث باقی ہیں : (۱) تین چیزوں کے ترک پر مقاتلہ کے لیے فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ حصول حکومت اور طلب جاہ کے لیے مقاتلہ جائز نہیں بلکہ حفاظت دین اور نشر و اشاعت دین، احیائے دین ہی کے لیے حکم ہے، صرف مال و جاہ طلبی کے لیے فی نفسہ قتال و جہاد کا حکم نہیں، چوں کہ اس عالَم میں کفر و شرک کی اشاعت سے اور اس کفر و شرک کے احکام کے نفاذ پر نظام عالم میں برتری اور بہتری کے بہ جائے بربادی و تباہی آتی ہے، فتن و فسادات کے دروازے کھلتے ہیں، نظام عالم درہم برہم ہوتا ہے، سکون چین کے بہ جائے زندگی پریشانی اور حیرانی میں پڑ جاتی ہے، افراتفری ہو جاتی ہے۔

تو گویا حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ذاتِ باری تعالی نے دنیائے انسانی کے لیے میرے واسطے سے ایک ایسا نظام بھیجا ہے جس کے اختیار کرنے سے پورا امن و اطمینان قائم ہو جاتا ہے، زندگی نہایت پرسکون اور پرلطف بن جاتی ہے؛ لہٰذا تم میرا یہ نظام قبول کرو اور ضرور قبول کرو، اس کے ہی قبول کرنے سے تمھاری جان اور مال اور عزت محفوظ رہ سکتے ہیں، ورنہ نہیں اور وہ نظام دینِ اسلام ہے، پس اسلام یعنی اقرارِ رسالت اور اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ اختیار کرو اور اس کو قائم و جاری رکھو تو قتال اور جنگ سے رہائی ہے، ورنہ نہیں۔ الحاصل جنگ و جہاد صرف اقامت دین اور اشاعت اسلام کے لیے مشروع ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا طلبی یعنی مال و جاہ طلبی کی غرض سے جنگ و جہاد جائز نہیں۔

نجات دنیویہ ظاہری اعمال پر اور نجاتِ اخرویہ قلبی اخلاص پر موقوف ہے

(۲) اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ جب تک اقرار رسالت اور

نماز روزکوٰۃ وغیرہ اختیار کر کے قائم ودائم نہ رہو، جب تک جہاد وقتال کا حکم ہے، اگر یہ ہو گیا تو دنیا میں تخلیہ سبیل ہو جائے گا اور ظاہری عذاب سے دنیا میں نجات ہو جائے گی، باقی دل وباطن کا معاملہ تمہارے اور خدا کے درمیان ہے (۱)، اس کو تم جانو اور وہ جانیں، میرے سامنے ظاہر حال ہو گا، اسی کے اعتبار سے ضمانت اور ذمہ داری ظاہری عذاب سے رستگاری کی ہے، رہا آخرت کا معاملہ، سو وہ اخلاص پر موقوف ہے، اگر اخلاص قلب سے اسلام قبول کیا ہے یعنی ظاہر کے ساتھ باطن بھی اسلام سے معمور اور منور کرلیا تو حقیقی اور دائمی عذاب سے بھی نجات ہو جائے گی، ورنہ نفاق کے ساتھ یعنی بدونِ اخلاص اسلام قبول کر لینے سے نجات آخرت ممکن نہیں۔

(۳) تارکین صلوٰۃ وتارکین زکوٰۃ سے قتال وجہاد کا حکم مشروط بالقدرۃ الشرعیہ ہے یعنی تارکین کی طرف سے اصرار ہونے پر اس کے دفع کی قوت وقدرت حاصل ہو۔

حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اصلی

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام عموماً اور حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً تبلیغ کے لیے تشریف لائے تھے، ان کا ہر کام اور ہر کلام تبلیغ وترویج دین پر مبنی تھا، حتی کہ مملکت وسلطنت بھی اشاعت دین واقامت حدود واحکام وامن کی خاطر تھی، جیسا کہ حدیث باب اس میں صریح ہے۔

(۱) ومعناه هو أن أمور سرائرهم إلى الله وأما نحن فنحكم بالظاهر فنعاملهم بمقتضى ظاهر أقوالهم وأفعالهم أو معناه هذا القتال وهذه العصمة إنما هو من الأحكام الدنيوية وهو ما يتعلق بنا وأما الأمور الأخروية من دخول الجنة والنار والثواب والعقاب وكميتها وكيفيتهافهو مفوض إلى الله تعالى لا دخل لنا فيه.(شرح الكرماني: ۱/۱۲۴، ۱۲۳)

تبلیغ دین کے باب میں نبوی طریقۂ کار

ابتدائی دورِ رسالت میں تبلیغ کی نوعیت یہ تھی کہ آپ ﷺ لساناً ترغیب وترہیب کے ذریعہ صداقت ایمان قلوب میں جاگزیں کرنے کی مختلف تدابیر وطرقِ پند ووعظ استعمال فرماتے رہے، تا آں کہ قوتِ سنانی حاصل ہوگئی، قوتِ سنانی کے حصول کے بعد اسلحہ،تلوار، ہتھیار سے کام لینا شروع فرمایا۔

ہمارے لیے تبلیغ دین کا طریقۂ کار

اب ہمارے اس زمانے میں کہ قوتِ سنانی حاصل نہیں تو جو قوت حاصل ہے، اس سے ہی کام لینا ضروری ہے یعنی جب تک قوتِ سنانی حاصل نہ ہو، اس وقت تک قوتِ لسانی سے ہی کام لیتے رہنا چاہیے، جس کی ترتیب یہ ہے کہ اولاً اپنے گھر اور خاندان سے شروع کرنا اور حکمت وشفقت ونرمی سے عوارض وخوارج وکوائف مزاج بہ لحاظِ فہم بڑے حلم وتدبر سے کوشش بلیغ وسعی پیہم کے ذریعہ جس میں کسی محقق اور مربیٔ روحانی کی ماتحتی اور جذبات کو دباتے ہوئے کام جاری رکھنا جزو اعظم ہے۔

اس سے فراغت کے بعد محلہ والوں میں اور اس کے بعد اپنی بستی میں اور اس کے بعد قرب والی بستیوں میں، اس طرح درجہ بہ درجہ پورے ضلع میں اور پھر صوبہ میں پھر اپنے پورے ملک میں۔ جب یہاں قوتِ دینی وایمانی پیدا ہوجائے پھر کہیں دیگر ممالک کا نمبر آتا ہے، یہی ترتیب جہاد کی ہے کہ اولاً اپنے قریب والوں سے پھر بعید والوں سے جہاد کیا جائے گا۔

دینی احکام ترک کرنے والوں کے ساتھ حضور ﷺ کے رویے اور ہمارے رویے کا فرق

غرض قوتِ سنانی اگرچہ ہم کو حاصل نہیں لیکن جس درجہ قوت حاصل ہے،

افسوس یہ ہے کہ اس قوت کے مطابق دین کے ابھارنے اور پھیلانے میں سعی وکوشش نہیں، ہم دین کو برباد کرنے والوں سے برابر تعلقات اور محبت ودوستی رکھتے ہیں، حالاں کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں ایسے موقع پر یہ نمونۂ عمل عطا فرمایا کہ ایسوں سے مقاطعہ اور متارکہ ہونا چاہیے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کی شرکت ترک کرنے والوں سے مقاطعہ کا حکم فرمادیا تھا : بیع وشراء، اکل وشرب، سلام وکلام، ملنا جلنا، سب بند کردیا تھا، حتیٰ کہ بیویوں کو منع فرمادیا تھا کہ وہ اپنے شوہروں سے نہ ملیں، ان کے پاس بالکل نہ جائیں اور روزانہ اسی کا نماز میں قول وقرار بھی کرتے ہیں، چنانچہ قنوتِ وتر میں ہم کہتے ہیں: ''وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ '' کہ ہم چھوڑتے ہیں، ترک کرتے ہیں ان کو جنھوں نے آپ کے ساتھ فجور کیا یعنی آپ کے حکموں سے سرتابی کی، ایسوں کے ساتھ ہمارا میل جول، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کوئی تعلق نہیں، ان سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں، اس کے باوجود حجروں میں اپنے ساتھیوں سے کسی منکر کو دیکھنے پر کسی طرح تبلیغ نہیں کی جاتی ہے۔ البتہ وہ جہت اختیار کرنا جس سے انتشار اور فتنہ ہو، وہ بھی تبلیغ نہیں۔

غرض! حضور ﷺ کا مقاطعہ فرمانا، حتیٰ کہ بیویوں کو شوہروں سے روک دینا، سب پڑھ کر آئے ہیں مگر اونٹ رے اونٹ! تیری کون سی کل سیدھی؟ کوئی بھی نہیں، حتی کہ پیشاب بھی الٹا ہی کرتا ہے، صورت پر داڑھی نہیں، پائجامہ، لنگی ٹخنوں سے نیچی، جماعت تک کا اہتمام نہیں بلکہ نماز تک ترک کردیتا ہے، یہ کہاں کی طالب علمی ہے، ؎

اس پر دعوی ہے کہ ہم ہیں ہوشیار	کیا یہی ہے ہوشیاروں کا شعار

باوجود حضور اکرم ﷺ کے اس نمونۂ عملی کے، ہمارے برابر ایسوں سے تعلقات اور میل جول قائم ہیں، منھ چیں بنے کے ساتھ اسی طرح پیش آتے ہیں، کوئی کسی کے حجرے میں جارہا ہے، کوئی کسی سے تعلق کررہا ہے، پڑھتے ہیں

بخاری شریف اور میل جول اسی طرح چلتا ہے، وہی رقابتیں چلتی ہیں۔

تو تبلیغ حسبِ قوت وقدرت جتنا زور چلے، اسے بالترتیب کرے، نہ یہ کہ دوسروں کو، باہر والوں کو مواعظ و بیانات خوب سنائے جائیں اور اپنوں کو، اپنے قرب والوں کو کچھ نہیں، حجروں میں کیا ہورہا ہے؟ سب دیکھتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے، گویا خائف ہیں، جیسے کہ کہتے ہی کوئی ذبح کردے گا۔ دیکھیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرض جہاد کے ترک پر نہایت پختہ طریق پر مقاطعہ فرما دیا، اس غلطی کا بعض بعض نے تدارک بھی خوب کیا، مسجد نبوی میں اپنے کو ستون سے باندھ دیا، آج کون اپنی غلطی کا ایسا تو کیا کیسا بھی کوئی تدارک کرتا ہے؟ یہاں تک امانت، صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ پر کلام تھا، یہی طریق تبلیغ لسانی کا بھی ہے اور تبلیغ کتابی کا بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد مکتوب نامہ مما لک غیر میں روانہ فرمائے۔

قبولِ اسلام کے بعد کفر وشرک سے توبہ شرط ہے یا نہیں؟

اس کے بعد یعنی اقامت صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ ارشاد باری تعالی ہے: ”فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ“ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ اقرارِ شہادتین یعنی اقرارِ رسالت اور اختیار اسلام کے بعد کفر وشرک سے توبہ بھی ضروری ہے، یا بلا توبہ اس کا اسلام کافی ہے۔ ائمہ ثلثہؒ ایک طرف ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے جدا ہے، چناں چہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ توبہ ضروری ہے، بلا اظہارِ توبہ اقرارِ لسانی اور اختیارِ اسلام کافی نہیں، ضروری ہے کہ اعلان کرے کہ میں شرک، کفر پر نادم ہوں، اس سے بیزار رہوں، اس سے نفور رہوں اور

کہتا ہوں کہ: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ، پھر اس کے ساتھ نماز وزکوۃ کی پابندی بھی کرے۔

ائمہ ثلثہؒ فرماتے ہیں کہ اقرار رسالت وتوحید کافی ہے، اظہارِ توبہ ضروری نہیں، چوں کہ ہم ظاہر کے مکلف ہیں، باطن کے نہیں، خود آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ '' نیز اقرار مذکور سے بیزاری ونفرت عن الکفر والشرک ظاہر ہے، ورنہ لازم آوے گا اور ماننا پڑے گا کہ اسلام کے ساتھ نفاق بھی ہو اور یہ اجتماع ضدین ہے؛ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اقرار توحید ورسالت کے بعد اس کو مسلمان سمجھیں گے اور مسلمانوں جیسے اس کے بھی حقوق ہوں گے۔

ایک اشکال:

صلح وجزیہ غایتِ قتال ہونے کے باوجود حدیث میں صرف اسلام کو قتال کی غایت کیوں بتایا گیا ہے؟

اب یہاں ایک بحث ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسلام نہ قبول کریں تو بس ان کے لیے صرف یہی شکل ہے کہ ان کے ساتھ قتال وجہاد ہو، حالاں کہ ہمیں معلوم ہے کہ قتال وجہاد تو آخری مرتبہ ہے، اس سے قبل دو چیزیں اور ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر اقرارِ توحید ورسالت کرلیا فبہا، ورنہ مصالحت کی صورت ہوگی اور مصالحت نہ ہو تو ان پر جزیہ مقرر کیا جائے گا، ماتحتی اختیار کرنا ضروری ہوگا، (مصالحت کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ؕ﴾ [الأنفال: ٦١]۔ اور صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی اس کی واضح دلیل ہے اور جزیہ کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا

الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴿۲۹﴾ [التوبة]۔

پھر اس حدیث میں ایک ہی صورت ترک قتال و جہاد کی ہے جس سے باقی صورتیں منفی معلوم ہوتی ہیں، اس اشکال کا حل اور اس بحث کے چند جوابات ہیں۔

مذکورہ اشکال کا پہلا جواب

(۱) یہ حدیث ابتدائے اسلام کے زمانہ کی ہے اور صلح ۶ رھ کو اور جزیہ ۹ رھ کو مشروع ہوا ہے، پس یہ حدیث منسوخ ہے(۱)، اب علی الترتیب تین چیزوں میں سے ہر ایک معدوم ہونے پر قتال و جہاد کیا جاوے گا، تاوقتے کہ تین مذکورہ صورتوں میں سے ایک بھی باقی رہے گی، قتال و جہاد کی اجازت نہیں۔

مذکورہ اشکال کا دوسرا جواب

(۲) اور بعضوں نے یہ جواب دیا کہ: أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ میں الف لام عہد ذہنی کا ہے، مراد خاص خطہ کے لوگ ہیں یعنی صرف مشرکین عرب مراد ہیں، چنانچہ نسائی شریف میں حدیث ہے: ”أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ الْمُشْرِكِينَ“ (۲) پس النَّاسَ سے مراد مشرکین عرب ہیں، ان کے لیے یہی حکم تھا کہ عدم اقرار پر نہ جزیہ ہے، نہ صلح ہے، پس جہاد کیا جائے گا(۳)۔

البتہ صلح حدیبیہ ایک مرتبہ ہو چکی تھی، بعد میں یہ حکم ان کے لیے باقی نہ رہا، اس

---

(۱) فإن قيل مقتضى الحديث قتال كل من امتنع من التوحيد فكيف ترك قتال مؤدي الجزية والمعاهد فالجواب من أوجه أحدها دعوى النسخ بأن يكون الإذن بأخذ الجزية والمعاهدة متأخرا عن هذه الأحاديث بدليل أنه متأخر عن قوله تعالى اقتلوا المشركين. (فتح الباري: ۱/۷۷)

(۲) سنن النسائی، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضى الله عنه، كِتَابُ تَحْرِيمِ الدَّمِ، رقم الحديث: ۳۹۶۶.

(۳) ثالثها أن يكون من العام الذي أريد به الخاص فيكون المراد بالناس في قوله أقاتل الناس أي المشركين من غير أهل الكتاب ويدل عليه رواية النسائي بلفظ أمرت أن أقاتل المشركين إلخ. (فتح الباري: ۱/۷۷)

لیے کہ آپ ﷺ کی زندگی پوری ان لوگوں میں بچپن سے لے کر آخر تک گذری ،آپ کے تمام کمالات، صداقت، امانت اور عفت سے بہ راہ راست واقف تھے، پھر کلام عربی کے محاورات کے شناسا اور عربی کلام کو پورے طریقہ سے جانتے پہچانتے سمجھتے تھے، کلامِ خدا ہونا جان چکے تھے، نبی ورسول ہونا یقین کے ساتھ ان کو معلوم ہو گیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ آپ ﷺ پر ایمان لے آتے، باوجود ایں ہمہ عناداً وتکبراً اسلام کے منکر اوراس کے دشمن بنے، ان کا جرم نہایت شدید بلکہ اشد ترین تھا، اس لیے ان کو کسی مہلت کی ضرورت باقی نہ تھی، جو صلح وجزیہ کی شکل میں مقرر کی جاتی ، پس نہیں قبول کرتے تو ان کے وجود سے دنیا کو پاک ہی کر دینا موافق عقل اور عین حکمت تھا۔

مذکورہ اشکال کا تیسرا جواب

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اہل عرب بنو اسماعیل ہیں جو نہایت اعلی شرف والے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ مغلوبیت وذلت نہ ہو اور جزیہ ذلت کی زندگی ہے، اور صلح مغلوبیت کی زندگی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ایسے زندگی پر قتل ہو جانے کو ترجیح دیتے تھے۔

چناں چہ ابوجہل میدان جنگ میں قتل ہوا، مرتے وقت بھی اس پر فخر کر رہا تھا کہ میں میدان جنگ میں قتل ہوا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالی عنہ طبعی موت پر افسوس فرماتے تھے اور حسرت فرما رہے تھے کہ کاش میں چارپائی پر نہ مرتا!۔

تو اہل عرب میں حوصلہ اور غیرت تھی اس لیے مغلوب اور ذلت گوارہ نہیں تھی ، پس ان کے لیے صرف جہاد وقتال کا ہی حکم ہوا اور غیروں کے لیے یعنی مشرکین عرب کے علاوہ کے لیے صلح ، اس واسطے مقرر ہوئی کہ خود انھوں نے وہ معجزات وکمالات آپ کے نہ دیکھے تھے جو عرب والوں نے دیکھے تھے، نیز عربی

زبان ان کی مادری زبان نہ تھی، اس لیے اس کے کلامِ خدا ہونے میں، اس کے سمجھنے میں ذرا دیر و مہلت تامل وتفکر کی ضرورت تھی، چنانچہ مہلت گذرنے پر قتال چوں کہ ان سے رفع نہیں تھا، صرف اس مصلحت وحکمت سے اس کا التواء ہو گیا تھا، اب عارض رفع ہو جانے پر حکم اپنی اصل پر آ گیا یعنی قتال و جہاد درست ہوانے کا حکم ہو گیا اور جزیہ سے مغلوبیت ہو جاتی ہے جو کہ اشاعت اسلام کے لیے درکار ہے کہ غیر مسلمین مغلوب ہو جائیں؛ تا کہ اسلام اور احکام اسلام کے اجراء ونفاذ میں آڑے نہ آسکیں لیکن اس جزیہ کی حد مقرر نہیں کہ کب تک یہ قانون ان کے لیے ہوگا، یہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے نزول تک قانون جاری رہے گا، اس کے بعد بس، پھر یا اسلام یا جہاد ہوگا مگر یہ قانون ان کی شریعت کا نہ ہوگا بلکہ ہمارے شریعت کا ہوگا جس کا اجراء اس وقت ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام تو ہمارے رسول اکرم ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائیں گے اور شریعت اسلامیہ کے پورے پورے متبع ہوں گے۔

تارکِ صلوۃ کا حکم

اب ایک بحث صلوٰۃ وزکوۃ سے متعلق اور باقی رہ گئی۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جان بوجھ کر ایک وقت کی بھی نماز ترک کر دی تو وہ کافر ہے اور مرتد ہے، اس لیے اس کو قتل کرنا واجب ہے، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کافر تو نہیں ہوا مگر جرم نہایت سخت اور سنگین کیا، اس لیے سزا یہ ہے کہ اس پر حد جاری کی جائے اور اس کو قتل کر دیا جائے؛ تا کہ یہ دوسروں کو فسادِ شرعی سے باز رکھ دے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تین دن تک اس کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، اگر توبہ کر کے نماز شروع کر دے تو بہتر ہے، اس کو رہا کر دیا جائے گا، ورنہ اس کو کوڑوں سے اس قدر مارا جائے کہ لہولہان کر دیا جائے اور اس وقت تک زدوکوب جاری رکھی

جائے، جب تک وہ تائب ہو کر نماز شروع نہ کر دے (۱) اور اگر امام تعزیراً وسیاسۃً اس کو قتل کر دے تو یہ بھی درست ہے، پس اس طرح ائمہ اربعہ تارک نماز کے قتل پر متفق ہو گئے۔

تارکِ صلوۃ کو سزا دینا حکومت کا کام ہے، عوام کا نہیں

لیکن یہ کام صاحب حکومت کا ہے، غیر کو یہ جائز نہیں کہ نماز کے لیے کوڑے اور درے مارے، جیسے بعض نوجوانوں کی ایک جماعت درے والوں کی نکلی تھی، چنانچہ ایک ماجری کے تھے جو یہاں پہلے پڑھتے تھے، چرتھاول میں، دوسرے مقامات میں اور انھوں نے دروں سے نماز پڑھوانی شروع کی تو ان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، اس لیے یہ جائز نہیں، رفع فتنہ کا ان کے پاس کیا علاج ہے؟ البتہ بعض صورتوں میں مقاطعہ کر سکتے ہیں، بول چال وغیرہ بند اور معاملات معاشرات ختم کیے جا سکتے ہیں۔

ہماری دینی بے غیرتی و بے حمیتی

اب بار بار دیکھتے ہیں کہ نماز نہیں پڑھتا، پھر بھی بول چال کھانا پینا اور خوشی خوشی ان کے ساتھ رہنا سہنا ہے، یہ کیا حمیت اور غیرت دینی ہے؟ بلکہ ایسوں سے اور زیادہ تعلق ومحبت ہے، حالاں کہ ان کو روکنے کا بلکہ قتل کا حکم تھا، خیر اگر حکومت

(۱) فذهب إبراهيم النخعي وابن المبارك وأحمد بن حنبل وإسحاق بن راهويه إلى أن تارك الصلاة عمداً من غير عذر حتى يخرج وقتها كافر....وقال مكحول والشافعي تارك الصلاة مقتول كما يقتل الكافر ولا يخرح بذلك من الملة....وقال أبو حنيفة وأصحابه تارك الصلاة لا يكفر ولا يقتل ولكن يحبس ويضرب حتى يصلي...(معالم السنن للخطابی:۳۱۴/۴)

نہ ہونے کے سبب حکم قتل تارک صلوٰۃ کی تعمیل سے عاجز ہے تو اتنی تو قدرت تھی کہ ایسوں کے ساتھ محبت و دوستانہ تعلقات نہ رکھتے؛ مگر افسوس ہے کہ ایسا بھی نہیں کرتے۔ کیا حدیث "مَنْ رَأَى مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ" (١) بھی ذہن سے نکل گئی، قلبی تکدر جو پیشانی پر بل اور چہرے پر غصہ کے آثار نمایاں ہونے سے ظاہر ہوتا ہے، وہ بھی نہیں، معلوم ہوا کہ ان افعال پر کچھ رنج اور نا گواری ہی نہیں۔

یہ دین کے متعلق حال ہے، ورنہ ابھی ذرا کسی سے خلافِ طبع بات پیش آجائے تو پھر کس قدر غصہ اور جوش اور نا گواری و نفرت اور بے دلی آشکارا ہوتی ہے، پھر تو نمازی اور دین دار سے حد درجہ غیظ و غضب ہوگا، صورت دیکھنا گوارا نہ ہوگی، اس کی بات سننا زہر معلوم ہوگا، پوری عداوت و دشمنی ہوگی، اب تو اس کی حق بات بھی قبول نہ ہوگی بلکہ اس کی تردید ہوگی اور اس کے عمل صالح سے بھی ضد ہوگی، اس پر طرح طرح سے فقرہ کشی ہوگی، اس کو بدنام کرنے میں، دق اور ضرر پہنچانے میں ہر امکانی سعی اور پوری قوت سے کام لیا جائے گا، افتراء بہتان، غرض کوئی دقیقہ مخالفت میں باقی نہ رکھا جائے گا۔ وائے افسوس بر حال ما!۔

دوسری بحث زکوٰۃ کی رہ جاتی ہے، سو جو تفصیل نماز کے ترک کے بارے میں عرض ہوئی، شراح نے وہی تفصیل ترک زکوۃ پر لکھی ہے (٢)۔

---

(١) صحيح مسلم، عن طارق بن شهاب - وهذا حديث أبي بكر - كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان، وأن الإيمان يزيد وينقص، وأن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر واجبان، رقم الحديث: ٧٨ (٤٩).

(٢) ائمۂ ثلاثہ بھی مانع زکوۃ کے بارے میں ارتداد و قتل کے قائل نہیں ہیں بلکہ احناف کی طرح تعزیر کے قائل ہیں، ويلزمهم أنهم احتجوا به على قتل تارك الصلاة عمدا، ولم يقولوا بقتل مانع الزكاة، مع أن الحديث يشملها، ومذهبهم :أن مانع الزكاة تؤخذ منه قهرا ويعزر على تركها، وسئل الكرماني ههنا عن حكم تارك الزكاة ثم أجاب :بأن حكمهما واحد. (عمدة القاری: ١٨٢/١، ١٨١)

مانعین زکوۃ سے قتال کے سلسلے میں حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کے درمیان مکالمہ

اس پر حضرات شیخین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ وحضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا مکالمہ یاد آجاتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر جن لوگوں نے زکوٰۃ روک لی اور زکوٰۃ ادا کرنا ترک کر دیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان سے جہاد کرنے کا عزم فرمایا، اس پر مثل دیگر صحابہؓ کے حضرت عمرؓ کی بھی رائے موافق نہ تھی، عرض کیا کہ ان سے جہاد نہ فرمائیں، یہ مرتد نہیں ہوئے، یہ تو مقر شہادتین ہیں، ان سے جہاد کی بات نہ کیجیے، یہ ان کے بخل اور شرارتِ نفس کی بات ہے، سرکشی ہے مگر ارتداد نہیں، اس لیے میری رائے ان سے قتال کرنے کی نہیں مگر حضرت صدیق اکبرؓ اسی شرح صدر کے ساتھ برقرار رہے اور حضرت عمرؓ کا ان کے بارے میں عدم قتل کا مشورہ قبول نہ فرمایا، تھوڑی دیر بعد حضرت عمرؓ کو بھی ان کے قتل کا شرح صدر ہو گیا اور ان سے قتال کرنا اور اس کا صحیح اور حق ہونا سمجھ میں آ گیا(۱)۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس قدر جلدی اور عجلت سے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کی تائید فرمائی، کیا اتنی جلدی ان لوگوں کا حال بدل گیا تھا کہ پہلے قتال جائز نہ سمجھا اور اب خود بھی آمادہ ہو گئے بلکہ شریک قتال ہو کر قتال فرمایا، چنانچہ مانعین زکوٰۃ کچھ قتل ہو گئے اور کچھ محبوس ہوئے۔

(۱) صحيح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله تعالى عنه، كِتَابُ الِاعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، بَابُ الِاقْتِدَاءِ بِسُنَنِ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث: ۷۲۸۴.

حضرت عمرؓ نے فوراً حضرت ابوبکرؓ کا موقف کیوں تسلیم کرلیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے مثل سابق اب بھی ان کو مرتد خیال نہیں فرمایا لیکن قتال کا جواز دوسری دلیل سے سمجھ میں آیا اور وہ عظمت شرع ہے کہ منع زکوٰۃ سے ظاہراً عظمت شرع کا اہمال اور اخلال ہے اگر اس پر روک تھام نہ کی گئی تو خیال یہ فرمایا کہ پھر ترک صلوٰۃ کی جرأت بھی لوگوں میں ہوسکتی ہے، آزادی بڑھتی چلی جائے گی اور شدہ شدہ دین بہت جلد ہی مٹتا نظر آجائے گا اور عظمت احکام الٰہی دلوں سے نکل کر پوری بدامنی اور فتن وفسادات کے دہانے کھل جائیں گے تو بقائے عظمت احکام الٰہی اور اس کی محافظت کی ضرورت سے آپ کی رائے عدم قتال سے قتال کی طرف بدل گئی۔

یہ ان کے اخلاص کی اور للٰہیت کی ایک عظیم الشان دلیل ہے کہ سمجھ میں آتے ہی ایک منٹ پہلے کی رائے کو باقی نہ رکھا، یہ ان کی فنائیت اور کمال عبدیت کی بات تھی کہ مطلقاً اس کی پرواہ نہ کی کہ کوئی کیا کہے گا کہ بڑے ضعف الرائے اور بات کے کچے ہیں، ذرا میں کچھ، ذرا میں کچھ، اس قسم کے اوہام فاسدہ اور خیالات کاسدہ فاسد المذاق اور سقیم الطبع انسانوں میں گھر کیا کرتے ہیں، ان حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عموماً اور حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خصوصاً اس سے بہت اونچی شان تھی، یہ لچر اور رکیک چیزیں وہاں قرار نہیں پکڑ سکتی تھیں، کبھی ذرا التفات ان کے تنبہ کے لیے کافی ہوتا تھا؛ چناں چہ حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کا ایک جملہ کافی ہوا: ”أجَبّار في الجاهلية

وخَوَّار في الإسلام" ؟(۱)۔

گویا خاموش طریقے سے حضرت ابو بکرؓ نے فرمادیا کہ اذان وختنہ جو کہ اگرچہ سنن ہیں مگر شعائر اسلام ہونے کی وجہ سے کہ عظمت اسلام کے نمایاں مظاہر ہیں، ان کے ترک سے قتال و جہاد ہوگا اور اس سے ان کا ذہن منتقل کرادیا، یہ عظمت احکام اسلام ہے جو وہاں سبب قتال ہے۔

ہمارے اندر عظمتِ اسلام کی بہت زیادہ کمی ہے

آج کل اسی عظمت اسلام کی کمی ہے، کسی اسلامی چیز کے چھوڑنے پر جب کوئی نصیحت کرتا ہے تو جواب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ یہ کہہ کر پرواہ نہیں کی جاتی اور اسی طرح اسلام ختم ہوتا ہے، جس طرح ایک ایک اینٹ نکل کر مکان ختم ہوجاتا ہے، اسی وجہ سے ایک آدھ اینٹ کسی جگہ سے نکل جاتی ہے تو مکان والے فوراً اس کی درستی کرتے ہیں، اور آئندہ کے لیے روک تھام اور حفاظت کردیتے ہیں، چوں کہ شدہ شدہ دیواریں منہدم ہوکر جڑوں تک نوبت آجاتی ہے اور ہم اس تمام تر بربادی کو گوارہ کرتے جارہے ہیں، مؤمن اور کافر میں کوئی فرق ہی نہیں کررہے ہیں، کافر کے لیے بھی ایصالِ ثواب ودعائے مغفرت کی جاتی ہے، نہیں معلوم وہ آیت وحدیث "نہی عن الصلوۃ والقیام علی قبورھم" ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ [التوبۃ: ۸۴] کہاں گئی؟۔

قبر صرف مٹی کے گڑھے کا نام نہیں ہے

اگر کوئی کہنے لگے کہ قبر ان کی کہاں ہے؟ وہ تو میدان ہے، ایسوں کو سمجھانا مشکل ہے، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ! ان کے لیے تو گڑھا ہی قبر ہے، حالاں کہ

(۱) جامع الأصول في أحاديث الرسول لابن الأثير: ۸/۲۰۵، القسم الأول: في الرجال، وأولهم: أبو بكر الصِّدِّيق - رضي الله عنه -، رقم الحديث: ۶۴۲۶.

قبر سے مراد برزخ ہے یعنی اس عالم اوراس عالم آخرت کے درمیان کا وقفہ، اگر قبر کے یہی معنی ہیں تو جو دریا میں ڈوب جاتا ہے یا درندہ اس کو کھالیتا ہے، کیا اس کے لیے عذابِ قبر نہیں ہوتا؟ ضرور ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد مردہ جس حال میں بھی ہو، وہی اس کی قبر ہے، پس خواہ جلا کر را کھ بنا دیا جائے یا درندہ اس کو کھا لے، مرنے کے بعد کی جو بھی حالت ہو، وہی اس کے لیے قبر ہے، پس بہرحال! وہاں جانا منع ہے، اگر چہ نمایاں طریقہ پر اصطلاحِ عوام کے مطابق مٹی کی قبر اس کے لیے تیار نہ کی جائے۔

لہٰذا عظمتِ احکامِ اسلام کی حفاظت ضروری ہے، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ اور دیگر صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین نے اس فعل قتال وجہاد مانعین زکوٰۃ سے بعد والوں کو تعلیم دے دی کہ اگر عظمت اسلام فوت ہو تو قتال کیا جائے۔

خصوصی طور پر نماز اور زکوۃ کو ذکر کرنے کی حکمتیں

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے علاوہ دیگر جو فرائض ہیں، ان کا ذکر حدیث میں نہیں فرمایا گیا؟ لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے متعلق کیا حکم ہے؟ ان میں سے کس کے ترک پر کیا معاملہ کیا جائے گا؟۔

(۱) جواب یہ ہے کہ ان کی اعظمیت اور زیادتی اہمیت کے باعث ان کا ذکر فرمایا، ورنہ دوسرے فرائض کا بھی یہی حکم ہے، ذکر شئے ماعدا کی نفی کو مستلزم نہیں (۱)۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ ان دو کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے

(۱) وإنما خصتا بالذكر...لكبر شأنهما على النفوس لتكررهما.(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۱/۸۰)

کہ عبادات بدنیہ وعبادات مالیہ دونوں کا حکم ایک ہے۔ پس عبادات بدنیہ سے فرد اعظم نماز کو ذکر فرمادیا اور عبادات مالیہ میں سے فرد اعظم زکوٰۃ کو بیان فرمادیا(۱)۔

دلالۃً واشارۃً باقی تمام افراد عبادات بدنیہ ومالیہ سب کا حکم انہی سے معلوم ہوگیا، چنانچہ ترک اذان اور ترک ختنہ کا بیان ابھی پیش کیا گیا۔ بات لمبی ہوتی چلی جارہی ہے، بعض نے اس حدیث سے متعدد استنباطات کیے ہیں جن میں سے چند عرض کئے گئے۔

اس باب سے مرجیہ وکرامیہ پر طریقۂ رد

امام بخاریؒ نے مرجیہ وکرامیہ پر رد فرمادیا کہ آیت اور حدیث سے معلوم ہوگیا کہ اعمال کو ایمان کے ساتھ اس درجہ شدید تعلق ہے اور توحید وایمان سے نہایت قریب کا علاقہ ہے پس تمہارا اعمال کو ایمان کے اعتبار سے بے دخل اور بے تعلق ماننا بالکل غلط اور باطل ہے، دیکھیے! حدیث باب میں بتلادیا گیا کہ ترکِ اعمال دنیا میں گوارا نہیں، سزائے قتل مقرر ہے تو بھلا آخرت میں کیوں کر ترکِ اعمال کو گوارا کرلیا جائے گا، بحمد اللہ تعالی مرجیہ پر خوب رد ہوگیا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

❁ ❁ ❁

(۱) وإنما خصتا بالذكر لأنهما أم العبادات البدنية والمالية وأساسهما، والعنوان على غيرهما، ولذا كانت الصلاة عماد الدين، والزكاة قنطرة الإسلام، وقرن بينهما في القرآن كثيرا.(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۱/۸۰)

الدرس السابع والثلاثون

بَابُ مَنْ قَالَ إِنَّ الإِيمَانَ هُوَ العَمَلُ

لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: {وَتِلْكَ الجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ} [الزخرف:٧٢] وَقَالَ عِدَّةٌ مِنْ أَهْلِ العِلْمِ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: {فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ} [الحجر:٩٣] عَنْ قَوْلِ: لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَقَالَ: {لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ العَامِلُونَ} [الصافات: ٦١]

بغیر قرآتِ حدیث ترجمہ شروع فرمایا: آیت "بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ" میں باء عوض اور بدل کے لیے ہے(۱)، یہ اور بھی کئی معنی میں آتی ہے: سبب، مقابلہ، الصاق اور اتصال وغیرہ کے لیے۔

باب قائم کرنے سے امام بخاریؒ کی غرض

مثل ابواب سابقہ یہ باب بھی امام بخاریؒ مرجیہ وکرامیہ کی تردید میں منعقد فرما رہے ہیں، آپ حضرات کو ان کا مذہب اچھی طرح معلوم ومحفوظ ہو گیا ہوگا کہ وہ کسی بھی حیثیت سے اعمال کے ایمان کے ساتھ علاقہ ہونے کے قائل نہیں کہ نہ اعمال حسنہ سے ایمان میں ترقی اور قوت اور نور اور چمک اور رونق بڑھتی ہے اور نہ اعمال سیئہ سے کمزوری، کدورت، بے رونقی، میل کچیل ہی ایمان میں آتا ہے، جیسا تھا ویسا ہی رہتا ہے، امام بخاریؒ اس باطل مذہب کی تردید فرماتے آرہے ہیں۔

---

(١) قلت: الباء في قوله: بما كنتم ليست للسببية، بل للملابسة أي: أورثتموها ملابسة لأعمالكم، أي: لثواب أعمالكم، أو للمقابلة نحو: أعطيت الشاة بالدرهم. وقال الشيخ جمال الدين: المعنى الثامن للباء المقابلة، وهي الداخلة على الأعواض: كاشتريته بألف درهم، وقولهم: هذا بذاك، ومنه قوله تعالى {ادخلوا الجنة بما كنتم تعملون} (عمدة القاري: ١/١٨٤)

عمل ہی کے ایمان ہونے کی تفصیل

اب یہاں ترقی کر کے نہایت عجیب طریقے پر باب قائم فرما رہے ہیں، گویا انحصار فرما دیا کہ تعلق کے کیا معنی؟ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اعمال کا ہی نام ایمان ہے اور ایمان نام ہی اعمال کا ہے اور یہ ان کا فرمان از راہِ تعصب نہیں، چوں کہ امام بخاریؒ کی شان نہایت اعلی ہے، بہت بڑے مخلص ہیں، اس لیے ان کے متعلق ایسا گمان کرنے کی گنجائش نہیں؛ بلکہ گمان ان کی شان کے یہ مناسب ہے کہ حمیت دینی میں پرجوش ہو کر زوردار الفاظ کے ذریعہ احقاقِ حق میں فرما رہے ہیں، یہ میرا ذوق ہے، حدیث دانی کے لیے بڑے ذوق کی ضرورت ہے تو فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ایمان ہی عمل ہے، اور یہ بلا دلیل نہیں، یہ آیت سورۂ زخرف والی شاہد ہے اور یہ میں ہی نہیں کہہ رہا بلکہ اور علماء بھی میرے شریک ہیں بلکہ میں خود انھیں سے نقل کر رہا ہوں، فرماتے ہیں : یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو یا جس کے تم پہلے ہی وارث قرار دے دئے گئے تھے، اعمال کے عوض یا اعمال کے سبب کہ تم پہلے اعمال کرتے تھے، یہاں ذاتِ باری تعالی نے اس کا بدلہ عطاء فرما دیا اور یہ مقدمہ پہلے سے تسلیم ہے کہ بغیر ایمان کے خواہ اعمال ہوں، جنت میں دخول ممکن نہیں تو ایمان ہی کے سبب جو کہ وہ عمل قلب ہے، جنت کے وارث بنائے گئے، اس سے ثابت ہوا کہ آیت میں اعمال سے مراد ایمان ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ عمل کو نہایت خاص تعلق اور گہرا ربط ہے جس کی بناء پر آیت میں ایمان کو عمل فرمایا گیا تو اے مرجیہ و کرامیہ پھر تمھارا مذہب کہ اعمال کو ایمان سے کوئی ربط اور تعلق نہیں قرآن پاک کے خلاف اور محض باطل ہے۔

آیت کے ایک لفظ ”أُورِثْتُمُوهَا“ پر اشکال اور جوابات

اب آیت کے ظاہر سے ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ وارث بنائے جانا کیوں کر درست ہوا؟ میراث کے معنی تو یہ ہیں کہ کسی شخص کا انتقال ہوجائے، اس کے بعد اس کے املاک دوسرے کی طرف منتقل ہوجائیں، سو جنت کا تو پہلے کوئی شخص مالک نہیں تھا کہ اس کے مرنے کے بعد مؤمنین اس کے مالک بنائے گئے ہوں، اس کے مالک تو حق سبحانہ وتعالی ہی ہیں، وہاں یہ صورت میراث کی متحقق نہیں ہوتی، اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنت کو میراث فرمانا کس بناء پر ہوا؟۔

(۲) اس کے شراح نے متعدد جوابات دئے ہیں: علامہ عینیؒ نے یہ جواب دیا کہ تشبیہاً فرمادیا؛ اس لیے کہ جس طرح میت کے اموال کے ورثہ قابض ہوجاتے ہیں، اس کے حق دار ہوجاتے ہیں، پورے تصرف کے مالک ہیں، کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی، اسی طرح مؤمنین کو جنت عطا ہوگی کہ اس میں پورے تصرف کے حق دار ہوں گے، جہاں چاہیں گے، سیر کریں گے، جو چاہیں گے، کھائیں گے، کوئی روک ٹوک ان پر نہ ہوگی، سونا چاندی، ریشم کے زیور کے استعمال پر بھی مثل دنیا پابندی نہ ہوگی (۱)۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ مجازاً اعطاء کو وراثت دینا فرمادیا کہ جس طرح ملک مورث وارثِ مستحق کو مل جاتا ہے حق تعالی نے اپنی مملوکہ جنت

(۱) فإن قلت :الإيراث إبقاء المال بعد الموت لمن يستحقه، وحقيقته ممتنعة على الله تعالى، فما معنى الإيراث ههنا؟ قلت:هذا من باب التشبيه، قال الزمخشري : شبهت في بقائها على أهلها بالميراث الباقي على الورثة.(عمدة القاري: ۱۸۴/۱)

متقیوں کو عطا فرمادی (۱)۔

(۳) دراصل جنت و دوزخ میں ہر شخص کا ایک ایک ٹھکانا مقرر فرمادیا لیکن دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں: مؤمن و کافر، اور جہنم میں مؤمن داخل نہیں ہوسکتا اور جنت میں کافر نہیں جاسکتا، اس لیے جس شخص نے کفر اختیار کیا، اس کا وہ حصہ جنت سے کٹ گیا اور اس کے بہ جائے مؤمن کو دے دیا، اس لیے گویا اس کی چیز اس سبب سے اس سے لے کر مؤمن کو دے دی گئی، اس وجہ سے جنت مؤمن کو بہ طور میراث عطا ہوگئی (۲)۔

تو امام بخاریؒ گویا یوں فرمارہے ہیں کہ دیکھا! تفسیر آیت سے معلوم ہوا کہ اعمال کو ایمان کے ساتھ اقربیت ہی نہیں بلکہ علاقۂ جزئیت ہے۔

دوسری آیت سے اعمال کے جزوِ ایمان ہونے پر استدلال

وَقَالَ عِدَّةٌ مِنْ أَهْلِ العِلْمِ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى:{فَوَرَبِّك لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ} [الحجر:۹۳] عَنْ قَوْلِ :لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ۔

یہ دوسری آیت ہے، فرماتے ہیں کہ بہت سے اہل علم نے اس کی تفسیر لَا إِلَهَ إِلَّا اللہُ سے کی، یوں فرمایا کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللہُ کے بارے میں قیامت کے دن سوال کیا جائے گا، جب انھوں نے یہاں اعمال سے لاَ إِلَهَ إِلَّا اللہُ مراد لیا جو کہ ایمان ہے تو اگر ہم نے اعمال کو ایمان کا جزء قرار

(۱) ويقال :المورث هو الله تعالى ولكنه مجاز عن الإعطاء على سبيل التشبيه لهذا الإعطاء بالإيراث.(عمدة القاري: ۱/۱۸۴)

المورث هنا الكافر، وكان له نصيب منها ولكن كفره منعه فانتقل منه إلى المؤمنين، وهذا معنى الإيراث.(عمدة القاري: ۱/۱۸۴)

دیا تو کیا عجیب ہوا، ان حضرات نے تو اعمال کو عین ایمان فرمادیا، پس اے مرجیہ! تمہارا اعمال کو ایمان سے الگ اور بے تعلق ماننا بالکل غلط ہے۔

مفسرین تو اعمال کا اطلاق ایمان پر ہونا صحیح و درست مانتے ہیں، سو تمہارا یہ کہنا کہ ایمان کو عمل کی ضرورت نہیں، ہر گز صحیح نہیں، کیوں کہ لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جو تمام اعمال کا جامع ہے، وہی ایمان ہے۔ پس اعمال ضرور جزوِ ایمان ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس جملے کی تفسیر لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے کیوں کر درست ہوئی؟ سو جواب یہ ہے کہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کے ملک اور کسی کی مملکت و سلنطت میں رہتا ہے، اس پر ضروری ہوتا ہے کہ اس مملکت کے تمام قوانین و احکام تسلیم کرے اور اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کے تمام احکام و قوانین کی رعایت، ان کی پابندی کرے، ان سے باہر نہ جائے۔

اب بادشاہ کو حق ہے کہ کہے جب آپ نے ہم کو بادشاہ تسلیم کرلیا تو پھر یہ حریت اور آزادی کیوں؟ جس چیز سے ہم منع کریں، اس سے باز آؤ اور جس کا حکم کریں، اس کو کرو! اسی طرح پوری دنیا اللہ کی سلطنت ہے، یہاں از روئے عقل ہر انسان اس کے خالق اور مالک ہونے کو تسلیم کرتا ہے اور حالاً سب ہی اس کے قوانین اور احکام کی پابندی کی ذمہ داری رکھتے ہیں اور مؤمنین و مسلمین تو قالاً بھی اس ذمہ داری کو تسلیم کرتے ہیں اور لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ذریعہ اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمیں ہر موقع اور فعل پر جو چاہیں حکم کر سکتے ہیں اور جس طرح چاہیں روک ٹوک کر سکتے ہیں تو حق تعالی کو بہر حال پورا پورا حق ہے۔

پس قیامت کے دن پوچھ سکتے ہیں : نماز کیوں نہیں پڑھی؟ اس کے متعلق فلاں فلاں کوتاہیاں کیوں کیں؟ اور زکوٰۃ کیوں نہیں ادا کی؟ اور روزہ کیوں نہیں رکھا؟ اس کے فلاں فلاں حقوق کیوں ضائع کیے؟ اور حج کیوں ادا نہیں کیا؟ اور فلاں فلاں بندوں کے فلاں فلاں حقوق کیوں تلف کیے؟ اور اپنے اندر طمع اور حرص

اور تکبر، خودی اور خود پسندی بخل، غصہ، حسد اور کینہ کے مقتضاء پر کیوں عمل کیا ؟ فلاں فلاں اخلاق حمیدہ کے ذریعہ کیوں اپنے کو مزین نہیں کیا؟ اس طرح لاَ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا جامع اعمال ہونا سمجھ میں آ گیا اور تفسیر آیت مذکورہ سے اعمال کا جزوِ ایمان ہونا اور مرجیہ کا رد پوری طرح واضح ہو گیا۔

تیسری آیت سے اعمال کے جزوِ ایمان ہونے پر استدلال

تیسری آیت ''لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ العَامِلُونَ'': اسی جیسے عمل کریں عمل کرنے والے۔ اور یہ بات پہلے سے معلوم ہے کہ اعمال بدونِ ایمان کے کارآمد اور مفید نہیں، پس آیت کا حاصل اور معنی یہ ہوئے کہ '' فليؤمن المؤمنون وليستقيموا عليه بدوام العمل الظاهری والباطنی '' تو معلوم ہوا کہ ایمان عمل ہی ہے تو اے مرجیہ! تمھارا یہ کہنا کہ ایمان کو عمل کی کوئی ضرورت نہیں، محض لغو اور غلط ہے اور میرا اور دیگر اہل علم کا یہ کہنا کہ ایمان وہ عمل ہی ہے، بالکل حق اور صحیح ہے۔ یہ تین آیات ہیں جو تین ترجمۂ باب ہیں جو دعوی مع الدلیل ہیں۔

حدیث الباب سے اعمال کے جزوِ ایمان ہونے پر استدلال

اس کے بعد امام بخاریؒ حدیث لا رہے ہیں، جس میں ''أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ'' ؟ سے سوال اور ''إِيمَانٌ بِاللّٰهِ'' سے جواب ہے، اس سوال و جواب سے معلوم ہوا کہ عمل ایمان ہے اور ایمان عمل ہے، اس میں حج مبرور کا لفظ ارشاد فرمایا، پھر اور دوسرے اعمال کا ذکر ہے لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں، اتنی بات

اس سے بہر حال ثابت اور واضح ہوگئی کہ ایمان کا اطلاق عمل پر فرما کر ایمان کا عمل ہونا واضح فرما دیا گیا، پس ایمان کو عمل سے الگ اور عمل کو ایمان سے بے دخل ماننا باطل اور غلط ہو گیا۔

۲۵: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ، وَمُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، قَالاَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ: أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ؟ فَقَالَ: إِيمَانٌ بِاللهِ وَرَسُولِهِ. قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: الجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: حَجٌّ مَبْرُورٌ

جہاد کو حج پر مقدم کرنے کی وجوہات

حدیث باب میں ایمان باللہ کے بعد الجہاد پھر الحج المبرور فرمایا، اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہاد کو حج پر مقدم فرمادیا جس سے معلوم ہوا کہ حج سے جہاد افضل ہے، حالاں کہ حج فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ، نیز حدیث جبریل میں جہاد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۱) جواب یہ ہے کہ حج تو تمام عمر میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے، اس کے بعد جب بھی کیا جائے، نفل ہوگا۔ نیز حج سب پر فرض نہیں ہوتا پھر جن پر ہوتا ہے ان پر بھی ایک مرتبہ، برخلاف جہاد کے کہ ہر مرتبہ فرض ہی ہوتا ہے، اس لیے مقدم فرمایا گیا(۱)۔

(۲) اور بعض صورتوں میں (جہاد بہ مقابل حج) سب پر فرض ہوتا ہے۔

(۳) اس میں یہ خوبی ہے بہ وجہ فرض کفایہ ہونے کے کہ بعض کے ادا کرنے

---

(۱) ويقال: إن الجهاد قد يتعين كسائر فروض الكفاية، وإذا لم يتعين لم يقع الا فرض كفاية، وأما الحج فالواجب منه حجة واحدة، وما زاد نفل فإن قابلت واجب الحج بمتعين الجهاد، كان الجهاد أفضل لهذا الحديث. (عمدة القاري: ۱/۱۸۹)

سے سب بری اور بے گناہ ہو جاتے ہیں بخلاف حج کے اس میں یہ بات نہیں (۱)۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ حج میں تو صرف کچھ مال اور کچھ وقت ہی خرچ ہوتا ہے، موت بہ ظاہر اسبابِ ادائے حج میں نہیں تو جان وزندگی کی قربانی اس میں نہیں، برخلاف جہاد کے کہ وہ اغلب طریقے پر موت پر مشتمل ہے، جان وزندگی کی قربانی اس میں دینا ہوتی ہے کہ الحرب سجال ، بہ قول شخصے کہ سر پر کفن باندھ کر جانا، اپنا کفن ساتھ لیے جانا ہے تو پورے طریقے پر تمام قربانیوں کو لیے محض اللہ کی رضاء کے لیے نکل رہا ہے (۲)، اس واسطے جہاد کی بڑی اہمیت ہے اور اس کے بڑے فضائل ہیں، اس وقت ان کو بیان کرنا نہیں۔

(۵) پانچویں بات یہ کہ جہاد میں تمام مامورات کا احیاء اور بہ وجہ اتم علانیۃً تمام انسانوں سے جملہ اوامر کی پابندی کرانا ہے اور تمام منہیات ومعصیات کا سد باب کرنا ہوتا ہے کہ اس سے غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے کہ جس سے کفر کا زور گھٹ کر آئین وقوانین خداوندی سر بلند اور اور اونچے ہوں اور آئین وقوانین انسانی نیچے ہوں، اقوام عالم نے اس کوشش کی ہے کہ ان کے احکام وقوانین اونچے ہوں، حالاں کہ فطرتِ انسانی اور عقل صحیح کا تقاضا ہے کہ آئین وقوانین واحکام الٰہی اونچے اور بلند ہوں، ان کا نشر وشیوع ہو اور مخلوق کے قوانین واحکام ان سے نیچے اور پست ہوں اور یہ کام محض وعظ سے انجام نہیں پاسکتے، اس کے لیے جہاد کی ضرورت ہے جب جہاد ہوگا تب آئین خالق زبر اور آئین مخلوق زیر ہوں گے، ورنہ معاملہ برعکس رہے گا۔ وعظ سے یہ مقصد عظیم جو جہاد میں مضمر ہے، پورا نہیں ہوسکتا کہ

---

(۱) وقال إمام الحرمين في كتاب (الغياثى):فرض الكفاية عندي أفضل من فرض العين من حيث أن فعله مسقط للحرج عن الأمة بأسرها، وبتركه يعصى المتمكنون منه كلهم، ولا شك في عظم وقع ما هذه صفته.(عمدة القاري: ١/١٨٩)

(٢) وإنما جعله أفضل من غيره لأنه بذل النفس في سبيل الله تعالى.والجود بالنفس أقصى غاية الجود.(الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري: ١/١٢٦)

حضور اقدس ﷺ اخلاقاً واقوالاً اس انتہائی مقام پر تھے کہ دوسرے کسی بھی شخص کا وہاں پہنچنا ممکن نہیں، آپ ﷺ اپنی حکیمانہ تعلیمات، ترغیبات وترہیبات، مزاج شناسی اور موقع شناسی کے ساتھ مواعظ تیرہ سال تک فرماتے رہے، نیز آپ کے انفرادی، اجتماعی حالات از ولادت تا وفات ان کے سامنے تھے لیکن بہ ایں ہمہ مواعظ ان کے لیے کافی نہ ہوئے اور ایمان نہیں لائے، جب تبلیغ قولی ولسانی کافی نہیں تو سنانی ضروری ہوئی، جس کا نام جہاد ہے۔

بس جہاد میں وہ خصوصیت ہے، جو حج میں نہیں؛ اس لیے جہاد کو حج پر مقدم فرمایا(۱)، جہاد کے لیے نظام عمل بھی خاص ہے اور احکام بھی اس کے خاص نوع کے ہیں، اس کے کچھ شرائط ہیں، ان شرائط کا تحقق آسان نہیں، بخل کا شبہ نہ رہے، حرص سے کمیۃً پاک ہوجائے، صبر وتقوی پورا حاصل ہوجائے، چناں چہ آں حضرت ﷺ نے تیرہ سال تک اسی کی تکمیل فرمائی۔

سنانی تبلیغ لسانی تبلیغ سے زیادہ مؤثر اور کارآمد ہے

بہر حال تیرہ سالہ تبلیغ پر بھی ایمان والے کم رہے، اس سے معلوم ہوا کہ قولی تبلیغ کافی نہیں، قولی تبلیغ تو ان احکام کی تعلیم کے لیے ہے جن کے ذریعہ سے علم جہاد حاصل ہو کہ حرص وطمع سے پاک کرکے بےنفسی اور فنائیت پیدا کرکے جان کی قربانی کے لیے آمادگی حاصل ہوجائے، جب یہ پیدا ہوجائے تب جہاد کا حکم دیا جائے گا۔ تو جہاد کو وہ جامعیت حاصل ہے کہ تمام احکام پر زور جہاد ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اسی کے ذریعہ تمام احکام کے نفاذ کی قوت حاصل ہوتی ہے، اس کے بغیر قوتِ نفاذ نہیں ہوتی اور جب تک قوتِ نفاذ حاصل نہ ہو، نماز تک بھی

(۱) ولأنه شارك الحج في الفرضية، وزاد بكونه نفعا متعديا إلى سائر الأمة، وبكونه ذبا عن بيضة الإسلام. (عمدة القاري: ۱/۱۸۹)

نہیں پڑھوائی جاسکتی، جیسے کہ پڑھ چکے کہ ترکِ زکوٰۃ پر قتال کیا جائے گا، اسی طرح ترکِ صلوٰۃ و حج وغیرہ پر بھی مگر یہ حصولِ صولت و شوکت پر موقوف ہے، اس لیے کہ اگر تارکین کی طرف سے مقابلہ ہو تو دفع کی قوت ضروری ہے اور یہ امیر وخلیفہ و بادشاہِ وقت کے پاس ہے، کسی غیر کے پاس نہیں، پس وہی جہاد کا مکلف اور اس کے حکم کا مخاطب اور مامور ہے۔ اسی طرح ترکِ زکوٰۃ وغیرہ پر قتال کا حکم بھی اسی کے لیے ہے، غرض جہاد کی جامعیت اور اہمیت بہت زیادہ ہے جیسے مختصر طور پر اس کے وجوہ عرض کیے گئے کہ گویا ان ہی وجوہ کے باعث حج پر ذکراً حدیث میں تقدیم فرمائی گئی۔

حدیث سے مرجیہ کے خلاف طریقۂ استدلال

اور اس حدیث سے مقصد امام بخاریؒ کا معلوم ہو چکا کہ مرجیہ پر رد کرنا ہے، اس طریقہ پر کہ حدیث میں **أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ** کے جواب میں **إِيمَانٌ بِالله وَ رَسُولِهِ** کو فرمایا ہے تو معلوم ہو گیا کہ اعمال کا ایمان پر اطلاق آتا ہے جس سے غایت درجہ خاص تعلق اعمال کا ایمان کے ساتھ ظاہر ہے، حتیٰ کہ اتحاد اور عینیت کا، پس مرجیہ کا یہ کہنا کہ اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں اور اعمال کی کمی بیشی ایمان پر کچھ اثر انداز نہیں، بالکل غلط اور باطل ہونا واضح ہو گیا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

بَابُ إِذَا لَمْ يَكُنِ الإِسْلاَمُ عَلَى الحَقِيقَةِ، وَكَانَ عَلَى الاِسْتِسْلاَمِ أَوِ الخَوْفِ مِنَ القَتْلِ.

لِقَوْلِهِ تَعَالَى:قَالَتِ الأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا [الحجرات :١٤] فَإِذَا كَانَ عَلَى الحَقِيقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ:إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الإِسْلاَمُ [آل عمران :١٩] وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ[آل عمران :٨٥]

٢٦ :حَدَّثَنَا أَبُو اليَمَانِ قَالَ:أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ : أَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، عَنْ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَعْطَى رَهْطًا وَسَعْدٌ جَالِسٌ، فَتَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَجُلًا هُوَ أَعْجَبُهُمْ إِلَيَّ، فَقُلْتُ:يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا لَكَ عَنْ فُلاَنٍ فَوَاللَّهِ إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا، فَقَالَ:أَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُّ قَلِيلًا، ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ، فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي، فَقُلْتُ:مَا لَكَ عَنْ فُلاَنٍ؟ فَوَاللَّهِ إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا، فَقَالَ :أَوْ مُسْلِمًا. ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي، وَعَادَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ، ثُمَّ قَالَ:يَا سَعْدُ إِنِّي لَأُعْطِي الرَّجُلَ، وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ، خَشْيَةَ أَنْ يَكُبَّهُ اللَّهُ فِي النَّارِ وَرَوَاهُ يُونُسُ، وَصَالِحٌ، وَمَعْمَرٌ، وَابْنُ أَخِي الزُّهْرِيِّ، عَنِ الزُّهْرِيِّ.

(مذکورہ عبارت کا) تلفظ فرما کرتا ختمِ حدیث ترجمہ فرمایا، ’’أَو‘‘ کے متعلق فرمایا کہ دو قسم پر ہے : تنویع کے لیے یا بل کے معنی میں ہے’’ إِذَا لَمْ يَكُنِ الإِسْلاَمُ عَلَى الحَقِيقَةِ‘‘ کی جزا محذوف ہے :لم يكن مؤمناً(۱)۔

(١) والجزاء محذوف. والتقدير :باب إن لم يكن الإسلام على الحقيقة لا يعتد به، أو لا ينفعه، أو لا ينجيه، ونحو ذلك.(عمدة القاري: ١/١٩٠)

ایک تو مسلم ہوتا ہے جو مؤمن بھی ہوتا ہے اور ایک مسلم تو ہوتا ہے مگر مؤمن نہیں ہوتا، یہاں یہی مراد ہے۔

تکرارِ باب کا اشکال اور جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ امام بخاریؒ اسلام و ایمان کے متعلق تو پہلے بیان فرما چکے تھے پھر یہاں مکرر اسلام کا باب کیوں منعقد فرمایا؟۔

جواب یہ ہے کہ مرجیہ کے رد کے سلسلے میں ان کی طرف سے ایک سوال پیدا ہوتا تھا، وہ یہ ہے کہ آپ کی جتنی بحثیں اب تک گذری ہیں، وہ سب اسی پر مبنی ہیں کہ آپ اسلام و ایمان کو ایک مانتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ اسلام و ایمان دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، جیسا کہ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے: ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ [الحجرات: ۱۴] تو اختلاف ہمارا باقی ہے؛ لہٰذا ہم وہی کہتے ہیں کہ اعمال جن کا نام اسلام ہے، ان کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں، الگ چیز ہے۔

تو امام بخاریؒ نے دفع دخل مقدر کے طور پر یہ باب قائم فرمایا تو اس باب میں امام بخاریؒ گویا یوں فرماتے ہیں کہ اعمال اعمال میں فرق ہوتا ہے، جن اعمال کو تم ایمان سے بے دخل مانتے ہو، ہم بھی ان کو بے دخل مانتے ہیں اور جن اعمال کو ہم دخیل مانتے ہیں، ان کا ایمان میں دخیل ہونے کا تمھارے نزدیک بھی انکار نہ ہوگا۔

شرح اس کی یہ ہے کہ اسلام جو اعمال کا نام ہے، وہ دو قسم پر ہے ایک اسلام حقیقی ہے اور ایک اسلام رسمی اور محض لسانی ہے(۱)۔ جو اسلام حقیقی ہے، سو

---

(۱) قالوا: إن هذا الباب كأنه دفع دَخَلٍ مُقدَّر، وهو أنك ادّعيت أن الإسلام والإيمان واحدٌ، مع أن الآيات والأحاديث، تدل على تغايرهما، فأجاب أَن الإسلام على نحوين: الإسلام حقيقة أي شرعًا، وهو المعتبرُ، وهو عينُ الإيمان. والثاني: الإسلام لغةً وهو غيرَ معتبر في الشرع. وهذا الذي أريد في قوله تعالى: {وَلَكِن قُولُوٓاْ أَسۡلَمۡنَا} إلخ (فيض الباري: ۱/۱۴۸)

ظاہر و باطن دونوں سے اختیار کیا گیا ہو، اس کو ایمان سے گہرا تعلق ہے، ایسا اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے۔

رسمی اور غیر حقیقی اسلام کی تین صورتیں

اور جو اسلام بدونِ جز وقلب صرف ظاہراً ولساناً بہ طور دفع الوقتی اختیار کیا گیا ہو، اس اسلام کا— جو کہ استسلام ہے— ایمان سے کوئی علاقہ وتعلق نہیں، کیوں کہ ایک تو اسلام کا خلاف یہ ہے کہ اسلام کی طرف سے دل میں نفرت ہے اور زبان سے بھی انکار ہے، ایسا شخص کافر محض اور مطلق مشرک ہے۔

اور ایک اسلام کا خلاف ہے کہ ایک شخص پر تلوار لے چڑھے، کوئی صورت اس کے بچنے کی نہیں، اپنی موت کا اس کو یقین ہو گیا، اس مصیبت کو دیکھ کر اس نے محض زبان سے اقرار کرلیا اور دل میں اس سے انکار ونفرت باقی ہے، ایسے شخص کو منافق کہتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ دین دین سب برابر ہے، دین موسوی ہو یا دین عیسوی یا رام چندر کا ہو یا مہاراجی ہو، آج کے بعض مسلمان کہتے ہیں کہ گو میں محمدی ہوں مذہب میں مگر میرے نزدیک اور دوسرے دین بھی صحیح ہے۔ یہ دیگر غیر اسلام ادیان کا مقر ہے، منکر نہیں ان کو سچا جانتا ہے، یہ بھی کافر ہے، اب منافقین کے اور ایسے نام نہاد مسلمان کے صوری اعمال اسلامی وہ ہیں جن کو ایمان میں دخل اور تعلق نہیں، باب استفعال کی خاصیت مثل دیگر خاصیات کے یہ بھی ہے کہ زبردستی کسی چیز کو مان لینا اور اپنے ذمہ لے لینا ہے۔

منافق بیٹا وشاگرد ومرید

اسی طرح وہ طالب علم، وہ شاگرد، وہ بیٹا، وہ مرید جو استاد اور باپ اور شیخ کے

حکم پر ہوں ہاں کردے، زبان سے تسلیم کرے مگر دل میں کھٹاس ونفرت ہے، یہ طالب علم وشاگرد ومرید منافق ہے، اب اگر کوئی حکم بجا بھی لائیں، کسی حکم کی تعمیل کر بھی دیں تو یہ تابع داری نہیں ہوگی بلکہ کسی غرض وطمع ومطلب کے باعث ظاہری موافقت سے ہوگی جو ایک قسم کا خداع اور دھوکا ہے۔

سورۂ حجرات کی مذکورہ آیت کا شانِ نزول

تو گویا امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اے مرجیہ! تمھاری بات اس حد تک صحیح ہے کہ ظاہری اسلام والوں کے اعمال کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں، جیسا کہ بنی اسد کے متعلق حضرت حق سبحانہ ارشاد فرماتے ہیں، یہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قحط زدگی میں آپ سے مدد چاہ رہے ہیں مگر احسان جتلا کر کہ ہم سے آپ کو لڑنا نہیں پڑا، ہم خود اسلام لے آئے؛ اس لیے ہماری خاص مدد کرنا ضروری ہے تو حق تعالی نے اس آیت کو نازل فرمایا جس میں ان سے ایمان کی نفی فرمادی اور اسلام ثابت رکھا(۱)۔

آیت میں کلمۂ استدراک ''لٰکِنْ'' لانے کی حکمت

شراح حدیث ومفسرین فرماتے ہیں کہ نفئ ایمان کے بعد یہ استدراک کیوں فرمایا؟ یہ قابل غور ہے کہ استدراک کلام سابق سے پیدا شدہ وہم وشبہ کے ازالہ کو کہتے ہیں، سو یہاں کون سا شبہ ہوا تھا جس کا دفعیہ ''لٰکِنْ'' سے فرمارہے ہیں۔ سو جواب یہ ہے کہ جی رکھنے اور دل داری ودل جوئی کرنے کی خاطر فرمایا کہ تم کافر کی طرح نہیں ہو بلکہ جس جزم کے ساتھ تم نے دعوی کیا تھا، اس کی نفی ہے کہ ظاہری اعمال سے

---

(۱) نَزَلَتْ فِي أعراب من بنى أَسَدِ بْنِ خُزَيْمَةَ قَدِمُوا عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي سَنَةٍ جَدْبَةٍ وَأَظْهَرُوا الشَّهَادَتَيْنِ وَلَمْ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ فِي السِّرِّ إلخ. (تفسير القرطبى: ۳۴۸/۱۶)

حلاوتِ ایمان اور جزم ایمان کا اطمینان کیسے کرلیا۔ بقیہ بیان اس کا حدیث میں "أَوْ مُسْلِمًا" کے بیان کے وقت آئے گا، یہاں صرف استدراک پر کلام ہو رہا ہے کہ بالکلیہ نفی ایمان سمجھ لینے سے دل شکنی تھی، اس کا تدارک فرمایا اور دل جوئی فرمائی۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس موقع پر جو آیت پیش کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان بنی اسد کا اسلام نفاقی ہے جس کو استسلام کہتے ہیں یعنی حقیقۃً اسلام نہیں کہ وہی ایمان کے خلاف ہے اور ایسے اسلام کے ساتھ اعمال میں اور ایمان میں تلازم نہیں۔

اس کے جواب کے لیے گویا امام بخاریؒ ایک حدیث نقل فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک اسلام لغوی ہے اور ایک شرعی ہے، لغوی اسلام ہی کو استسلام کہتے ہیں اور اس میں اور ایمان میں تلازم نہیں، میں بھی اس کا قائل نہیں دوسرا اسلام جو شرعی ہے اور حقیقی واصلی ہے اس میں اور ایمان میں تلازم ہے، اسی اسلام کے تلازم للایمان کا میں قائل ہوں، اسی اسلام کو ایمان میں دخل ہے اور اسی کی کمی زیادتی، قوت وضعف سے ایمان میں زیادتی اور قوت وضعف ہوتا ہے، اس پر حدیث باب سند ودلیل ہے ایک صحابیؓ دوسرے صحابیؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں ان کو مؤمن اور پسندیدہ تر سمجھتا ہوں، وہ بہت کامل ہیں، حتی کہ انھیں کی دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جو غالباً مسلم شریف میں ہے کہ میں نے ان کے متعلق حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے میرے خیال کی تصدیق فرمائی، اس پر میں نے عرض کیا کہ پھر آپ نے ان کو کیوں چھوڑ دیا اور کیوں عطا سے محروم رکھا؟ تو آپ نے فرمایا: أَقِتَالًا؟ أَيْ سَعْدُ کہ میرے ساتھ جھگڑتے ہو؟(۱)۔

(۱) عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ أَبِيهِ سَعْدٍ، أَنَّهُ قَالَ: أَعْطَى رَسُولُ اللهِ ﷺ رَهْطًا وَأَنَا جَالِسٌ فِيهِمْ، بِمِثْلِ حَدِيثِ ابْنِ أَخِي ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عَمِّهِ، وَزَادَ، فَقُمْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَسَارَرْتُهُ، فَقُلْتُ: مَا لَكَ عَنْ ←

حدیث سے مستنبط بعض احکام وفوائد

شراح رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ: (۱) جس کے متعلق پختگی سے کوئی چیز جانتا ہو، اس کو نفس الامری سمجھتا ہو، بڑے کے سامنے بھی اس پر اس کو ظاہر کرسکتا ہے اور ہر قسم بھی کھا سکتا ہے(۱)۔

(۲) اگر ایک دفعہ کہہ دینے پر یہ خیال ہو کہ شاید ذہول ہو گیا ہو، اس کی طرف التفات نہ رہا ہو، پھر یاددہانی کرسکتا ہے، خیر خواہی اور مشورہ پیش کرسکتا ہے(۲)۔

(۳) نیز معلوم ہوا کہ مشورہ دے دینے کے بعد قبول ہو یا نہ ہو، اس کو اختیار رہتا ہے، مشیر کو ناگواری نہیں ہونا چاہیے(۳)۔

(۴) یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی مشورہ دے دے تو اس پر ناراضگی نہیں ہونا چاہیے(۴)۔

← فُلَانٍ؟ وَحَدَّثَنَا الْحَسَنُ الْحُلْوَانِيُّ، حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ، حَدَّثَنَا أَبِي، عَنْ صَالِحٍ، عَنْ إِسْمَاعِيلَ بْنِ مُحَمَّدٍ، قَالَ:سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ سَعْدٍ يُحَدِّثُ هَذَا، فَقَالَ فِي حَدِيثِهِ : فَضَرَبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِيَدِهِ بَيْنَ عُنُقِي وَكَتِفِي، ثُمَّ قَالَ:أَقِتَالًا؟ - أَيْ سَعْدُ - إِنِّي لَأُعْطِي الرَّجُل. (صحيح مسلنم، كِتَابُ الْإِيمَانِ،بَابُ تَأَلُّفِ قَلْبِ مَنْ يَخَافُ عَلَى إِيمَانِهِ لِضَعْفِهِ، وَالنَّهْيِ عَنِ الْقَطْعِ بِالْإِيمَانِ مِنْ غَيْرِ دَلِيلٍ قَاطِعٍ،رقم الحديث: ۱۵۰)

(۱) فيه دليل على جواز الحلف على الظن، وهي :يمين اللغو. (عمدة القاري: ۱/۱۹۵)

(۲) فيه مراجعة المشفوع إليه في الأمر الواحد إذا لم يؤد إلى مفسدة. (عمدة القاري: ۱/۱۹۵)

(۳) فيه أن المشفوع إليه لا عتب عليه اذا رد الشفاعة اذا كانت خلاف المصلحة. (عمدة القاري: ۱/۱۹۵)

(۴) فيه أن المفضول ينبه الفاضل على ما يراه مصلحة لينظر فيه الفاضل. (عمدة القاري: ۱/۱۹۵)

(۵) بڑا عدمِ قبولِ مشورہ کی مصلحت وحکمت بیان کردے، یہ بہتر ہے؛ تاکہ مشیر کی دل شکنی نہ ہو(۵)۔

(٦) جو چیز قابل گرفت ہو، اس پر گرفت کرنا چاہیے، جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمائی۔

(۷) چھوٹے کی بات اگر ادب سے گری ہو تو اسی مجلس میں تنبیہ کردینا جائز ہے۔ اگر چھوٹے کو بڑے کی تنبیہ پر ناگواری ہو، یہ تکبر ہے۔

آدابِ متعلم

دیکھیے اس حدیث سے کیسی عجیب باتیں معلوم ہوئیں، اس لیے سبق میں اہتمام سے حاضر ہونا چاہیے، نہ معلوم کس وقت کون سا علم عظیم بیان ہوجائے، ایک سبق بھی چھوٹ جانا بلائے عظیم ہے، یوں کتابیں اور شرحیں ہیں مگر خالی ان سے کام نہیں چلتا، (اس موقع پر حیاء وتکبر اور خجلت کا فرق بھی بیان فرمایا)۔

پس معلوم ہوا کہ بڑے کی ٹوک پر ناگواری ہو تو اب حکم کی تکمیل استسلام میں داخل ہوگی، نہ کہ اسلام اور حقیقی تابع داری میں، لکھا ہے اگر بڑے کی تنبیہ اور اظہار ناگواری پر چھوٹے کو غصہ آئے تو تکبر ہے۔ دیکھیے حضور اقدس ﷺ نے مجلس میں یہ الفاظ فرمائے کہ تم مشورہ دیتے ہو یا جھگڑا کرتے ہو؟ مصالح میں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ کس کے لیے کیا مناسب ہے اور کس کے لیے کیا۔

محکوم کو حاکم سے الجھنے کی اجازت کب ہے؟

یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ امیر مجلس کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ مشورہ کے بعد جو چاہے عمل کرے، اپنی صواب دید کا مکلف ہے، بہ رعایتِ حدودِ

---

(۱) (۵) فيه أنه ينبغي أن يعتذر إلى الشافع ويبين له عذره في ردها.(عمدة القاري: ۱/۱۹۵)

شرع جس کو اختیار کرے، اس پر کسی کو زبان کھولنے کا حق نہیں، اگر حدودِ شرع کی رعایت نہیں کی تو وہ جانے، خدا جانے، اس کا حساب کتاب اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوگا لیکن بہ وقتِ امارت تو اس کو اختیارات ہیں، اس سے معارضہ نہیں چاہیے، ہاں مضار ملک کھلے طور پر ہوں اور کھلم کھلا خلافِ شرع کا ارتکاب کیا جاوے تو اس کو معزول کر دینے کی سعی ہو، بشرطے کہ فساد، خون ریزیاں مظنون نہ ہوں، اگر اس کا اندیشہ ہو تو خاموشی اور سکوت ضروری ہے، حتی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی زمانہ میں اگر امیر نماز مکروہ وقت تک مؤخر کرنے لگیں تو مسجد کے کونہ میں بیٹھ کر انتظار کرو (۱) اور ایک حدیث میں فرمایا: "صَلُّوا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ" (۲)، اس لیے کہ اس کو زور قوت حاصل ہے، تم کو حاصل نہیں، تم پر اسے امیر تسلیم کرنے کے بعد اس کی اطاعت ہے مخالفت کا اختیار نہیں۔

امیر کو اپنی صواب دید کے مطابق اموال خرچ کرنے کا حق ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امیر کو بیت المال کے علاوہ ایسا مال رکھنا درست ہے جو وظائف اور پلوں اور سڑکوں اور اخراجاتِ فوج کے مدات سے وابستہ ہوں، آمدنی کے اور اخراجات کے سب کے الگ الگ مدات ہیں، اس رقم سے

---

(۱) إِنَّهُ سَتَكُونُ أُمَرَاءُ بَعْدِي، يُصَلُّونَ الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا، وَيُؤَخِّرُونَ عَنْ وَقْتِهَا، فَصَلُّوهَا مَعَهُمْ، فَإِنْ صَلُّوهَا لِوَقْتِهَا وَصَلَّيْتُمُوهَا مَعَهُمْ فَلَكُمْ وَلَهُمْ، وَإِنْ أَخَّرُوهَا عَنْ وَقْتِهَا فَصَلَّيْتُمُوهَا مَعَهُمْ فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ. الحديث (مصنف عبدالرزاق: ۲/۳۷۹، بَابُ الْأُمَرَاءِ يُؤَخِّرُونَ الصَّلَاةَ، رقم الحديث: ۳۷۷۹)

(۲) سنن الدارقطني، كِتَابُ الْعِيدَيْنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه، بَابُ صِفَةِ مَنْ تَجُوزُ الصَّلَاةُ مَعَهُ وَالصَّلَاةُ عَلَيْهِ، رقم الحديث: ۱۷۶۸.

جس کو چاہے دیں، اس پر اعتراض کا حق نہیں، ممکن ہے کہ دوسرے کی نظر میں وہ مستحق ہو مگر امیر کی نظر میں وہ مستحق نہیں، دیکھیے باوجود بار بار کہنے کے بھی آپ ﷺ نے ان کو نہیں دیا جس کے متعلق سفارش کی گئی، امیر کو حق ہے کہ وہ جس کو مناسب خیال کرے، عمل کرے(۱)۔

مہتممینِ مدارس کے ان کے صوابدید کے مطابق کیے گئے فیصلوں پر چوں وچرا کا کسی کو حق نہیں ہے

اسی طرح جس کام کا کسی کو پورا ذمہ دار بنا دیا گیا، وہ اس کا امیر ہے، تعلیمی اداروں کے امیر ان اداروں کے مہتمین ہیں، پس اپنی رائے کے اور اپنی صواب دید اور علم کے خلاف کسی کام کو دیکھ کر اعتراض کرنے کا نہ کسی طالب علم کو حق ہے، نہ مدرس کو، وہ اپنے علم وفہم وذوق کے اعتبار سے مکلف ہے، دوسروں کے فہم وذوق ورائے کی اتباع اس پر لازم نہیں، پس جس کو بہتر خیال کرے، جو لائق سمجھے کرے، ہاں اگر وہ اپنے علم سے ایک شئے کو حق سمجھ کر اس سے پہلوتہی کرے، اس کی رعایت نہ کرے، یہ اندرونی چیز ہے، دوسرے کو اس کا علم نہیں ہوسکتا۔ پس معاملہ خدا کے حوالے ہے، خدا تعالیٰ کے یہاں اس سے باز پرس ہوگی۔

بچوں کو دینے میں مساوات ضروری ہے

چنانچہ بعض دفعہ کسی طالب علم یا غیر کو میں کچھ دیتا ہوں تو گھر میں کہتی ہیں

(۱) فيه أن الإمام يصرف الأموال في مصالح المسلمين الأهم فالأهم.(عمدة القاري :۱/۱۹۵)

کہ رفعت جہاں کو نہیں دیا، بس اس بچہ کو دے دیا، میں کہتا ہوں: تمھیں خبر نہیں، یہ میری تربیت میں ہیں، ان کو دوں تو دوسری اولاد کو بھی دینا ضروری ہوگا کہ مساوات ضروری ہے،(ہاں بڑی بچی کا میرے اوپر نفقہ نہیں، اس کو دینا اس موقعہ ضروری نہیں، مساوات میں وہ داخل نہیں، صرف زیر تربیت افراد میں مساوات ہے)اور سب کو دینے کی گنجائش نہیں۔

یہ مسئلہ ہے کہ ایک بچہ کو جو چیز دیں، دوسرے کو بھی دیں، جس قیمت کی ایک کو دی، اس قیمت کی اوروں کو بھی دیں، یہ ہے شریعت، یہی نہیں کہ بس نماز پڑھ لی، نماز پڑھ لی تو بڑا تیر مار دیا، مردانگی کی بات اور دین داری یہ ہے کہ حقوق میں خلل نہ آئے۔

حضرت تھانویؒ: دوسرا نکاح کر کے میں نے اوروں کے لیے نکاحِ ثانی کا دروازہ بند کر دیا

اس پر حضرت تھانویؒ کا واقعۂ مساوات یاد آیا (ایک صاحب طالب نکاحِ ثانی آئے، حضرت نے بہت سی باتیں فرمائیں، اپنے ثانی نکاح کا بھی معاملہ سامنے رکھا) کہ بڑی پیرانی صاحبہ نے (حالاں کہ خود ہی کہہ کر دوسرا نکاح کرایا تھا کہ اولاد نہ ہوئی تھی) حضرت سے عرض کیا کہ آپ نے دوسرا نکاح کر کے اپنے مریدوں کے لیے دوسرے نکاح کا دروازہ کھول دیا، حضرت نے فرمایا کہ کھولا نہیں بلکہ بند کر دیا، انھوں نے کہا : یہ کیسے؟ فرمایا: اس لیے کہ جیسی مساوات میں کرتا ہوں، دوسرا ایسی نہیں کرسکتا، جب دیکھیں گے کہ یہ تو بہت بھاری اور بڑی مشکل بات ہے تو گھبرا جائیں گے، دوسرے نکاح کا نام بھی نہ لیں گے۔

حضرت تھانویؒ کا اپنی دو بیویوں کے درمیان حد درجہ عدل وانصاف

تمھیں معلوم ہے کہ میرے یہاں ترازو اور کانٹا رکھا رہتا ہے، حتی کہ اگر دو تربوز ہم وزن آئیں تو دونوں کو آدھا آدھا کاٹ کر دونوں گھر دو دو ٹکرے بھیجتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک پکا یا میٹھا زیادہ ہو، دوسرا ویسا نہ ہو، دن میں کسی ایک بیوی کے پاس جاتا ہوں تو دوسری کے پاس بھی جاتا ہوں اور گھڑی دیکھ کر بیٹھتا ہوں، جتنے منٹ ایک کے پاس، اتنے ہی دوسری کے پاس رہتا ہوں، یہ ہے عدل وانصاف؛ یوں پڑھنے کو سب پڑھ لیا کرتے ہیں، حتی کہ مجلس میں فرمایا کہ مباشرت کے وقت دوسری کا تصور بھی نہیں آنے دیتا، حالاں کہ ایک جوان تھی، دوسری بوڑھی، حظ کے لیے تصور کا امکان تھا، اس سے بھی بچنے کا اہتمام فرمایا۔

یہ باتیں حضرتؒ نے مجلس میں کیوں سنائی تھیں؟ اصلاح وتربیت ہی کے لیے سنائی تھیں، تو میں نے فوائد حدیث عرض کیے، وہ خود ساختہ نہیں بلکہ شراحِ حدیث کے بیان کردہ ہیں۔

حضرت سعدؓ کو تنبیہ کرنے کی اصل وجہ

بات صدر مجلس پر چلی گئی تھی کہ جو نامناسب بات خیال کی جاتی ہے، اس پر ٹوک دینا اور تنبیہ کر دینا چاہیے، نیز مشورہ کے بعد صدر مجلس وامیر کا اختیار ہوتا ہے تو وہ نامناسب بات یہ تھی کہ حضرت سعدؓ ایک صحابیؓ کے متعلق مؤمن کا لفظ فرما رہے تھے، حضور اقدس ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور احتیاط فی الکلام کی

طرف متوجہ فرمایا کہ جہاں تک علم ہو، اتنی بات کہنا چاہیے سو بات یہاں اسلام کے حصول کی ہے کہ ظاہری چیز پر ہے، دوسروں کو اس کا آسانی سے علم ہوجاتا ہے ۔رہا ایمان سو وہ باطنی چیز ہے ۔ جزوِقلب سے متعلق ہے کہ ایسا خبری کلام ایمانِ کامل ہونا بتلا رہا ہے، سو وہ حلاوت ایمان پر موقوف ہے جس کا علم صاحب معاملہ ہی کو ہوتا ہے، دوسرا اس پر مطلع نہیں ہوسکتا تو قطعیت کے ساتھ اس کے متعلق حکم بھی نہیں لگانا چاہیے، اس پر ان کو تنبیہ فرمائی (۱)۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے ایک بچے کی وفات پر ’’طُوبَى لِهَذَا عُصْفُورٌ مِنْ عَصَافِيرِ الْجَنَّةِ ‘‘ کے الفاظ فرمائے اس پر بھی حضرت ﷺ نے تنبیہ فرمائی اور منع فرمایا کہ تم کو کیسے معلوم؟ ایسے یقینی طریق سے کہتی ہو (۲)۔

اسی طرح ایک عورت نے ایک شخص کے انتقال پر یہ کہہ دیا کہ یہ جنتی ہے ،ان کو بھی تنبیہ فرمائی کہ تم کو یقینی طریق سے کیوں کر معلوم ہوا جو اس یقینی طریقہ سے کہہ رہی ہو؟۔

حضور ﷺ نے مشفوع صحابی کو نہ دینے کا سبب بھی بیان فرمایا

تو آپ یہاں حضرت سعد رضی اللہ تعالی عنہ کو فرماتے ہیں کہ میں نبی ہو کر بھی

---

(۱) وإنما منعه إصلاحًا له وتنبيهًا على أنه لا ينبغي المبادرة في مثل تلك الأمور الباطنة التي قد تخفى على الأنبياء عليهم الصَّلاة والسَّلام أيضًا، سيما بحضرة صاحب الوحي إلخ. (فيض الباری: ۱/۱۸۷)

(۱) صحيح مسلم، عن عائشة أم المؤمنين رضى الله تعالى عنها، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة وحكم موت أطفال الكفار وأطفال المسلمين، رقم الحديث :۲٦٦۲.

جزماً نہیں کہتا، پھر امتی ہو کر کیوں کر کہتے ہو؟ تمھیں اس کا کیوں کر حق ہوا؟ پھر میری مجلس میں پیش قدمی انتظار چاہیے تھا، اس تنبیہ فرمانے کے بعد دل جوئی اور تسلی کے لیے وجہ بھی بیان فرمادی کہ میری ان کو نہ دینے کی یہ وجہ نہیں کہ میں انھیں مؤمن نہیں سمجھتا بلکہ میں ان کو مؤمن جانتا ہوں لیکن وہ قدیم الاسلام ہیں، نہ دینے پر بھی وہ اسلام سے پھریں گے نہیں اور جن کو میں دے رہا ہوں، یہ جدید الاسلام ہیں، ان کے متعلق خطرہ وخوف ہے ارتداد کا تو ان کو تالیف قلب کے لیے دے رہا ہوں، ایک شدید مضرت سے بچانا بھی پیش نظر ہے کہ ارتداد بہت سخت جرم ہے، یہ کفر سے بھی زیادہ سخت ہے۔

طریق شاگرد و مرید سے مرتد

اس لیے کسی کا شاگرد اور مرید یا تو بنے نہیں یا پھر تابع داری اور پورے وفاداری اور کمالِ ادب بجالائے، چوں کہ شاگرد اور مرید بن کر استاذ یا شیخ کے خلاف ناگفتہ بہ حرکتیں اور نازیبا اقوال وافعال یہ ارتداد ہے، وہ اسلام شرعی سے مرتد اور یہ طریقِ مرید وشاگرد سے مرتد ہیں۔

ہاں پیر ہی کسی کو بدعتی مل گیا ہو، وہ الگ بات ہے کہ نہ نماز پڑھتا ہے، نہ دیگر امورِ شرعیہ ضروریہ کی پابندی اور رعایت کرتا ہے یا قوالی سنتا ہو یا ڈھولک وغیرہ، ایسے پیر کو چھوڑ دے: (لیکن بے ادبی اور گستاخی اس کی بھی درست نہیں) کہ اس وقت یہ ضروری ہے، ورنہ گمراہی کا خطرہ ہے۔

ارتداد ابتدائی کفر سے بھی زیادہ سخت جرم ہے

تو ارتداد بعد الایمان بہت سخت ہے، آپ نے پڑھا ہے کہ کافر کی یک

بہ یک گردن مارنے کا حکم نہیں بلکہ پہلے دعوتِ اسلام پیش کی جائے گی، قبول کرے فبہا، ورنہ ماتحتی اختیار کرے کہ جزیہ دینا قبول کرے، اس سے بھی انکار کرے، تب جہاد کیا جائے گا، بہر حال کافر کو موقعہ اور مہلت دی جاتی ہے لیکن مرتد کی فوراً گردن مار دینے کا حکم ہے۔ اس کی سزا دنیا میں فوری ہے، ہاتھ سے ہی نکل جائے تو بات دیگر ہے۔ اسی طرح اس کی سزا آخرت میں بھی کافر سے زیادہ سخت ہے، حتی کہ ایمان کے قریب اگر دین اسلام اختیار کرنے کے بعد ایمان سے الگ رہے تو اس کی بھی سزا بہت سخت ہے، کافر سے بھی زیادہ اس کا عذاب ہے۔ چناں چہ قرآنِ پاک میں اول مؤمنین کا ذکر ہوا پھر کافرین کا پھر آگے مذمت منافقین کا دور تک ذکر چلا گیا(۱)۔

آج کل نفاق بہت ہے، اللہ تعالی کے ساتھ بھی اپنے بڑوں کے ساتھ بھی، یہ گو عملی نفاق ہے مگر سخت مذموم ہے، یہ حدیث سے متعلق کلام تھا۔

باب کو کتاب الایمان کے ساتھ مناسبت

مقصد امام بخاریؒ کا وہی رد مرجیہ ہے، یہاں آیات و احادیث سے ثابت کر دیا کہ اسلام ایک شرعی ہے، ایک غیر شرعی، اور شرعی اسلام و ایمان کے درمیان

(۱) غالباً اس سے اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی اوائل آیات کی طرف کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ سے ﴿أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵﴾ تک چار آیتوں میں مؤمنین کا ذکر اور ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾ تک دو آیتوں میں کافروں کا ذکر ہے اور ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ سے ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ﴾ تک ۱۳/آیات میں منافقین کا ذکر ہے، ابن جریجؒ نے امام مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے: نَزَلَتْ أَرْبَعُ آيَاتٍ مِنْ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي الْمُؤْمِنِينَ، وَاثْنَتَانِ فِي نَعْتِ الْكَافِرِينَ، وَثَلَاثَ عَشْرَةَ فِي الْمُنَافِقِينَ. (تفسیر القرطبی: ۱/۱۹۲، فی ابتداء تفسیر هذه الآیات)

تلازم ہے اور یہ اسلام ایمان میں دخل رکھتا ہے، اس طرح کہ اسلام کی کمی بیشی سے ایمان میں ضعف ونقصان آتا ہے اور اسلام کی مضبوطی اور قوت سے ایمان قوی اور مضبوط ہوتا ہے اور جس اسلام کو ایمان سے تعلق نہیں، وہ اصل اسلام ہی نہیں، محض اسمی ورسمی چیز ہے جو حقیقت اسلام سے عاری ہے، ایسے اسلام کو ایمان سے کیا تعلق، کیا واسطہ کہ یہ اسلام ہی نہیں، اسی کو استسلام کہتے ہیں جو ایمان کے مباین ہے۔ تو اسلام وایمان کے تلازم سے شدت وضعف ایمان اور اس سے ترکیب ایمان لازم آ کر کتاب الایمان سے مناسبت وموافقت ثابت ہوگئی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس الثامن والثلاثون

بَابٌ :إِفْشَاءُ السَّلاَمِ مِنَ الإِسْلاَمِ

وقَالَ عَمّارٌ:ثَلاَثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الإِيمَانَ:الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ وَبَذْلُ السَّلاَمِ لِلْعَالَمِ, وَالإِنْفَاقُ مِنَ الإِقْتَارِ "

۲۷ :حَدَّثَنَاقُتَيْبَةُ قَالَ:حَدَّثَنَااللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ عَنْ أَبِي الخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:أَيُّ الإِسْلاَمِ خَيْرٌ؟ قَالَ:تُطْعِمُ الطَّعَامَ, وَتَقْرَأُ السَّلاَمَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ.

تکرارِحدیث کااشکال اوراس کاجواب

یہ باب ہے نہایت عمدہ، ہرباب پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک سے ایک اعلی ہے، جس حدیث کو یہاں لایا گیا ہے، یہ حدیث پہلے بھی آچکی ہے، پھر یہاں اس کو کیوں لائے ؟اس تکرار کی وجہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے اساتذہ متعدد ہیں؛ یہ حدیث ان کو مختلف طرق سے پہنچی اور بعض اساتذہ نے ایک حدیث کسی چیز کے بارے میں سنائی اور بعض نے وہی حدیث دوسری چیز کے بارے میں سنائی تو جس استاذ سے جو حدیث جس امر کے بارے میں سنی، اس حدیث پر وہی باب قائم فرمادیا، دوسرے استاذ سے وہی حدیث دوسرے امر کے متعلق سنی تو ان کی بھی رعایت فرمائی اور وہ عنوان قائم فرما کر وہاں پھر اس حدیث کو لائے ، وہ سب اساتذہ کا حق عظمت قائم رکھتے ہیں،توترتیب ابواب میں یہ امر مذکورملحوظ اورمرعی ہے۔

میں نے جو ورق پلٹا کہ یہ حدیث پہلے کس سلسلے میں لائے اور وہاں میں اور یہاں میں کیا فرق ہوگیا تو دیکھا کہ اس کے تمام راوی متحد ہیں، وہاں اور یہاں سب ایک ہیں مگر اول جس جگہ کو لائے ، وہاں راوی اول عمر ہیں اور یہاں اول راوی استاذِ

امام بخاریؒ قتیبہؒ ہیں، وہاں یعنی پہلے استاذ سے یہ حدیث اطعام طعام کے بارے میں سنی اس لیے اطعام طعام کا باب قائم فرمادیا اور ان استاذ قتیبہ سے دوسرے مضمون افشائے سلام پر سنی، اس لیے یہاں یہ باب قائم کردیا تو دونوں اساتذہ کی رعایت اور حق عظمت کی رعایت رکھی ہمارے تمہارے طرح نہیں کہ کسی استاذ کو فوق السماء کردیا اور دوسرے کو تحت الثری پہنچا دیا، ایک کا ادب کیا تو حد سے آگے بڑھ گئے، دوسرے کا بالکل ادب نہیں کیا، ان کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی سے پیش آئے پس حیثیات مختلفہ کے اعتبار سے ایک حدیث متعدد جگہ لے آئے تکرار بے فائدہ نہیں رہا(۱)۔

(۱) علامہ کرمانیؒ نے یہی جواب دیا ہے، فرماتے ہیں: فإن قلت الحديث بعينه هو المتقدم فلم ذكره مكرراً. قلت ذكره ثمة للاستدلال على أن الإطعام من الإسلام وههنا للاستدلال على أن السلام منه. فإن قلت كان يكفيه أن يقول ثمة أو ههنا باب الإطعام والسلام من الإسلام بأن يدخلهما في سلك واحد ويتم المطلوب. قلت لعل عمرو بن خالد ذكره في معرض بيان أن الإطعام منه وقتيبة في بيان أن السلام منه فلذلك ميزهما مضيفاً إلى كل راو ماقصده في روايته والله أعلم.(الكواكب الدراري: ۱/۱۳۴) لیکن حافظؒ نے اس پر اشکال کیا ہے، فرماتے ہیں: وهذا ليس بطائل لأنه متوقف على ثبوت وجود تصنيف مبوب لكل من شيخيه والأصل عدمه ولأن من اعتنى بترجمة كل من قتيبة وعمرو بن خالد لم يذكر أن لواحد منهما تصنيفا على الأبواب ولأنه لزم منه أن البخاري يقلد في التراجم والمعروف الشائع عنه أنه هو الذي يستنبط الأحكام في الأحاديث ويترجم لها ويتفنن في ذلك بما لا يدركه فيه غيره ولأنه يبقى السؤال بحاله إذ لا يمتنع معه أن يجمعهما المصنف ولو كان سمعهما مفترقين. اس کے بعد انھوں نے یہ توجیہ پیش کی ہے: والظاهر من صنيع البخاري أنه يقصد تعديد شعب الإيمان كما قدمناه فخص كل شعبة بباب تنويها بذكرها وقصد التنويه يحتاج إلى التأكيد فلذلك غاير بين الترجمتين.(فتح الباری: ۱/۸۲) لیکن علامہ عینیؒ نے حافظؒ کے اس اشکال کو غلط بتایا ہے، فرماتے ہیں: وقال بعضهم: هذا ليس بطائل، لأنه يبقى السؤال بحاله إذ لا يمتنع معه أن يجمعهما المصنف، ولو كان سمعهما مفترقين. قلت: هذا الذي قاله ليس بطائل، وهو جواب حسن، ويندفع السؤال به، ولو كان المصنف جمعهما لكان تغييرا لما أفرده كل واحد من شيخيه، ولم يرد تغيير ذلك، فلذلك ميزهما بالبابين. (عمدة القاري: ۱/۱۹۹)

تکرارِ حدیث کا اشکال ایک اور جہت سے

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ماسبق سے کیا ربط ہے؟ (اگرچہ اب یہ میرا طریق درس چھوٹ گیا) نیز سوال ہوتا ہے کہ ضرورت کیا پڑی تھی؟ آخر اس حدیث کو دوبارہ یہاں کیوں لائے؟ اگر چہ دوبارہ باب بہ عنوانِ دیگر باندھا، پھر اگرچہ حیثیات بدل جانے سے تکرار نہیں رہا۔

بخاری شریف وعظ کی کتاب ہے

سو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ پڑھ چکے، باب سابق میں اسلام کی دو قسمیں بیان ہوئی تھیں: ایک حقیقی اسلام اور اسی کو اسلام کہتے ہیں، دوسرا محض اسمی اور رسمی جس کا نام استسلام ہے، اس طورِ بیان سے مرجیہ پر رد کرتے ہوئے چل رہے تھے کہ بیچ میں دیگر باتیں، دیگر ابواب معرضِ بیان میں آ گئے، جیسے کہ وعظ میں کسی بات کو بیان کرتے کرتے اسی سلسلے میں کچھ ذیلی وضمنی طور پر باتیں آ جاتی ہیں اور پھر اصل مقصد اور مدعیٰ کی طرف لوٹتے ہیں کہ میں یوں کہہ رہا تھا اور یہ بات اس پر چل گئی تھی، تو بخاری شریف بھی دراصل وعظ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، احادیث حقیقت میں وعظ ہیں کہ ان میں اصلاحِ انفس مقصود ہے، اب ان کا پڑھنا اور پڑھانا محض درسی اور فنی رہ گیا کہ فلاں کتاب میں یوں ہے، فلاں حاشیے پر اس طرح ہے، یہ ٹھیک ہے مگر اسی پر قناعت اور اکتفاء ہو جائے اور ذہن اسی پر مقصور ہو جائے اور کلامِ رسول کو وعظ ونصیحت نہ بنایا جائے، یہ سخت غلطی ہے۔

مذکورہ اشکال کا جواب

جب یہ بات ہے تو گویا امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہاں بات اس پر چل رہی

تھی کہ ایمان مرکب ہے اور اعمال کو ایمان میں دخل ہے، اسی پر بہ طورِ دفع دخل مقدر کے دوسرے ابواب آگئے تھے، اب پھر رجوع کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "إِفْشَاءُ السَّلاَمِ مِنَ الإِسْلاَمِ" یعنی عمل سلام بھی اسلام میں سے ہے، اس کو بھی اسلام اور ایمان میں دخل ہے اور گویا یوں فرماتے ہیں کہ بچو! ایک بات اور سن لو، میں نے دفع دخل مقدر کے طور پر اسلام کی دو قسمیں بتلائی تھیں: ایک حقیقی اور اسمی، اب سن لو! اسلام حقیقی کی علامات بتلاتا ہوں، ان سے پہچان لو کہ تمہارے اندر حقیقی اسلام ہے یا نہیں، اگر یہ علامتیں نہیں ہیں تو سمجھ لینا محض استسلام ہے اور جس درجہ کی یہ چیزیں ہوں گی، ویسا ہی اسی درجہ اسلام ہوگا، انطباق کرلو۔ یہ غفلت کیسی؟ پڑھنا اور علم تو اپنے کو جانچنے اور پرکھنے کا نام ہے، پس اپنے اسلام کو جانچو اور پرکھو کہ یہ تمہارا اسلام رسمی اور محض اسمی ہے یا اصلی ہے، اگر یہ فلاں فلاں باتیں تمہارے اندر نہیں تو تمھارا اسلام محض رسمی اور اسمی ہے خود غور کرلو(۱)۔

وقَالَ عَمَّارٌ: "ثَلاَثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الإِيمَانَ: الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ، وَبَذْلُ السَّلاَمِ لِلْعَالَمِ، وَالإِنْفَاقُ مِنَ الإِقْتَارِ": یہ حضرت عمار رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے والد اور ان کی والدہ تینوں بڑے پکے مسلم اور بڑے عابد تھے، انھوں نے اسلام لانے پر کفار کی بڑی اذیتیں اور ماریں کھائیں، آپ ﷺ جب ان کے پاس سے گذرتے تھے تو بڑی تعریف فرماتے تھے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور تسلی و دل جوئی سے پیش آتے تھے، انھوں نے دو ہجرتیں کیں بڑے پایے کے صحابہؓ میں سے ہیں۔ یہ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں ہیں، جس نے ان کو جمع کرلیا، اس نے ایمان جمع کرلیا، وہ تین چیزیہ ہیں: پہلی چیز اپنے نفس سے انصاف۔

(۱) تکرارِ حدیث کا یہ جواب ویسا ہی ہے، جیسا کہ حافظؒ کے حوالے میں سے ماقبل میں حاشیے کے اندر گذرا، فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں حضرتؒ نے علامت کا لفظ استعمال کیا ہے اور حافظؒ نے شُعب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمارؓ کے قول
اور کتاب الایمان میں مناسبت

ترجمہ باب پر خیال فرمائیے کہ من الاسلام کہا تھا، حدیث الباب میں من الایمان ہے، اس ترتیب سے امام بخاریؒ نے بتلادیا کہ اسلام وایمان دونوں ایک چیز ہیں، چوں کہ یہ تین چیزیں باوجودے کہ تصدیق میں سے نہیں، پھر بھی حضرت عمارؓ ان تین کے حصول کو حصول ایمان فرمارہے ہیں کہ ان تین چیزوں کو حاصل کرلیا تو ایمان پورا اور بھرپور کرلیا، مؤمن میں بڑی باتیں ہیں (کیا عرض کیا جائے، کاش طبیعت کھلی ہوتی!) اجمالاً ومختصراً ایمان کامل ان تین کا پایا جانا ہے۔

وَالإِنْفَاقُ مِنَ الإِقْتَارِ: حسب شراحِ حدیث مِنْ یہاں فی کے معنی میں ہے، جیسے سورہ جمعہ میں یہ حدیث پہلے گذرچکی ہے، وہاں پوری تقریر بھی کی جاچکی ہے(۱)۔

”الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ“
نہایت ہی جامع کلام ہے

”**الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ**“ سے کیا مراد ہے؟ حافظ ابن حجرؒ وغیرہ شراحِ حدیث فرماتے ہیں کہ اس میں پورا اسلام وایمان آچکا، کوئی چیز باقی نہ رہی؛ اس لیے کہ حق کی تین قسمیں ہیں: (۱) متعلق بخود (۲) متعلق

(۱) قلت: كلمة: من، ههنا يجوز أن تكون بمعنى: في، كما في قوله تعالى: ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ (الجمعة: ۹) أي: فيه، والمعنى: والانفاق في حالة الفقر، وهو من غاية الكرم. (عمدة القاري: ۱/۱۹۸)

بخالق (۳) متعلق بخلق، جوتینوں حقوق کی حفاظت ورعایت کرتا ہے، وہ تینوں خوبیوں کا جامع ہے اور ایسے شخص کے کامل الایمان اور پورا مسلمان ومطیع ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے(۱)؟۔

اپنی ذات میں صفت انصاف پیدا کرنے کا طریقہ

اس صفت انصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی صورت اوراس کا طریق یہ ہے کہ غور کرتا رہے اور سوچتا اور جائزہ لیتا رہے، اپنے نفس سے محاسبہ کرتا رہے کہ خالق برتر نے تیرے لیے فلاں فلاں بے شمار چیزیں پیدا فرمائیں اور دیکھ! تیری ضروریات کے یہ کس قدر سامان مہیا فرمادئے ہیں؟ اپنی ذلت اور افتقار واحتیاج اور عاجزی وبے چارگی پر نظر کر، ایسی حالت میں ان گوناں گوں احسانات وانعامات واکرامات سے نوازا اور تربیت کس عظیم لطف وکرم سے فرمائی؟ نیز اپنی معدومیت اور پھر مخلوقیت کو دیکھ! یہ دولت وجود ہی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، تجھ سے تو اسی کا شکرادا ہونا مشکل ہے، پھر اس پر دوسری بے شمار نعمتیں مزید برآں، پھر شکر تو کجا؟ ناشکری، ناقدری واحسان فراموشی میں مبتلا ہے تجھے شرم آنی چاہیے، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو نے خالق کے خلاف یہ حرکت کی اور فلاں وقت یہ فعل کیا۔ کیا یہی انصاف ہے؟ کیا تیری غیرت اور شرافت کا یہی تقاضا ہے؟ اور کیا تجھے یہ خیال نہیں کہ تیری ہر رگ وپے ہر وقت اس کی قدرتِ قاہرہ کی مٹھی میں ہے؟ پھر بھی مہلت پر مہلت تجھ کو دے رہے ہیں، اسی مہلت کو غنیمت عظمیٰ سمجھ! اس سے فائدہ اٹھالے! ورنہ پھر دیکھ عن قریب تجھ پر کیا بدحالی اور تباہی آتی ہے۔

---

(۱) وقال أبو الزناد بن سراج: جمع عمار في هذه الألفاظ الخير كله. لأنك إذا أنصفت من نفسك فقد بلغت الغاية بينك وبين خالقك وبينك وبين الناس ولم تضيع شيئا، أي: مما لله وللناس عليك. (عمدة القاري: ١/١٩٨)

اس طرح محاسبہ کرتے کرتے نفس انصاف پر آجائے گا، کوتاہیٔ حق اللہ میں مبتلا نہ رہے گا، بشرطے کہ اس پر دوام ہو، ان شاء اللہ طبیعت ثانیہ بن جائے گی، برابر حقوقِ خالق ادا ہونے لگیں گے۔

اسی طرح حق خلق کے متعلق جب سوچے گا کہ تو نے فلاں سے ایسی دل سوز اور دل شکن بات کیوں کی تھی اور اس پر اس قدر تشدد کیوں کیا تھا؟ یہ سختی اور نامناسب لفظ اس کو کیوں کہا تھا؟ تجھ کو چاہیے تھا کہ خیر اندیش، خیر خواہ، نفع رساں ہوتا یا کم سے کم ضرر رساں نہ ہوتا، ملاطفت نہ ہوتی تو تشدد بھی نہ کرتا، یہ معاملہ، یہ بات، یہ طریق فلاں کے ساتھ کیوں اختیار کیا؟ نفس سے اس طرح جائزہ لے رہا ہے کہ تجھے خوفِ خدا نہیں آتا؟ خدا کو کس طرح منھ دکھائے گا، دوسرا تیرے ساتھ کیسی بھی بدسلوکی کرتا مگر تو حسن سلوک کرتا، افسوس ہے کہ حسنِ سلوک کے بہ جائے بدسلوکی کرتا ہے، اب انصاف کے ساتھ رہنا، ظلم وتعدی، جور و بدسلوکی نہ کرنا۔

اس طرح محاسبہ کرتے اور جائزہ لیتے لیتے طبیعت ثانیہ انصاف کی بن جائے گی اور اعتدال پیدا ہوجائے گا، قوتِ غضب مغلوب ہوجائے گی، اب نہ خلق کے حقوق میں کوتاہی ہوگی، نہ خالق کے حقوق میں، مخلوق کے حقوق اس طرح ادا ہوتے رہیں گے اور خالق کے حقوق یوں ادا ہوتے رہیں گے تو حاصل ''**الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ**'' کا محاسبہ ہوا نفس سے معاملۂ خالق اور معاملۂ خلق کے بارے میں۔

اس کا اثر یہ ہوگا کہ تینوں قسم کے حقوق پورے طور سے ادا ہوتے رہیں گے اور جامع الصفات اور صاحب تزکیہ ہوجائے گا اور اس طرح عمل کرنے سے گندہ معاشرہ بھی درست ہوجائے گا، اپنے اندر تکبر، شیخی، بڑائی ہوگی تو اس کا علاج ہوجائے گا، آیندہ خطرہ بھی ہوگا تو اس کا بھی انتظام اور اس سے حفاظت ہوجائے گی اور اپنی خلق اور معاشرہ دونوں کی اصلاح ہوجائے گی۔

''وَبَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ'' پر کلام

دوسری چیز افشائے سلام ہے، شناسا اجنبی، چھوٹے، بڑے سب کو سلام کیا جائے۔(اس سے) دو باتیں ہوں گی :ایک تو اپنے اندر تواضع وفروتنی پیدا ہوگی۔ دوسرا اپنے اندر سے بڑائی کی جڑ کٹ جائے گی اور خرابیٔ معاشرہ کے اسباب: بغض وکینہ وغیرہ اور زندگی کے برباد کن امور: غیظ وغضب، کینہ کی جڑیں کٹ جائیں گی۔

گوکہ ہم سے اصلاح کے عرق پوچھتے ہیں، یہ سب احادیث میں موجود ہیں، ہم اپنے گھر سے نہیں کہتے، مولوی پڑھ پڑھا لیتے ہیں، مشائخ صوفیا نے اپنے کو جانچتے جانچتے بنالیا، اس لیے ان کو یہ چیزیں مستحضر رہتی ہیں اور مولوی پڑھ پڑھا کر بھول جاتے ہیں وقت پر استحضار نہیں کرتے اور غضب سے مغلوب ہوکر بے وقار اور غلط کار ہو جاتے ہیں۔

اسلام کی بھی قید مذکور نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو مسلم ہو یا کافر، سلام سب کو عام ہے مگر قید لفظِ سلام کے معنی ہی سے نکل رہی ہے کہ سلام کے معنی عام آفات، مصائب سے دنیا وآخرت میں سلامتی کے ہیں اور کافر کے لیے آخرت میں سلامتی ممکن نہیں، اس لیے شراح علامہ عینیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ کافر کو سلام کرنا حرام ہے (۱) اور کافر اگر سلام کرے تو اس کو جواب دینا واجب نہیں (۲)۔

---

(۱) ثم هذا العموم مخصوص بالمسلمين، فلا يسلم ابتداء على كافر لقوله صلى الله عليه وسلم :(لا تبدؤا اليهود ولا النصارى بالسلام، فإذا لقيتم أحدهم في الطريق فاضطروه إلى أضيقه)، رواه البخاري.(عمدة القاري : ۱۳۸/۱،باب إطعام الطعام من الإسلام)

(۲) وَلَوْ سَلَّمَ يَهُودِيٌّ أَوْ نَصْرَانِيٌّ أَوْ مَجُوسِيٌّ عَلَى مُسْلِمٍ فَلَا بَأْسَ بِالرَّدِّ (وَ) لَكِنْ (لَا يَزِيدُ عَلَى قَوْلِهِ وَعَلَيْك) كَمَا فِي الْخَانِيَةِ.(رد المحتار على الدر المختار :۴۱۲/۶، ۴۱۳)

فاسق کو سلام کرنے کا حکم

اب رہ گیا فاسق وفاجر، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ سو سلام میں ایک گونہ مخاطب کی تعظیم بھی ہوتی ہے اور فاسق کی تعظیم کے متعلق حدیث میں آتا ہے : "اهْتَزَّ لِذَلِكَ العَرْشُ" کہ عرش کانپ جاتا ہے (۱) ۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاسق کو تعظیماً سلام کرنے سے ایمان نکل جاتا ہے۔

تو اب جب یہ بات ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا فاسق کو سلام نہ کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ بلا لحاظِ تعظیم اپنے نفس کے علاج کے لیے سلام کرنا درست ہے تو اپنے نفس کے حق کی وجہ سے سلام کرنا ہے کہ نفس سے انصاف یہ ہے کہ اس میں تکبر و عجب و بغض وعناد پیدا نہ ہونے دے، اگر ہو تو اس کا استیصال کردے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس مبتلائے امراضِ روحانیہ گنہگار کے لیے دعاء کی نیت سے سلام کرلے کہ دردمندی، ہمدردی ہوگی جو کہ ایک مخلوق کا حق ہے، تو تعظیم سے بچتے ہوئے تادیباً للنفس وعلاجاً اور خیرخواہانہ سلام ہوگا کہ اے اللہ! اس کو سلامتی والا بنادے، اسبابِ ہلاکت وآفات اس سے دور کردے (۲) ۔

---

(۱) پوری حدیث اس طرح نقل کی جاتی ہے :إِذا مُدِحَ الفاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ واهْتَزَّ لِذَلِكَ العَرْشُ . رواه أبو يعلى والبيهقي عن أنس ورواه ابن عدي عن ابن بريدة.(كشف الخفاء ومزيل الإلباس عما اشتهر من الأحاديث على ألسنة الناس : ۱/۹۹، الهمزة مع الذال المعجمة)

(۲) علامہ نووی فرماتے ہیں :قلتُ :فإن اضطُر إلى السلام على الظلمة، بأن دخل عليهم وخاف ترتب مفسدة في دينه أو دنياه أو غيرهما إن لم يسلّم، سلّم عليهم. قال الإمام أبو بكر بن العربي :قال العلماء :يسلِّم، وينوي أن السلام اسم من أسماء الله تعالى المعنى :الله عليكم رقيب. (الأذكار للنووی، ص ۲۵۵)

سلام کرنے اور اس کا جواب دینے کے ثواب میں کمی زیادتی اور اس کی حکمت

بہرحال! سلام میں فاسق کی تعظیم سے بچے، چوں کہ سلام میں تعظیم رکھی ہوتی ہے جس سے دینی ذلت ہونا لازم ہے، اسی وجہ سے بادی بالسلام کو ۹۰ رنیکیاں اور مجیب کو دس نیکیاں ملتی ہیں (۲)، عقل کہتی ہے کہ اس کے برعکس ہو، کیوں کہ سلام سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے اور واجب کا درجہ بڑا ہے، سنت کا اس سے کم ہے، پس بڑی طاعت کرنے سے اجر ثواب بھی زیادہ ہونا چاہیے، شریعت کہتی ہے کہ اپنی عقل اپنے گھر میں رکھ، کیوں کہ اللہ تعالی کے یہاں تذلل، انکساری وتواضع، عبدیت مطلوب ہے، اس کے برابر کسی کی قدر نہیں، اس لیے جس عبادت میں یہ عبدیت (جو کہ روح عبادت ہے) زیادہ ہوگی، وہ زیادہ اجروثواب کا باعث ہوگی۔ ابتداءً سلام کرنے میں تعظیم غیر ہوتی ہے اور اپنے لیے تذلل، تواضع وانکسار ہوتا ہے، اس لیے یہ سلام گرچہ بہ ظاہر عبادتِ سنت کا رنگ لیے ہوئے ہے مگر تواضع وعبدیت زیادہ ہے؛ اس لیے اس کا اجروثواب بھی زیادہ ہے۔ حاصل یہ کہ فاسق کو سلام کرنا علاجاً ودعاءً اور اسی طرح دفعاً للضرر جائز ہے۔

---

(۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ یقُولُ :سَمِعْتُ رَسُولَ اللہِ ﷺ يَقُولُ :إِذَا الْتَقَى الرَّجُلانِ الْمُسْلِمَانِ فَسَلَّمَ أَحَدُهُمَا عَلَى صَاحِبِهِ، فَإِنَّ أَحَبَّهُمَا إِلَى اللہِ أَحْسَنُهُمَا بِشْرًا لِصَاحِبِهِ، فَإِذَا تَصَافَحَا، نَزَلَتْ عَلَيْهِمَا مِائَةُ رَحْمَةٍ، لِلْبَادِي مِنْهُمَا تِسْعُونَ، وَلِلْمُصَافِحِ عَشَرَةٌ (کشف الأستار: ۲/۴۱۹، کِتَابُ الْأَدَبِ، رقم الحدیث :۲۰۰۳)

سلام کرنے میں حیلے حوالے تلاش نہ کریں

اس سے معلوم ہوا کہ سلام ایک بڑی خوبی کی اور خدا کا محبوب ہونے کی چیز ہے مگر مولوی لوگ اس پر عامل نہیں، اپنے نفس کو بچانے کے لیے بڑی تاویلات کرتے ہیں، بہ قول حضرت تھانویؒ کہ تعبیر وتاویل کا پھاٹک اتنا چوڑا ہے کہ اس سے ہاتھی نکل جائے، تاویلات کرتے ہیں کہ یہ لڑکا ہے، اس کو سلام کرنے سے اس کا دماغ بگڑ جائے گا، اس کے اندر رعونت آجائے گی، وغیرہ وغیرہ، تو سلام کرنے والا چھوٹائی والا اور اپنی حقارت والا ہوتا ہے اور یہ حق تعالی کو پسند اور محبوب ہے، اس لیے ابتداء بالسلام والے کو ۹۰ رنیکیاں اور جواب دینے والے کو باوجود اس کے کہ اس نے ایک واجب ادا کیا ہے، صرف دس نیکیاں ملتی ہیں۔

یہ فرق بڑا مشکل ہوجاتا ہے، بس سرسری اور معمولی علم کافی نہیں، بڑے علم کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں؟ بہت ضروری ہے، تو تعلیم الاسلام پڑھ کر مولوی اور راہِ نجات پڑھ کر مولوی نہیں ہوتے۔

تو معلوم ہوگیا کہ فاسق کو علاجاً ودعاءً، ظالم کو دفع مضرت کے لیے سلام کرنا درست ہے۔

کافر کے متعلق ابھی کچھ نہیں بیان کیا، سو اس کو بھی دفع مضرت کے لیے نیز اخلاقاً یعنی اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور حسن معاشرت اور مسلمانوں کے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے سلام کرنا درست ہے، نیز اس کا ایک حق ہے، اس حق کی ادائیگی کے لیے سلام کرنا درست ہے؛ لیکن یہ اسلامی سلام نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے الفاظ دوسرے ہوں گے جیسے آداب، عرض یا اس کے عہدہ کا نام لے کر خطاب کرنا ہوگا (۱)۔ نہ وہ الفاظ جو شرکیہ یا موہوم شرک ہوں

(۱) (وَيُسَلِّمُ) الْمُسْلِمُ (عَلَى أَهْلِ الذِّمَّةِ) لَوْ لَهُ حَاجَةٌ إِلَيْهِ وَإِلَّا كُرِهَ هُوَ الصَّحِيحُ. (الدر المختار: ۴۲/۶) لَكِنْ فِي الشِّرْعَةِ إِذَا سَلَّمَ عَلَى أَهْلِ الذِّمَّةِ فَلْيَقُلْ: السَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى. (رد المحتار: ۴۱۲/۶)

جیسے پالکن، بندگی وغیرہ۔

سلام مسلمان کا حق ہے

غرض مسلم کا حق تو بطریق اولی ہوا کہ اس کو سلام کیا جائے، چنانچہ حدیث انسؓ میں ہے: ”یا بُنَيَّ، إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ لَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لأَحَدٍ فَافْعَلْ“ (۱) کہ تیرے نفس میں صبح شام (یہ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وقت) ایسا رہ کہ کسی کا حق کم کرنے یا کسی کو اس کے درجہ سے گھٹانے کا تصور اور خیال تک نہ آئے، ایسا کر سکے تو ضرور ایسا کر۔

یہ ہے انتہائی ومعیاری زندگی ہے صحابہؓ کی، ایسے بنو! تو مسلم کا حق یہ ہے کہ اس کی طرف سے دل صاف ہو، دل میں محبت ہو اور دل میں اس کے لیے جھکاؤ اور پستی وتواضع ہو اور چوں کہ سلام ان سب امور پر مشتمل اور سب کو متضمن ہے، اس لیے کثرت کے ساتھ سلام کرنے اور اس کو رواج دینے اور پھیلانے کا حکم فرمایا۔

افشائے سلام کے آثار وفوائد

اس افشائے سلام کا اثر یہ ہوگا کہ دل میں غش وتکبر پیدا نہ ہوگا اور اگر پہلے سے کچھ ہوگا بھی تو رفتہ رفتہ اس عمل بالسلام کرتے کرتے غل وغش، تکبر، غصہ، بغض کینہ، سب نکل جائے گا، بالخصوص جب کہ وقت سلام ان قابل ازالہ امور کے ازالہ کا اور قابل تحصیل پستی، تواضع، صفائے قلب ومحبت کی تحصیل کا قصد واستحضار بھی ہو۔

نیز اگر وقتی طور پر کوئی بات الجھا الجھاؤ کی ہو جائے تو بہت جلد صفائی کر لے معافی کر کرا لے، اس لیے میں بہت جلدی کرتا ہوں، اگر کسی طالب علم کے ساتھ ایسی بات ہو جانے کا خیال بھی آ جائے۔

---

(۱) سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْعِلْمِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ البِدَعِ، رقم الحدیث: ۲۶۷۸.

بادی بالسلام کبر سے بری ہوتا ہے

تو سلام اگرچہ سنت ہے مگر کثیر خوبیوں کا جامع ہے اور اوصاف وجواہر انسانیت پر مشتمل ہے۔اس لیے ابتداءً سلام کرنے میں ثواب زیادہ ہے، بہ نسبت جواب دینے کے، اگرچہ وہ واجب ہے مگر جواب دینے میں یہ خوبیاں نہیں ہیں، ارشاد ہے: البادئ بالسَّلامِ بَرِيءٌ مِنَ الكِبْرِ (۱)۔

تو روح عبادت عبدیت اور فنائیت ہے، پس جس میں یہ زیادہ ہوگی، وہ خدا تعالیٰ کو زیادہ محبوب ومقبول ہوگا، اس پر اجر وثواب زیادہ ہوگا، اگرچہ وہ سنت ومستحب ہی کی صورت میں ہو، جیسے نماز کا وقت آجانے پر نماز پڑھنے کے لیے وضو واجب ہے اور وقت آنے سے پہلے وضو مستحب ہے مگر وقت سے پہلے نماز کی تیاری کرنے اور وضو کرنے کا ثواب زیادہ ہے بعد الوقت وضوء کرنے سے۔

سلام کے بعض آداب

(۱) من جملہ آداب متعلقہ بالسلام یہ ہیں کہ سلام کا جواب فوری واجب ہے، اگر دیر سے جواب دیا تو سلام کرنے والے کا حق ادا نہیں ہوا (۱)۔

---

(۱) الآداب للبيهقي ص ٦٣، وَرُوِّينَا عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رضی الله تعالى عنه، مَرْفُوعًا « :الْبَادِي بِالسَّلَامِ بَرِيءٌ مِنَ الْكِبْرِ . وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رضی الله تعالى عنه، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِاللهِ مَنْ بَدَأَهُمْ بِالسَّلَامِ، بَابُ مَنْ أَوْلَى بِالِابْتِدَاءِ بِالسَّلَامِ، رقم الحديث: ٢٠٦.

(٢) وَرَدُّ السَّلَامِ وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ عَلَى الْفَوْرِ (قَوْلُهُ وَرَدُّ السَّلَامِ وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ عَلَى الْفَوْرِ) ظَاهِرُهُ أَنَّهُ إِذَا أَخَّرَهُ لِغَيْرِ عُذْرٍ كُرِهَ تَحْرِيمًا وَلَا يَرْتَفِعُ الْإِثْمُ بِالرَّدِّ بَلْ بِالتَّوْبَةِ. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/٤١٤)

(۲) الفاظ السلام علیکم ہونا ضروری ہے، محض سلام کہہ دینا کافی نہیں (۱)۔

(۳) ہاتھ سے سلام کرنا یعنی صرف ہاتھ اٹھا دینا درست نہیں (۲)، اگر دور ہونے کی وجہ سے ہاتھ اٹھانا ضروری ہو تو زبان سے بھی کہنا ضروری ہے (۳)۔

(۴) سلام کرنے میں جھکنا درست نہیں۔

(۵) تلاوت کنندہ کو، پیشاب پاخانہ کرتے ہوئے کو کھانا کھاتے ہوئے کو سلام کرنا منع ہے، مکروہ ہے (۴)۔ کھانا کھانے والے کو سلام کرنا جائز ہے مگر

---

(۱) وأقل السلام أن يقول السلام عليكم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج: ۱۴/۱۴۰) وَأَنَّهُ لَا يَجِبُ رَدُّ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِجَزْمِ الْمِيمِ. (قَوْلُهُ بِجَزْمِ الْمِيمِ) الْأَوْلَى بِسُكُونِ الْمِيمِ قَالَ ط: وَكَأَنَّ عَدَمَ الْوُجُوبِ لِمُخَالَفَتِهِ السُّنَّةَ الَّتِي جَاءَتْ بِالتَّرْكِيبِ الْعَرَبِيِّ. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۴۱۴)

(۲) روينا في كتاب الترمذي عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جدّه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا، لا تشبهوا باليهود ولا بالنَّصارَى، فإِنَّ تَسْلِيمَ اليَهُودِ الإشارَةُ بالأصَابعِ، وَتَسْلِيمَ النَّصارَى الإِشارَةُ بالكَفّ". (الأذكار للنووى، ص ۲۴۶)

(۳) لو كان السلام على (أصم فينبغي الإشارة مع التلفظ، ليحصل الإفهام، وإلا فلا يستحق جوابًا، وإذا سلم على) أخرس فأشار الأخرس باليد سقط عنه الفرض، وكذا لو سلم عليه أخرس بالإشارة استحق الجواب. (التوضيح لشرح الجامع الصحيح لابن الملقن: ۲۹/۱۸)

(۴) علامہ حصکفیؒ نے امام صدر الدین غزیؒ سے اشعار کی شکل میں وہ مواقع نقل کیے ہیں جن میں سلام مکروہ یا ناجائز ہے، فرماتے ہیں:

سَلَامُكَ مَكْرُوهٌ عَلَى مَنْ سَتَسْمَعُ		وَمَنْ بَعْدَ مَا أَبْدِي يُسَنُّ وَيُشْرَعُ

کچھ سطور کے بعد فرماتے ہیں:

وَدَعْ كَافِرًا أَيْضًا وَمَكْشُوفَ عَوْرَةٍ		وَمَنْ هُوَ فِي حَالِ التَّغَوُّطِ أَشْنَعُ
وَدَعْ آكِلًا إِلَّا إِذَا كُنْتَ جَائِعًا		وَتَعْلَمُ مِنْهُ أَنَّهُ لَيْسَ يَمْنَعُ

(رد المحتار على الدر المختار: ۱/۶۱۷)

اس پر جواب واجب نہیں، باقی دوسروں کو سلام کرنا جائز ہی نہیں (۱)۔

تو بعض چیزیں فی نفسہ اچھی اور مستحسن ہوتی ہیں مگر ہر وقت نہیں، وقت بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے ہر چیز کے حدود وشرائط ہیں، یہ نہیں کہ جو چیز مستحسن ہے، وہ ہر وقت ہر حال میں ہر طرح مستحسن ہی ہو۔ جیسے نماز افضل عبادات ہے مگر زوال کے وقت یعنی استوائے شمس کے وقت منع اور ناجائز ہے۔

سلام تمام مسلمین کا ایک ہی ہے، چھوٹے بڑے اس میں مساوی ہیں، جیسے چھوٹے ابتدائے سلام کر کے اس کی عظیم فضیلت وثواب حاصل کر سکتے ہیں، بڑے بھی چھوٹوں کو سلام کر کے یہ فضیلت اور ثواب حاصل کر سکتے ہیں، یہ نہیں کہ خان صاحب ہیں تو تیلی کو کیسے سلام کریں یا تیلی یا اور کوئی چھوٹے درجہ کا دنیوی اعتبار سے بڑے لوگوں کو، خان صاحب وغیرہ کو السلام علیکم نہ کرے، بس فقط سلام کہے، نہیں! اس کو بھی السلام علیکم ہی کہنا چاہیے، یہ سلام میں فرق وامتیاز اسلامی طریقہ نہیں۔

جیسا کہ جب میں یہاں آیا تو لوگ یہاں اس طرح سلام کرتے تھے : بندہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے : حضرت صاحب!، میں نے کہا کہ اس طرح نہیں، السلام علیکم کہا کرتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ بڑے لوگوں کو سلام یوں ہی کرتے ہیں، میں نے کہا: نہیں! اسلام یہ نہیں سکھاتا، خان صاحبان بھی ، بڑے بڑے لوگ بھی حضرت صاحب! کہہ دیتے تھے۔ جب میں نے سمجھایا، بہ مشکل ختم کرایا پھر چھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی عادتِ سابقہ کبھی بلا اختیار عود کر آتی تھی، ایسے ہی بعضے آداب عرض کہتے

---

(۱) (قَوْلُهُ كَآكِلٍ) ظَاهِرُهُ أَنَّ ذَلِكَ مَخْصُوصٌ بِحَالِ وَضْعِ اللُّقْمَةِ فِي الْفَمِ وَالْمَضْغِ وَأَمَّا قَبْلُ وَبَعْدُ فَلَا يُكْرَهُ لِعَدَمِ الْعَجْزِ وَبِهِ صَرَّحَ الشَّافِعِيُّ، وَفِي وَجِيزِ الْكَرْدَرِيِّ مَرَّ عَلَى قَوْمٍ يَأْكُلُونَ إنْ كَانَ مُحْتَاجًا وَعَرَفَ أَنَّهُمْ يَدْعُونَهُ سَلَّمَ وَإِلَّا فَلَا اهـ. وَهَذَا يَقْضِي بِكَرَاهَةِ السَّلَامِ عَلَى الْآكِلِ مُطْلَقًا إلَّا فِيمَا ذَكَرَهُ .(رد المحتار على الدر المختار :٦/٤١٥)

پھر فوراً چونکتے اور السلام علیکم کرتے تھے، غرض! السلام علیکم کہے؛ سلام علیک بھی پورا سلام اور ادائے حق نہیں۔

یہ سب کتابوں کی بات ہے، شراحِ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے، میں اپنے گھر سے نہیں کہہ رہا، لکھنا بھی السلام علیکم چاہیے اور لکھنے کے ساتھ زبان سے بھی کہنا چاہیے، محض تحریر سے بلا تلفظ سلام و جواب ادا نہیں ہوگا۔ ذمہ میں جواب باقی رہے گا، اس لیے زبان سے کہنا ضروری ہے(۱)۔ غائبانہ کوئی سلام بھیجے تو علیہ وعلیکم السلام کہو(۲)۔ یہ آداب ہیں سلام کے۔ "**الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ**" پر بات تھی۔ حق اللہ وحق نفس کے ادا کرنے کے لیے افشائے سلام کی ترویج چاہیے، اس میں کسی وقت اور قوم اور چھوٹے بڑے کی قید نہیں، اس سے معاشرہ بھی درست ہوتا ہے اور ادائے حق مسلم بھی ہوتا ہے۔

"وَالإِنْفَاقُ مِنَ الإِقْتَارِ" پر کلام

تیسری چیز: "وَالإِنْفَاقُ مِنَ الإِقْتَارِ" ہے یعنی تنگ دستی کے باوجود خرچ

(۱) (قَوْلُهُ وَيَجِبُ رَدُّ جَوَابِ كِتَابِ التَّحِيَّةِ) لِأَنَّ الْكِتَابَ مِنْ الْغَائِبِ بِمَنْزِلَةِ الْخِطَابِ مِنْ الْحَاضِرِ مُجْتَبَى وَالنَّاسُ عَنْهُ غَافِلُونَ ط. أَقُولُ :الْمُتَبَادَرُ مِنْ هَذَا أَنَّ الْمُرَادَ رَدُّ سَلَامِ الْكِتَابِ لَا رَدُّ الْكِتَابِ. لَكِنْ فِي الْجَامِعِ الصَّغِيرِ لِلسُّيُوطِيِّ رَدُّ جَوَابِ الْكِتَابِ حَقٌّ كَرَدِّ السَّلَامِ قَالَ شَارِحُهُ الْمُنَاوِيُّ :أَيْ إذَا كَتَبَ لَك رَجُلٌ بِالسَّلَامِ فِي كِتَابٍ وَوَصَلَ إلَيْك وَجَبَ عَلَيْك الرَّدُّ بِاللَّفْظِ أَوْ بِالْمُرَاسَلَةِ وَبِهِ صَرَّحَ جَمْعٌ شَافِعِيَّةٍ، وَهُوَ مَذْهَبُ ابْنِ عَبَّاسٍ.(رد المحتار على الدر المختار:۶/۴۱۵)

(۲)وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يَرُدَّ عَلَى الْمُبَلِّغِ أَيْضًا فَيَقُولَ :وَعَلَيْك وَعَلَيْهِ السَّلَامُ اهـ. وَمِثْلُهُ فِي شَرْحِ تُحْفَةِ الْأَقْرَانِ لِلْمُصَنِّفِ، وَزَادَ وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ يَجِبُ اهـ. لَكِنْ قَالَ فِي التَّتَارْخَانِيَّة ذَكَرَ مُحَمَّدٌ حَدِيثًا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ مَنْ بَلَّغَ إنْسَانًا سَلَامًا عَنْ غَائِبٍ كَانَ عَلَيْهِ أَنْ يَرُدَّ الْجَوَابَ عَلَى الْمُبَلِّغِ أَوَّلًا ثُمَّ عَلَى ذَلِكَ الْغَائِبِ اهـ. وَظَاهِرُهُ الْوُجُوبُ تَأَمَّلْ.(رد المحتار على الدر المختار:۶/۴۱۵)

کرنا، خواہ اپنی ذات پر تنگی یعنی فقر وافلاس ہو یا تنگئ عام یعنی قحط کا زمانہ ہو، اس وقت خرچ کرنا اور جمع کر کے نہ رکھنا، داد ودہش واعطاء رکھنا ایمان میں سے اور اونچے درجہ کے ایمان سے ہے۔ زیادہ خرچ کی حیثیت نہ ہو، کم ہی سہی تو باوجود مفلس وتنگ حال ہونے کے خلق پر خرچ کرتا اور فراخ دلی سے کام لیتا ہے، دونوں ہاتھوں سے نہیں تو ایک ہی ہاتھ سے کرتا ہے، اپنے پاس ضرورت سے زیادہ نہیں ہے مگر سائل جو آتا ہے (بشرطے کہ پیشہ ور نہ ہو) اس کی حاجت روائی کرتا ہے یہ بڑا کمال ہے(۱)۔

اس لیے شراح رحمہم اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں اہل وعیال، مسافرین، سائلین سب کے حقوق آگئے، سب کے حقوق ادا کرنا چاہیے، مانا کہ ایک ایسا حاجت مند ہے یا سائل ہے جو اپنی مخالفت کرتا ہے مگر کافر حربی نہیں، مسلم ہے، مخالف طبع ہے، اگر واقعی حاجت مند ہو اور اپنے کو مقدرت ہو تو اس کی حاجت روائی فرض ہے۔

حضرت مسطح رض کا نفقہ بند کرنے پر قرآن میں حضرت صدیق رض کو تنبیہ

دیکھیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کی صاحب زادی وحضور اقدس ﷺ کی زوجۂ مطہرہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا) کو تہمت لگانے

---

(۱) وأما (الإنفاق من الإقتار) فهو الغاية في الكرم وقد مدح الله من هذه صفته بقوله: (ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة) وهذا عام في نفقة الرجل على عياله وأضيافه وكل نفقة في طاعة الله تعالى وفيه أن نفقة المعسر على عياله أعظم أجراً من نفقة الموسر. (الكواكب الدراري في شرح صحيح البخاري: ۱/۱۳۳)

والوں میں ایک وہ شخص بھی ہیں جن کی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ امداد فرمایا کرتے تھے، باوجود اس کے کہ وہ اپنے محسن کی صاحب زادی ہیں اور ام المؤمنین زوجۂ مطہرہ آں حضرت ﷺ ہیں، چاہیے تھا کہ ان کے متعلق لب کشائی تک خود تو کیا کرتے، دوسروں کو بھی منع کرتے اور حمایت میں مدافعت فرماتے، برعکس اس کے ایک اتہامِ غیر واقعی غیر محقق بات میں خود بھی شریک ہو جاتے ہیں، یہ بات بہت بھاری اور بڑی دردناک اور غم دہ ہے، اسی بنا پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ نے ان کی امداد سے رکنے پر قسم کھالی تھی، اس پر آیت ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٢﴾﴾ [النور] نازل ہوگئی۔ حکم ایزدی ہوتا ہے کہ تم قسم توڑ دو اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرو اور ان کی امداد سابق جاری رکھو، اس میں کوتاہی نہ ہونے پائے، سمجھے آپ (۱)۔

اب ذرا سی بات کسی کی طرف سے خلاف طبع پیش آجائے، بس سب خیر خواہیاں اور نفع رسانیاں بالکل بند، ذرا ذرا سی باتوں میں بخل ہونے لگتا ہے، ادنی ادنی رواداری تک منقطع کر لیتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ نفرت ومخالفت کر بیٹھتے

(۱) الْمَشْهُورُ مِنَ الرِّوَايَاتِ أَنَّ هَذِهِ الْآيَةَ نَزَلَتْ فِي قِصَّةِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي قُحَافَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَمِسْطَحِ بْنِ أُثَاثَةَ. وَذَلِكَ أَنَّهُ كَانَ ابْنَ بِنْتِ خَالَتِهِ وَكَانَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ الْبَدْرِيِّينَ الْمَسَاكِينِ. وهو مسطح بن أثاثة ابن عَبَادِ بْنِ الْمُطَّلِبِ بْنِ عَبْدِ مَنَافٍ. وَقِيلَ: اسْمُهُ عَوْفٌ، وَمِسْطَحٌ لَقَبٌ. وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يُنْفِقُ عَلَيْهِ لِمَسْكَنَتِهِ وَقَرَابَتِهِ، فَلَمَّا وَقَعَ أَمْرُ الْإِفْكِ وَقَالَ فِيهِ مِسْطَحٌ مَا قَالَ، حَلَفَ أَبُو بَكْرٍ أَلَّا يُنْفِقَ عَلَيْهِ وَلَا يَنْفَعَهُ بِنَافِعَةٍ أَبَدًا، فَجَاءَ مِسْطَحٌ فَاعْتَذَرَ وَقَالَ: إِنَّمَا كُنْتُ أَغْشَى مَجَالِسَ حَسَّانَ فَأَسْمَعُ وَلَا أَقُولُ. فَقَالَ لَهُ أَبُو بَكْرٍ: لَقَدْ ضَحِكْتَ وَشَارَكْتَ فِيمَا قِيلَ، وَمَرَّ عَلَى يَمِينِهِ، فَنَزَلَتِ الْآيَةُ.
(تفسیر القرطبی: ۱۲/ ۲۰۷، فی تفسیر سورۃ النور)

ہیں، عداوت و کینہ سے سینے لبریز ہو جاتے ہیں، ایک دوسرے کی جستجو اور فکر اور ٹوہ میں لگ جاتے ہیں اور پیچھے پڑ جاتے ہیں، موقع ضرر رسانی کے متلاشی ہو جاتے ہیں، حالاں کہ خلافِ نفس معمولی نہیں، بہت بھاری بات پیش آجانے پر بھی قسم تک تڑوا کر کفارہ کا حکم فرما دیا مگر خیر خواہی بند نہیں ہونے دی۔

استاذ و شیخ سے نفع کے لیے معتقد ہونا اور کم سے کم خالی الذہن ہونا شرط ہے

یہ ہیں اسلامی پاکیزہ تعلیمات، کیا کہیں کسی مذہب میں کوئی اس کی نظیر دکھلا سکتا اور پیش کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! آپ کہیں گے: تو کیا اب مال و دولت سے دامن جھاڑ دیں اور خالی ہو بیٹھیں؟، اچھا تو گویا جو باتیں سنائیں، وہ حضرت جی ہی کو مبارک ہو! عزیزانِ محترم! میں تو اپنے گھر سے نہیں کہہ رہا، واقعات سنا رہا ہوں۔ بڑوں کے ساتھ خصوصاً شیخ و استاذ کے ساتھ حسنِ اعتقاد ضروری ہے، ورنہ نفع نہیں ہوگا، کم از کم بدگمانی اور بد اعتمادی تو بالکل نہ ہو، چوں کہ نفع کے لیے معتقد ہونا اور کم سے کم خالی الذہن ہونا شرط ہے۔

قرآن و حدیث کو عمل کی غرض سے پڑھیے، صرف وعظ گوئی کی غرض سے نہیں

اس حدیث پر عمل کرنا اور حقوقِ ضروریہ مالیہ و بدنیہ لازمہ و متعدیہ کا اہتمام سے ادا کرنا ضروری ہے، جس کی تفصیل آپ کے سامنے عرض کی گئی۔ یہ نہیں کہ بس پڑھ پڑھا لیا، دوسروں کو وعظ سنا دیا اور بس! اسی کو مقصد ٹھہرا لیا اور اپنے اخلاق و اعمال کی نگرانی اور احادیث و قرآنِ پاک کا اپنے حالات پر انطباق کرنے سے

کوئی سروکار نہ رکھا، جب کوئی حدیث شریف یا آیت کلام پاک پر نظر ہوئی، بس وعظ سنا دیا اور دوسروں پر انطباق کر کے بے فکر ہو گئے، اپنے کو فراموشی میں رکھا۔

جیسے ایک واعظ مولوی صاحب عورتوں کو بہت ترغیب دیتے تھے اور خرچ کرنے پر خوب اجر وثواب اور جنت اور وہاں کے انعامات یاد دلایا کرتے تھے، ان کی بیوی نے یہ سن کر اپنا سب زیور صدقہ کر دیا، ان مولوی صاحب کو اس کا کچھ علم نہیں ہوا، بعد چندے ایک تقریب میں ان کی بیوی صاحبہ جانے لگیں تو دیکھا کہ زیور بالکل نہیں، دریافت کیا کہ وہ تمھارا زیور کیا ہوا؟ اس کو کیوں نہیں پہنا؟ خیال کیا کہ مولوی جی کی بیوی تقریب میں بغیر زیور جائیں، بیوی صاحبہ نے جواب دیا کہ میں نے ایک دفعہ آپ کے وعظ میں صدقات کے فضائل اور ثوابات ودرجات سنے تھے، اس لیے میں نے وہ سب خیرات کر دیا، انھوں نے کہا: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ! (اس واقعے کو حضرت نے سنا کر فرمایا: عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں، جلدی متأثر ہو کر مصلحت ضروری کا بھی انھیں خیال نہیں رہتا، اس لیے میں جلسوں میں عورت کے لیے انفاق میں شرطِ اجازتِ شوہر ضروری کہتا ہوں۔) میں نے تو اس لیے سنایا تھا کہ دوسروں کا زیور اپنے گھر آئے، تو نے خود گھر سے کھو دیا۔ دیکھیے ایسے طماع اور لالچی بھی ہوتے ہیں۔

پڑھتے ہی ہو یا گُنتے بھی ہو؟

تو کیا یہ حدیث دوسروں ہی کے لیے ہے، مولویوں کے لیے نہیں؟ کیا مولویوں کو اس حدیث اور اس قسم کی دیگر احادیث سے مستثنیٰ فرما دیا اور کہہ دیا کہ تم اے مولویو! محاسبہ نہ کرنا اور تم ابتداء بالسلام نہ کرنا اور تم انفاق نہ کرنا، تم تو محض سنانے کے لیے ہو، دوسروں کو سمجھانے کے لیے ہو، خود سمجھنے کے لیے نہیں اور تم تو

محض پڑھنے پڑھانے کے لیے ہو، گُننے کے لیے نہیں۔

یہ گننا کہاں سے نکالا؟ اس کے متعلق سنئے! حضرت تھانویؒ نے سنایا تھا کہ میری طالب علمی کے زمانے میں ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے مجھے بلایا اور فرمایا: صاحب زادے! کیا پڑھتے ہو؟ میں نے بتلادیا۔ فرمایا: پڑھتے ہی ہو یا گنتے بھی ہو؟ پھر فرمایا: اور جانتے ہو گننا کسے کہتے ہیں؟ گننا اس کو کہتے ہیں کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ سمجھنا اور عمل کرنا بھی ہو۔ دیکھو! پڑھتے تو ہو گنتے بھی رہنا۔

نوافل کا اہتمام اور فرائض کا ترک!

تو دوسروں کو وعظ سناتے رہنا اور خود عمل نہ کرنا ایسا ہی ہے، جیسا کہ ایک صاحب نے بڑے فخر سے بیان کیا کہ میں اپنے شیخ کی تعلیمات وارشادات کا اس قدر پابند ہوں کہ ان کا بتلایا ہوا وظیفہ چھوٹنے نہیں پاتا، چاہے جماعت کی نماز اور فرض ترک ہوجاوے۔

علی ہذا بعضے نوافل کے بڑے پابند ہوتے ہیں اور جماعت اور فرائض کا اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ ایک ہزار نوافل کا بھی وہ ثواب نہیں جو ایک فرض نماز کا ہے، اسی طرح رمضان کے ایک روزہ کے برابر تمام عمر کے نفل روزے نہیں ہوسکتے، اس سے مقصود نوافل سے منع کرنا نہیں؛ بلکہ منشا فرائض کے عدم اہتمام کے ناقابل تلافی بالنوافل نقصان کو بیان کرنا ہے۔

غرض! ان سب باتوں کے مخاطب مولوی بھی اسی طرح ہیں، جیسے دوسرے (ان کو پرست کُش ہونا چاہیے، نہ کہ دست کُش، ان کو اپنے نفس سے محاسبہ اور ہر شے میں انصاف طلب کرتے رہنا ضروری ہے) بلکہ وہ اولا مخاطب ہیں بہ وجہ اہل علم وفہم ہونے کے، ارشاد باری ہے: ﴿اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ

لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴿۱۶۹﴾ [الأعراف] کہ بڑے بے وقوف، بے عقل ہیں، چوں کہ عمل نہ کرنا بے عقلی و بے وقوفی ہے۔

برا نہ ماننا! کیا مجھے یہ باتیں درس میں کہنا ضروری نہیں؟ بالکل ضروری بلکہ فرض ہیں، اس لیے کہ وعظ میں تو کہتا نہیں، چپ بیٹھا رہتا ہوں، اگر اب بھی نہ بتلاؤں تو آپ کو کیسے معلوم ہو۔

مِنَ الاِقْتَارِ کی قید کا فائدہ

تو انفاق کی بات چل رہی تھی، مِنَ الاِقْتَارِ کی قید لگا کر گویا یوں فرماتے ہیں کہ جب تنگی خرچ کرنے سے مانع نہیں، اہل وعیال، ضیف، مسافر، سائل وغیرہ کے حقوق العباد کی ادائیگی میں تنگ دستی میں بھی کوتاہی نہیں تو زکوۃ، فطرہ، قربانی، کفارات، نذور جو حقوق اللہ ہیں ان میں کیسے کوتاہی کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ایسا صاحب اخلاق ہے کہ عدم وجوب میں بھی مستحب حقوق العباد کا پابند ہے تو حقوق اللہ کا تو بطریق اولی لحاظ رکھے گا تو ان تینوں چیزوں: انصاف واقتار وافشائے سلام کا جامع پورا مسلمان اور پورا مطیع فرماں بردار مؤمن ہے۔

پس امام بخاریؒ گویا یوں فرمارہے ہیں کہ اے شاگردو! اے بچو! اے طلبہ کی جماعت! اپنے کو جانچو! اپنے اخلاق، اعمال، اقوال، احوال کا جائزہ لو! اور پہچانو کہ تم مسلم ہو یا مستسلم، اگر اسلامی اخلاق واعمال میں کمال ہوگا تو مسلم اور کمی ہوگی تو حسب کمی صاحب استسلام اور مستسلم ہوگے، لہٰذا اب سے اسلامِ حقیقی کا ہر وقت لحاظ رکھنے کا عزم اور عہد کرلو اور جانچتے اور جائزہ لیتے رہو، ہمہ وقت عمل جاری رکھو!۔

اس حدیث شریف میں حسنِ معاشرت اور درستئ تمدن کی نہایت جامع تعلیم ہے، اگر معانی حدیث کا استحضار رکھ کر زندگی گذاری جائے تو تمدن ومعاشرت کو

خراب کرنے والی چیزیں اور باہم اتفاق ومحبت کوقطع کرنے والی باتیں سب ختم ہوجائیں۔ اور آپس کا رہن سہن بہت عمدہ، راحت واطمینان پیدا کرنے والا بن جائے اور اتفاق واتحاد کا داعی ہوجائے۔

پس اے مرجیہ! بلا اعمال ایمان کیسے کامل ہوسکتا ہے؟ دیکھو! ان اعمال کی تکمیل سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، تم کیا کہتے ہو کہ اعمال کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں؟ مؤثریت متاثریت ضروری ہے کہ یہ حدیثی علامات اپنے اندر پیدا کرو کہ انہیں سے سچے اور کچے کی پہچان ہوا کرتی ہے۔

بفضلہٖ تعالیٰ اب حدیث کی سب توضیحات بیان ہوچکیں آپ کو چاہیے کہ تہیہ اور عزم والے بن جاؤ کہ اپنے اندر حقیقی اسلام پیدا کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَاۤ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

الدرس التاسع والثلاثون

بَابُ كُفْرَانِ العَشِيرِ، وَكُفْرٍ دُونَ كُفْرٍ

فِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ

۲۸: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ أُرِيتُ النَّارَ فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ، يَكْفُرْنَ« قِيلَ :أَيَكْفُرْنَ بِاللَّهِ؟ قَالَ:" يَكْفُرْنَ العَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ الإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ، ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا، قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ"

ترجمۂ باب وحدیث قراءت فرما کر ترجمہ فرمایا پھر فرمایا:

بابِ ہٰذا کو ماقبل سے ربط

یہ باب ہے، اس کو ماقبل سے کیا ربط ہے؟ تو بڑا مضبوط ربط ہے، اس طرح کہ اب تک امام بخاریؒ نے اثباتِ مدعا میں بابِ سابق تک طریق مثبت اختیار فرمایا، اب یہاں سے طریق منفی اختیار فرمارہے ہیں، اثباتِ دعوی کے دو ہی پہلو اور طریق ہوتے ہیں: ایک مثبت اور وہ اولی ہے، اس لیے اول اس کو اختیار فرمایا، دوسرا منفی، اس کو بعد میں اختیار فرمایا۔

قاعدہ ہے کہ جو شئے بسیط ہوتی ہے، اس کی بس ماہیت بیان کردینے پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور جو شئے مرکب ہوتی ہے، وہ چوں کہ ذو اجزا ہوتی ہے، اس لیے پہلے فرداً فرداً ہر ایک کے خواص واثرات بیان کیے جاتے ہیں، اس کے بعد اس شئے مرکب کو بیان کیا جاتا ہے، اس سے اہمیت بڑھ جاتی ہے اور واقع فی النفس ہوتا ہے کہ جب اس کے اجزاء یہ الگ الگ خصوصیات اور تاثیرات رکھتے

ہیں تو مرکب کا کیا عالم ہوگا۔

جیسے خمیرہ گاؤ زبان مرکب ہوتا ہے، تقریباً پندرہ اجزاء ہوتے ہیں، عنبر وغیرہ بھی اس میں ہوتا ہے لیکن جو جزء غالب ہوتا ہے، اسی کے نام کے ساتھ مرکب کا نام رکھ دیا جاتا ہے، سب اجزاء کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اور مقدارات میں بھی تفاوت ہوتا ہے، چنانچہ کسی جزء کی مقدار کم کسی کی زیادہ، کسی کا مزاج حار، کسی کا بارد، کسی کا معتدل۔ پس مرکب کا مزاج بھی کبھی حار، کبھی بارد اور کبھی معتدل ہوتا ہے۔

ماء اللحم بھی اسی طرح حار بھی ہوتا ہے، کبھی بارد اور کبھی معتدل ہوتا ہے، یہ نہیں کہ ہمیشہ حار ہی ہو۔ اور ماء اللحم کے نام کے الفاظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف گوشت ہی ہوتا ہے، نہیں! بلکہ اس میں اور بھی ادویات ہوتی ہے۔

اسی طرح یہاں ایمان مرکب ہے، اب تک اس کے اجزاء کا بیان تھا: کہیں اطعام الطعام، کہیں افشاء السلام، کہیں الزکوۃ وغیرہ وغیرہ کو بیان فرمایا تھا پھر کہیں کسی کے ساتھ من الاسلام، کہیں من الایمان کا عنوان اختیار فرمایا تھا اتباع حدیث میں کہ جب اور جو لفظ جس جگہ اور جس بارے میں حدیث میں مذکور تھا امام بخاریؒ نے بھی وہی لفظ اتباع حدیث کی وجہ سے اختیار فرمایا۔

غرض! اب تک بطریق مثبت قوت وضعف ایمان حسبِ اعمالِ اسلام من حیث التکمیل والتزئین بیان فرماتے چلے آئے۔ اب دوسرا طریق تضاعف وتناقص ایمان کا (جو کہ منفی طریق ہے) اس کو اختیار فرماتے ہیں، بہ قاعدہ: **الْأَشْيَاءُ تُعْرَفُ بِأَضْدَادِهَا**(۱)۔

(۱) یہ ایک مشہور ومعروف قاعدہ ہے، علماء وفقہاء اس کو اپنی کتابوں میں بیان کرتے رہتے ہیں، جیسے صاحبِ بحر ایک جگہ فرماتے ہیں: وَالْفَرْقُ أَنَّ النَّفْيَ مُعْتَبَرٌ بِالْإِثْبَاتِ؛ لِأَنَّ الْأَشْيَاءَ تُعْرَفُ بِأَضْدَادِهَا. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۳۸۸/۴) اسی طرح الفاظِ مفردہ کے ساتھ بھی یہ قاعدہ کثرت سے مستعمل ہے، کہا جاتا ہے: الشَّيْءُ يُعْرَفُ بِضِدِّهِ۔

ایمان کی معرفت اس کی ضد کفر سے

گویا فرمارہے ہیں کہ اے مرجیہ! اگر تم کو طریق مثبت پر قناعت نہیں ہوئی اور سمجھ میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو میں اب دوسرے طریق سے سمجھانا چاہتا ہوں؛ تا کہ معرفت اضداد سے (جو کہ کفر ہے، اس کے سمجھ لینے سے) حقیقت واضح ہو جائے ، جیسے نور کا ادراک ظلمت کے ادراک کے بعد، نہار کی انفعیت لیل کی شناسائی کے بعد بہت خوب اور کامل ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح یہاں ایمان کی ضد کفر ہے اور کفر کلی مشکک ہے، اس کے افراد میں بہت تفاوت ہوتا ہے، صورت اور حکم میں مختلف، حقیقت متحد اور ایک ہوتی ہے ۔ جیسے کوا، توا، بھینس سب کالے رنگ والے ہیں مگر کالا پن الگ الگ ہے، قوت وضعف میں یکساں نہیں، درجات مختلف ہیں۔

کفر اور اس کی اقسامِ اربعہ

اسی طرح کفر ہے، اس کے معنی ستر کے ہیں، اس کی چار قسمیں ہیں، اس لیے کہ یا تو ستر جحود کے ساتھ ہوگا کہ دل میں یقین سے جانتا ہے مگر پھر زبان سے انکار کرتا ہے، یا یہ کہ انکار کے ساتھ ہوگا کہ قلب وزبان دونوں سے انکار ہے، یا یہ کہ نفاق کے ساتھ ہوگا کہ زبان سے اقرار دل سے انکار یا عناد کے ساتھ ہوگا، ان چار قسموں پر کفر کا اطلاق حقیقۃً ہوگا(۱)۔

ان کے علاوہ اور جگہ ترشح کے اعتبار و حیثیت سے ہوگا یعنی بعض اعمال کفر کے ساتھ تشابہ رکھتے ہیں کہ ان میں سے کسی کا ارتکاب کرنے والے کو دیکھنے والا حقائق کفر محسوس کرنے لگے، ان کی صورت امورِ کفر کے ہم شکل ہے، اس لیے ان پر کفر

(۱) وتحقيق ذلك ما قاله الأزهري:الكفر بالله أنواع :إنكار، وجحود، وعناد، ونفاق. وهذه الأربعة من لقى الله تعالى بواحد منها لم يغفر له.(عمدة القاری : ۲۰۰/۱)

کا حکم کر دیا جاتا ہے، مگر محقق کے حکم کفر میں اور غیر محقق کے حکم کفر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، غیر محقق حقیقی کفر کا اطلاق کر دیتا ہے، اور محقق غیر حقیقی کفر کا، جیسے: ''مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ'' (۱)۔ اس حدیث میں تارک صلوٰۃ پر کفر کا اطلاق کیا گیا مگر یہ کفر حقیقی نہیں، تاہم اس فعل ترکِ نماز سے کفر مترشح ہے۔

اسی طرح آیت ﴿ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ ﴾ [الروم : ۳۱] میں ارشاد ہے: نماز کی پابندی کرو اور (نماز چھوڑ کر) مشرکوں میں سے مت ہو جاؤ، یہاں شرک کا اطلاق کیا گیا مگر وہی ترشح کفر کے اعتبار سے ہے۔

نادان اور ناواقف اس کو حقیقت شرک سمجھتا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں اور اگر کوئی کہے کہ حقیقت شرک ہے تو اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھ لے کہ اس کی نماز چھوٹ جاتی ہے یا نہیں! اور جو چھوٹ چکی، وہ ادا کی ہے یا نہیں، پندرہ سال کی عمر سے اب تک غور کرے، دیکھے، شاید ہی کوئی نکلے گا جس کے ذمہ کوئی نماز باقی نہ ہو اور جب ایسے ہیں اور اکثر ایسے ہی ہیں تو اب معلوم ہو جائے گا کہ کیسے نمازی اور کیسے مسلمان ہیں اور صاحب ایمان ہیں۔

معلوم ہوا کہ کفر کے درجات ہیں، انھیں درجات و اجزاء کفر پر حقیقۃً مجازاً کفر کا اطلاق کیا جاتا ہے، بعض اجزاء مانع دخول جنت ہوں، جنت کا ملنا ممتنع ہو جائے گا، بعضے ایسے ہیں کہ جنت میں دخولِ اول سے مانع ہوں گے، جہنم میں جانے کے سبب ہوں گے مگر خلودِ نار ان کا سبب نہ ہوں گے، اسی طرح اس کے

(۱) امام طبرانیؒ نے یہ حدیث المعجم الاوسط میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا۔ بہت سے علماء اس کو ''جِهَارًا' کے بغیر بھی نقل کرتے ہیں، امام زیلعیؒ ''تخريج أحاديث الكشاف'' میں فرماتے ہیں: قلت رَوَاهُ بِهَذَا اللَّفْظِ الْبَزَّار فِي مُسْنده من حَدِيث رَاشد الْحمانِي عَن شهر ابْن حَوْشَب عَن أم الدَّرْدَاء عَن أبي الدَّرْدَاء قَالَ أَوْصَانِي أَبُو الْقَاسِمِ ﷺ۔ (۱/۳۰۲، الحَدِيث الثَّامِنِ وَالْعِشْرُونَ) اور بھی کافی طویل کلام کیا ہے۔

مقابل اجزائے ایمان اور اعمالِ ایمان ہیں کہ بعض وہ ہوں گے جو مانع دخول جہنم ہوں گے، جہنم کو ممتنع اور حرام کردیں گے۔

مرجیہ کے خلاف لطیف استدلال

تو اب تک امام بخاریؒ نے بطریق مثبت فرمایا تھا کہ فلاں فلاں اعمال ایمان اور اسلام کے ہیں یعنی باعث دخولِ جنت مانع خلودِ نار ہیں اور فلاں فلاں اعمال ودرجاتِ ایمان مانع دخول نار ہیں، اب یہاں بطریق منفی اور بہ طریقِ تلازم بہ علاقۂ ضدیت یہ ثابت فرمارہے ہیں کہ فلاں فلاں اعمالِ کفر مانع دخولِ جنت وباعث دخولِ نار ہیں اور فلاں فلاں درجاتِ کفر باعث خلودِ نار ہیں، لہٰذا اس کے برخلاف اور ان کے اضداد اعمالِ ایمان میں دخل رکھتے ہیں اور باعث دخولِ جنت، مانع خلودِ نار ہیں۔

پس اے مرجیہ تمہارا یہ کہنا کہ اعمال کو ایمان میں کوئی دخل نہیں، محض لغو اور سراسر غلط ہے۔ دیکھو! اس حدیث سے بھی معلوم ہورہا ہے کہ اعمال کو کمالاً یا زوالاً ایمان میں بہت دخل ہے، اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے کفر کے سبب عورتوں کا جہنم میں زیادہ ہونا بیان فرمایا تو ذہن اس طرف صحابہؓ کا منتقل ہوا کہ شاید ان کا جہنم سے خروج ونجات نہ ہو اور حصولِ جنت ممتنع ہو تو سوال کیا: ”أَيَكْفُرْنَ بِاللهِ“؟ کہ کیا وہ کفر کے اس درجے پر اور اس نوعِ کفر پر تھیں کہ کبھی نجات نہ پاسکیں گی؟ جواب میں ارشاد فرمایا نہیں، ”يَكْفُرْنَ العَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ الإِحْسَانَ“: کفر عشیر اور کفر احسان کی مرتکب ہونے کے باعث گویا یوں فرمادیا کہ ان کا کفر اس درجہ کا ہے کہ جنت کے دخول اولی سے مانع ہوگیا اور باعث ہوگیا دخولِ جہنم کا، گو خلودِ نار کا باعث نہ ہو۔

عشیر کا معنی اور عورتوں کے بارے میں اہل دورِ جدید کی گھٹیا سوچ

جب یہ بات ذہن نشیں ہوگئی تو اب لفظ **العَشِیرُ** کے معنی سمجھئے: عشیر، ذمہ دار عشرت یعنی زوجہ (عورت) کی عشرت، اس کی ضروریاتِ زندگی کو فراہم کر کے اس کی زندگی بہ اطمینان کر دینا۔ یہ زوج کی ذمہ داری ہے۔ آج اہل تمدنِ جدید کی طرح نہیں کہ عورتوں کو اس لیے اسکول کی تعلیم دلائی جاتی ہے اور پردہ اس لیے توڑا جاتا ہے، بی، اے، (B.A.) ایم، اے (M.A.) کی تعلیم کراتے ہیں؛ تا کہ پڑھ کر کوئی ڈاکٹرنی بنے، کوئی سفیر ملک بنے، کوئی لکچرار (Lecturer) اور ملازمِ دفتر بنے اور شوہر و بیوی دونوں کمائیں، اس عورت کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں، عورت اپنی ضروریات کا بوجھ اپنے سر رکھے۔

عورتوں سے لیے جانے والے کاموں نے ان کی شرم وحیا کو ختم کر دیا ہے

جب سفیر و ڈاکٹرنی ہوئی تو پردہ کہاں، لہٰذا اٹھا دو بلکہ پہلے ہی تحصیل و تعلم میں ہی اٹھا دیا کہ مانع و حارج ہے مقصد کی تحصیل و تکمیل میں، اسی طرح اہل دیہات عورتوں سے کمانے کی خدمات لیتے ہیں، میاں ہل چلا رہا ہے، بیوی پانی لا رہی ہے، کھانا لے جا رہی ہے، روٹی سر پر ہے، بچہ گود میں، گھونگھٹ کیے جا رہی ہے، بے چاری کی اچھی عشرانہ زندگی گذر رہی ہے۔

حتی کہ ایک شخص سنا رہے تھے کہ وہ ایک دفعہ پیدل کسی جگہ جا رہے تھے، ایک حاملہ عورت گٹھر لیے جا رہی تھی کہ اچانک وہ بیٹھ گئی، بچہ پیدا ہوگیا، اس نے

اپنے کپڑے پھاڑ توڑ کر بچہ کو صاف کر کے کپڑے میں لپیٹ کر بغل میں گود میں کیا اور ان کو بلا کر گٹھر اٹھوانے کو کہا، اتنا وزنی گٹھر تھا کہ باوجود اس کے کہ یہ شخص نوجوان تھا اور دونوں ہاتھوں سے اٹھا رہا تھا، پھر بھی جب نہ اٹھا تو گھٹنے کا سہارا لگانا پڑا، جب بہ مشکل اس عورت کے سر پر رکھا یا اور اس عورت نے اپنی طرف سے ایک ہی ہاتھ سے اٹھالیا اور ایسا معلوم ہوا کہ اس نے آسانی سے اٹھالیا۔ ایسی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔

ایک ہمارے یہاں بچہ پیدا ہونے سے کئی گھنٹے تو چیخیں گی پھر بچہ پیدا ہوجانے کے بعد کئی روز اُونگھے گی اور وہ عورت بھاری پیٹ لیے باہر کام کرتی بوجھ اٹھاتی پھر رہی ہے، وہیں جنگل ہی میں جن بھی رہی ہے، اس کو کہیں شرم، جھجھک کچھ نہیں ہورہی۔ بات یہ کہ اس کے مرد نے اس سے ایسے ایسے کام لیے کہ اس کی شرم حیاء سب ختم کردی۔

عورتیں اور احسان فراموشی

''وَيَكْفُرْنَ الإِحْسَانَ'': احسان کا انکار کر دیتی ہیں، اسی طرح اگر کوئی محسن خواہ باپ ہو یا غیر باپ ہو کر تربیت کر رہا ہے، احسانات پر احسانات کر رہا ہے، اس کی ساری مانگیں پوری کرتا ہے، ناز نخرے سب برداشت کرتا ہے، بہت خیال کرتا اور سہولتیں پہنچاتا رہتا ہے، ضرورتیں پوری کرتا رہتا ہے، بہ ایں ہمہ ذرا سی خلافِ طبع بات پر کشیدگی کرلیتا اور کئے کرائے کو رد وانکار کر دیتا ہے، مرد ہو کر عورتوں کی طرح ناشکری، ناقدری، بے وفائی کرتا ہے۔ دیکھو خبردار! احسان مند رہنا، احسان فراموش نہ ہونا۔

کفرانِ عشیر کے کفر دون کفر ہونے کی توضیح

تو آپ نے اس پر کفر کرنا فرمایا یعنی اس سے کفر ٹپک رہا ہے، کم ہے اس

سے یعنی حقیقی کفر سے ، یہ کفر کلی مشکک ہے، ایسے ہی ایمان کلی مشکک ہے تو یَکْفُرْنَ الْعَشِیر میں صورۃً کفر ہے، حقیقۃً نہیں مگر یہ بھی سخت مضر چیز ہے کہ مستحق نار، باعث دخولِ نار ہو سکتا ہے، گو باعث خلود اور مانع دخولِ جنت نہ ہو مگر مانع دخولِ اولی فی الجنۃ ہوسکتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ کفرانِ نعمت ہے۔

ایسی چیزوں اور ایسے موقعوں پر کفر کے اطلاق کی مثال حضرت تھانویؒ نے یہ بیان فرمائی کہ جیسے بچے کو میلا کچیلا اور گندا دیکھ کر چمار کہہ دیں کہ تو تو چمار ہی ہو گیا، یہ مشابہت میں محاورہ ہے، ایسے مؤمن کو غیر ایمانی افعال دیکھتے ہوئے کفر کا اطلاق کر دیا اور کافر کہہ دیا، مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے ظاہر سے چماریت مترشح ہو ہی ہے، چہرہ و کپڑوں کے گندا اور بدبو دار وخراب ہونے کی وجہ سے یا کسی کے سفید کپڑوں میں داغ دھبے تیل کے پڑ جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ تیلی ہو گیا۔ اسی طرح کفر کیا یعنی کفر کے مشابہ ہو گیا کفر ظاہر سے ٹپکنے لگا۔

شوہر کی ناشکری کفر کیسے ہے؟

"لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ، ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا، قَالَتْ:مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ": اچھی طرح احسان کرتے کرتے، راحت وآرام پہنچاتے پہنچاتے، حتی کہ دوسری حدیث میں ہے کہ زمین بھر سونا بھی دے دو اور پھر کوئی خلاف طبع ناگواری دیکھے تو کہہ دے گی کہ میں نے اس شوہر کے گھر میں دیکھا ہی کیا ہے! جب سے اس گھر آئی، مصیبت اور تکلیف ہی دیکھی، ماں باپ نے میری قسمت پھوڑی، میرے لیے یہاں کیا دیکھا تھا؟ کچھ نہیں دیکھا، بس یوں ہی منھ پھونک دیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کفر کے اطلاق سے حقیقت کفر کی نہ تھی۔ چوں کہ انھوں نے کفر کا کلمہ کوئی نہ کہا تھا۔ بس مطلب یہ ہی تھا کہ مؤمنہ ہو کر احسان کا یہ بدلہ!۔

کفرانِ نعمت یہ تو کافر کا کام ہوتا ہے کہ خدا تعالی کی بھر پور نعمتوں کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتا، احسان نہیں مانتا، خدا کی عظمت ومحبت کا معترف نہیں ہوتا۔ اس کافر کی طرح اس عورت نے بھی شوہر کے احسانات نہیں مانے، یہ اس کافر کے ساتھ تشابہ ہو گیا، دونوں پر الگ الگ حیثیت سے اطلاق ہوا۔ یہ کفر کے مراتب نکلے: کفرِ اشد، شدید، اقوی، قوی، ضعیف، اضعف۔

تو اے مرجیہ! اس طریق منفی سے بھی ثابت ہو گیا، ضدیت کی وجہ سے کفر میں مراتب ودرجات نکلنا مستلزم ہے اس کی ضد ایمان میں درجات نکلنے کو اور مراتب ثابت ہونے کو اور جب ایمان میں مراتب نکلے تو ایمان بھی اقوی، قوی، اکمل، کامل، ناقص، انقص ہوگا اور یہ اعمال کے اعتبار سے ہے تو اعمال کا ایمان میں دخیل ہونا ثابت ہو گیا، آگے اسی سلسلۂ طریق کے تین باب یا بعض نسخۂ بخاری کے اعتبار سے چار ہیں، زندگی بخیر رہی تو ان شاء اللہ کل ان کے متعلق عرض کیا جائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس الأربعون

بَابٌ :المَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الجَاهِلِيَّةِ، وَلاَ يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا إِلَّا بِالشِّرْكِ

لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ :إِنَّك امْرُؤٌ فِيك جَاهِلِيَّةٌ وَقَوْلِ اللهِ تَعَالَى:{إِنَّ اللهَ لاَ يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِك لِمَنْ يَشَاءُ} [النساء :۴۸]

۳۰:حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ:حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ وَاصِلٍ الأَحْدَبِ، عَنِ المَعْرُورِ بْنِ سُوَيْدٍ، قَالَ :لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ، وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ، وَعَلَى غُلاَمِهِ حُلَّةٌ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِك، فَقَالَ:إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ، فَقَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّك امْرُؤٌ فِيك جَاهِلِيَّةٌ، إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ.

ترجمۃ باب کا اردو میں ترجمہ کرنے کے بعد فرمایا:

ترجمۃ الباب کی وضاحت

اور مرجیہ، خوارج ومعتزلہ پر طریقۂ رد

اس ترجمہ سے مرجیہ کے ساتھ معتزلہ وخوارج کا بھی رد مقصود ہے، چوں کہ بابِ سابق سے خوارج ومعتزلہ کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ آپ نے معاصی اعمال پر کفر کا اطلاق کیا ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اعمالِ معاصی سے کفر ہوجاتا ہے تو آپ کی طرح ہم نے بھی اطلاق کیا ہے، ہم نے ہی کیا بے جا کام

کر دیا؟ ایک عنوان تقریر تو یہ ہے۔

دوسرا عنوان یہ ہے کہ کہا جائے کہ یہ ترجمۂ باب دفع دخل مقدر ہے کہ سابق باب سے اعتراض ہوتا تھا کہ اس باب سے جو مذہب ومسلک ثابت ہوا کہ ارتکاب معصیت پر حکم کفر کیا گیا، وہی معتزلہ وخوارج کا مذہب ہے تو احادیث سے ان کے مذہب کا حق ہونا ثابت ہو گیا، حالاں کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ان کا مذہب حق اور صحیح نہیں، اس اعتراض بماسبق کو رفع کرنے کے لیے امام بخاریؒ نے یہ باب منعقد فرمایا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اوپر کی تقریر والے اس شبہ واعتراض کی گنجائش نہیں، چاہیے تھا کہ اعتراض وشبہ پیدا ہی نہ ہوتا یا پیدا ہوتے ہی فوراً ختم ہو جاتا۔ چوں کہ حدیث میں کفر مابعد کی صراحتاً نفی مذکور ہے، علاوہ ازیں مزید تاکید کے ساتھ اس باب کے ذریعہ وہ اعتراض ’’ھباء منثورا‘‘ ہو جاتا ہے، اس طور سے کہ آیات واحادیث کی روشنی میں تین تراجم وعنوانات قائم فرمائے ہیں۔ گویا یوں فرماتے ہیں کہ ہم دعوی کرتے ہیں کہ ’’المَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الجَاهِلِيَّةِ‘‘ کہ معاصی کفری زمانہ کی باتوں میں سے ہیں۔ یہ ترجمہ اس لیے کیا کہ زمانۂ جاہلیت کا اطلاق کفر کے زمانہ پر ہوتا ہے، چوں کہ آپ ﷺ کے زمانہ سے قبل مختلف معاصی کا دور تھا کہ جہل مقتضی ہر برائی ہے۔ تو ان کے مختلف ارتکابات کو بیان کرنے کے بہ جائے ایک جامع لفظ زمانۂ جاہلیت سے تعبیر فرمایا ہے۔

ہر برائی کا منشا جہل ہے

ہر برائی کا منشا جہل ہے، اگر چہ کسی عالم سے صدور ہوا اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، آپ کی مختصر میں ہے، علامہ تفتازانیؒ فرما رہے ہیں: وقد ینزل

العالم بمنزلة الجاهل (۱) ،مثلاً کہا جائے نماز سے غفلت کے وقت کہ مولانا! نماز فرض ہے یا اور کسی ناشائستہ فعل پر کہ مولانا یہ حرکت بڑی سخت معصیت ہے، یا کہا جائے: لا حَولَ و لا قُوَّةَ إلاّ بالله! ٹخنوں سے نیچا پائجامہ!، یہ شکل کہ داڑھی خش خشی ہے، داڑھی تو یک مشت فرض ہے۔ تو دیکھیے! مولانا بھی کہہ رہے ہیں اور مثل جاہل مخاطب کے ان کو خطاب بھی کیا جا رہا ہے، چوں کہ حرکات جاہل کی تھیں، اس لیے اس کو بہ منزلہ جاہل کر کے خطاب کیا، یہ تنزیل العالم بمنزلۃ الجاہل ہوا۔ یہ اطلاق بالکل صحیح ہے اور یہ میری ہی رائے نہیں، آپ کی کتابیں فرما رہی ہیں۔ آج کل وکیلوں کو بھی مولانا کہہ دیا جاتا ہے۔

تو چوں کہ زمانۂ قبل نبوت انسانیت گم کر چکا تھا، محض طبعی تقاضوں کو شد و مد سے پورا کیا جاتا تھا، حیوانیت زور پر تھی، اس لیے نفسانیت وشیطانیت کا دورہ تھا، زمانہ گوناگوں معاصی اور شرور سے پُر تھا، اس لیے اس پر زمانۂ جاہلیت کا اطلاق بالکل صحیح اور بجا ہوا۔ لہٰذا اب جس مؤمن سے معاصی کا صدور ہو، اس میں کفری بات ہو گی لیکن جیسے کافر میں خلق حسن کے ظہور سے وہ مؤمن نہیں ہوتا، اسی طرح مؤمن کفری بات کے ظہور و صدور سے کافر نہیں ہوتا۔

ایمان کے دو پہلو اور آج کا مسلمان

مثلاً جود و سخا، عفو و کرم جیسے اخلاقِ حسنہ اوصافِ ایمان سے ہیں، چوں کہ جس طرح دوسری تمام چیزوں کے دو پہلو ہوتے ہیں، اسی طرح ایمان کے بھی دو پہلو ہیں : ایک ظاہر، ایک باطن۔ نماز، زکوٰۃ وغیرہ ایمان کا ظاہر ہیں اور تہذیب

(۱) أوتنزيله أى لتنزيل المخاطب العالم بوقوع الشرط منزلة الجاهل: لمخالفته مقتضى العلم كقولك لمن يؤذى أباه: إن كان أباك فلا تؤذه. (مختصر المعانى للتفتازانى، ص ۷۳، مطبع القيومى كانفور)

اخلاق، تزکیۂ نفس ایمان کا باطن ہے، اب اپنے ایمان کو ذرا ہمیں جانچنا چاہیے کہ دونوں پہلوؤں سے مکمل ہے یا ایک پہلو پر بس کیے ہوئے ہیں اور نقصانِ ایمان کے باوجود بے فکر رہتے ہیں۔ ذرا سے تأمل اور غور سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم میں صرف ظاہر ہے، وہ بھی ناقص اور باطن ایمان وتزکیۂ نفس سے ہم بالکل خالی ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

افسوس در افسوس ہے کہ ہم آج مولوی بھی کہلاتے ہیں اور تزکیۂ نفس سے بہت دور ہیں، حالاں کہ قرآنِ پاک اور حدیث شریف سے اس کا اہم واعظم ہونا اور تاکید کے ساتھ اس کی ترغیب وترہیب معلوم ہوتی ہے اور اس کا بار بار حکم کیا جارہا ہے، چنانچہ سورۃ الشّمس میں ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ اور سورۃ الاعلی میں ارشاد ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾ مگر ہمارے اندر نہ ذکر ہی ہے اور نہ تزکیۂ نفس، ہاں نماز کی کچھ بھاگ دوڑ کر لیتے ہیں۔

تو جود وکرم تہذیب اخلاق سے ہے سب کے ساتھ، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جود وکرم کے ساتھ پیش آئے۔ اس کو جیسے مسلم ومؤمن کرتا ہے، اسی طرح ایک کافر بھی یہ کام کرتا ہے، مثلاً گرمیوں کے موسم میں پیاؤ لگادیتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ بعض کافر چیونٹیوں اور دوسرے جانوروں کو کھانا ڈالتے پھرتے ہیں، صبح کو ہم نے دیکھا ہے لیکن باوجود اس کے وہ کافر ہی رہتا ہے، اسی طرح بخل وصف کفر ہے اور نمونۂ کفر ہے، حدیث شریف میں وارد ہے کہ کفر کے ساتھ بخل اور ایمان کے ساتھ سخاوت پیدا کئے گئے؛ اس لیے ثابت ہوگیا کہ معاصی جاہلیت سے ہیں اور کفر کی باتوں سے ہیں، اس باب سے یہی ثابت کرنا ہے کہ مطلق معصیت سے کفر نہیں ہوتا، اور صاف طریقہ سے فرمادیا: ”وَلَا يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا“ کہ معاصی

کے ارتکاب کے سبب مسلمان کی تکفیر نہیں کی جائے گی، یہ ہمارا دعوی ہے۔

تو "وَلاَ یُکَفَّرُ" میں واؤ تفسیر یہ ہے یا مستأنفہ ہے تو اب دوسرا ترجمہ ہوگا، اس سے خوارج و معتزلہ کا بھی رد ہو گیا کہ اس کو کافر نہیں کہا جائے گا اور مرجیہ کا بھی رد ہو گیا کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ معاصی ایمان پر اثر انداز نہیں، معاصی کے باوجود اس کے ایمان میں نقصان نہیں ہوتا، وہ پورا ہی مؤمن رہتا ہے، اس پر دوسرا ایمان کے خلاف اطلاق نہیں ہوگا، ان پر رد اس طرح ہو گیا کہ دیکھو! معاصی کے ارتکاب سے جاہلیت کے وصف کا اطلاق ہوا، اگر معاصی سے ایمان میں کمی نہیں اور معاصی اثر انداز نہیں تو یہ اطلاق کیسا؟ الحاصل تینوں فرقِ باطلہ : معتزلہ، خوارج ، مرجیہ کے رد میں ترجمہ قائم فرمارہے ہیں۔

"وَلاَ یُکَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِکَابِهَا" کے بعد "إِلَّا بِالشِّرْكِ" کا استثناء فرمایا کہ معصیت سے کافر نہیں کہا جائے گا، البتہ اگر کفر و شرک کی معصیت ہوگی تو الگ بات ہے، ان کے سبب سے کافر اور مشرک کہہ سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ یہ تینوں ترجمے دعوے ہیں، آگے ان پر دلیل بیان فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعوی اور یہ بات میں نے بلا دلیل نہیں کی بلکہ آیت اور حدیث سے کہہ رہا ہوں : "إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ" کہ تم عجیب آدمی ہو! تمھارے اندر اب تک جاہلیت ہے؟ اب تک یہ نہیں گئی؟ کیا نادانوں کی سی جرأت کرتے ہو، جیسے کوئی کافر کرتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ یہ کلمات حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ کو فرمارہے ہیں، جیسے آگے آرہا ہے۔

یہ جلیل القدر صحابی ہیں، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی کچھ بات حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ یا ان ہی کے ایک حبشی غلام سے ہو گئی تھی، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی

عنہ نے ان کو يَا ابْنَ السَّوْدَاءِ کہہ دیا تھا، گویا نسب میں طعن کیا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ طعن کرنا تو کفار کا شیوہ ہے، وہ نسب پر فخر کرتے تھے(۱)۔

تو امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ (جو نہایت اونچے درجے کے مؤمن ہیں) ان کو یہ فرمایا: ''إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّة'' تو یہاں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تو کافر ہے یا تو نے کفر کیا۔

البتہ اس وصف کو بیان فرمادیا جو کفر کے سابقہ جہل کے طور پر ہوتا ہے یعنی طعن کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ طعن برا عمل اور فعل مذموم ہے، اس کے باوجود اس کے ارتکاب پر آں حضرت ﷺ نے لفظ کفر نہیں بولا، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی سیئہ اور نازیبا امر قولی ہو، فعلی ہو، خواہ کفار کے اوصاف ونمونے ہی اپنے اندر آجائیں، پھر بھی کافر نہیں ہوا، ورنہ آپ ضرور تجدید ایمان کے لیے فرماتے، پس اس حدیث سے مرجیہ، خوارج، معتزلہ سب کا رد معلوم ہوگیا، مرجیہ اعمال کے غیر مؤثر فی الایمان کے قائل ہیں یہاں بتلادیا کہ ایمان پر اثر پڑتا ہے کہ صاف شفاف چیز پر معمولی سے چھینٹ بھی نازیبا اور بدنما کردیتی ہے۔ چناں چہ ان کی شان میں اس طعن سے فرق آگیا کہ جاہلیت کا ہونا کفر کی خصلت کا ہونا منافئ ایمان ہونا بتلادیا۔

---

(۱) عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: عَيَّرَ أَبُو ذَرٍّ بِلَالًا بِأُمِّهِ، فَقَالَ: يَا ابْنَ السَّوْدَاءِ، وَإِنَّ بِلَالًا أَتَى رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَخْبَرَهُ فَغَضِبَ، فَجَاءَ أَبُو ذَرٍّ وَلَمْ يَشْعُرْ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: مَا أَعْرَضَكَ عَنِّي إِلَّا شَيْءٌ بَلَغَكَ يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: " أَنْتَ الَّذِي تُعَيِّرُ بِلَالًا بِأُمِّهِ؟ " قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: " وَالَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ عَلَى مُحَمَّدٍ - أَوْ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَحْلِفَ - مَا لِأَحَدٍ عَلَيَّ فَضْلٌ إِلَّا بِعَمَلٍ، إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا كَطَفِّ الصَّاعِ. (شعب الإيمان، فَصْلٌ، وَمِمَّا يَجِبُ حِفْظُ اللِّسَانِ مِنْهُ الْفَخْرُ بِالْآبَاءِ، وَخُصُوصًا بِالْجَاهِلِيَّةِ، وَالتَّعْظِيمِ بِهِمْ، رقم الحديث: ۴۷۷۲)

تحت الباب آیت سے خوارج ومعتزلہ پر رد

دلیل میں آیت پیش فرمادی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ۚ﴾ [النساء:۴۸] کہ اللہ تعالیٰ کفروشرک کے سوا سب چیزوں کی توبہ سے یا بلاتوبہ معافی ومغفرت فرمادیتے ہیں، جیسا چاہیں جس کے لیے چاہیں، تحت المشیت ہے، اس میں رد ہوگیا خوارج ومعتزلہ کا کہ مادون الشرک معاصی میں ایمان باقی رہتا ہے، کفروشرک نہیں آتا، اس لیے اس کی معافی ہوسکتی ہے، پس مرتکب معاصی کافر نہیں۔

مرجیہ کا بھی رد ہے، انھیں بھی خوش ہونے کا موقع نہیں کہ تقاضائے ایمانی باقی نہیں رہا، اب تو مشیت پر معاملہ ہوگیا کہ ایمان میں ضعف آگیا، سہارے کی ضرورت ہوگئی جو کہ وہ مشیت ہے۔

حدیث ابی ذر رضؓ کی تشریح

حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ وَاصِلٍ الأَحْدَبِ، عَنِ المَعْرُورِ بْنِ سُوَيْدٍ، قَالَ: لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ، وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ، وَعَلَى غُلاَمِهِ حُلَّةٌ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ: إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ، فَقَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ، إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللَّهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ۔

ترجمۂ باب میں "إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ" جو جملہ تھا، حدیث کا ایک ٹکڑا تھا، اب وہ پوری حدیث گویا اس جملے کی تفسیر وتفصیل کے لیے لارہے ہیں۔

حُلَّةٌ: کرتہ وچادر کے جوڑے کو کہتے ہیں۔ "عَلَيْهِ حُلَّةٌ، وَعَلَى غُلاَمِهِ حُلَّةٌ"

یعنی دونوں (کے حلے) ایک قیمت ورنگ کے تھے یا مختلف تھے، تب بھی فی الجملہ برابری ہوئی۔ ''**فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ**'': میں نے کہا کہ یہ برابری کیسی؟ کہا : ''**إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ**'': کیا بتلاؤں، ایک دفعہ یہ واقعہ ہوا تھا، آپ نے یوں ارشاد فرمایا تھا: ''**يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ، إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ**'': حاصل یہ کہ اللہ تعالی نے غلاموں کو تمہارے قبضہ میں کر دیا مگر یہ طریقہ ٹھیک نہیں کہ طعن کرو بلکہ ان کے حقوق کا خیال رکھو۔

حضرت محمد مصطفے ﷺ کے اس خطاب بہ ابی ذرؓ کا مطلب یہ تھا کہ تم خوب پہنتے ہو اور ان کو ننگا رکھو، ایسا نہ کرو کہ کرتا پہنا دو، ٹوپی نہ پہناؤ، نیز ایسا نہ کرو کہ کھانا تیا کرا کے خود کھا جاؤ بلکہ خود جب کھاؤ تو اس کو بھی شریک کرلو، کچھ حصہ اس کو بھی دے دو، آقا اور غلام میں تساوی حقیقی اور من جمیع الوجوہ حدیث کی ہرگز مراد نہ تھی مگر حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ نے تاویل نہیں فرمائی، اس کے ظاہر پر ہی عمل فرمایا، اس لیے جوڑا اور کھانا وغیرہ برابر رکھا۔

آگے فرمایا: ''**وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ**'' کہ ان کو سہارا دینا اور زیادہ مشقت ان پر نہ ڈالنا ایسا کہ وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا یا اٹھا توسکتا ہے مگر سہارے کی ضرورت ہوگی تو ایسے اتفاقی امر میں ان کی مدد کرنا، ان کا ہاتھ بٹانا، مثلاً مسیح اللہ نے کسی طالب علم کو کھودنے کو کہہ دیا تھا تو مسیح اللہ خود بھی کھود کر دکھائے۔

پھر محکوم ملازم اور ماتحت دونوں کے درمیان فرق ہے، آج جو ماتحت کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں، وہ جائز نہیں، مثلاً مدرسین میرے ملازمین نہیں، جس طرح میں قوم کا خادم ہوں، وہ بھی قوم کے خادم ہیں، یہ الگ بات ہے کہ افسریت وماتحتیت کا فرق ہے، اگر یہ نہ ہو تو بدنظمی ہوجائے مگر اساتذہ سب برابر

ہیں، بڑی کتب کا مدرس چھوٹی کتب کے مدرس پر تیز ہونے لگے اور اینٹھنے لگے، ہرگز اس کو یہ حق نہیں، چھوٹی کتب کا مدرس اس کا ماتحت نہیں، ملازم نہیں، پھر تیزی اور اکڑ کیسی یہ تجاوز عن الشرع ہے۔

الحاصل اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے سب وشتم وطعن پر کفر کا بہ ضمن جاہلیت مجازاً اطلاق فرمایا، جیسے عورتوں پر خاوند کی ناشکری پر کفر کا اطلاق فرمادیا تھا۔ احسان کا شکریہ ترک کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اس سے متعدد مسائل معلوم ہوتے ہیں کہ اپنے میاں کا کفران اور احسان فراموشی کی، معلوم ہوا کہ احسان ماننا ضروری ہے، چہ جائے کہ مقابلہ اور برابری اور درپۂ ضرر ہو اور محسن کی غیبت، اس پر تہمت کشی یہ انتہائی بڑا گناہ ہے جہنم میں ٹھکانا بنانا ہے۔

حدیث مذکور سے معتزلہ، خوارج، مرجیہ کے خلاف احتجاج

مقصود امام بخاریؒ کا اس حدیث سے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس لقب سے اس حرکت کا نازیبا ہونا بتلادیا، معصیت ہونا بتلادیا لیکن اس سے کافر ہونا نہیں فرمایا، پس یہ حدیث ہماری دلیل ہے، معتزلہ، خوارج، مرجیہ کا سب کا رد ہو گیا، بہت خوب صورتی اور نہایت عجیب شان اور دلائل قویہ سے ثابت کردیا کہ معصیت سے کفر نہیں آتا مگر قوی نہیں رہتا، سہارے کا محتاج ہوجاتا ہے، اہل سنت والجماعت کے مذہب کا اہمیت اور اعظمیت کے ساتھ اثبات فرمادیا۔

بَابُ {وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا} [الحجرات: ۹]

تحت الباب آیت پر کلام

ارشاد ہے کہ دو جماعتوں میں چھیڑ اور مقاتلہ واقتتال کی نوبت آجائے، تلوار

چلنے کے قریب ہے تو جلدی صلح کرادو، بات بڑھنے نہ پائے۔ مقصود جھگڑا و فساد کی بندش اور روک تھام ہے، اس لیے اگر دو شخصوں میں بھی جھگڑا ہو جائے تو صلح کرا دینا ضروری ہے، مثلاً حجروں میں کسی دو کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو ہماری ذمہ داری ہے کہ بہت جلد صلح کرادیں، بات کو دبادیں، کہیں آگے نہ پڑھنے پائے۔

افسوس ہے! اب ہمارے اندر صلاحیت نہیں، اب تو دوسروں کی لڑائی دیکھ کر خوش ہوتے اور تماشہ دیکھتے ہیں۔ میرے اس کہنے پر چیں بہ جبیں نہ ہونا، اللہ کے بندو! تمھارے نفع کے لیے کہہ رہا ہوں، یہ ہماری حالت افسوس ناک اور قابل اصلاح ہے یا نہیں؟ یہ کیسی سختی ہمارے طبائع میں آگئی؟ کس قدر جمود ہے؟ خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ ہی معدوم ہو گیا اور حیرت در حیرت ہے کہ سب کچھ آیات و احادیث، پند و نصائح سنتے ہیں، اپنے نفوس کو اعتدال پر لانے کی مطلق فکر نہیں، گویا قسمیں کھا کر بیٹھے ہیں کہ ٹس سے مس نہ ہوں گے، مان کر دیں گے ہی نہیں۔ بالکل اس کا مصداق ہیں : ؎

سن لاکھ تجھ کو کوئی سناوے	کیجیو وہی جو اپنے من کو بھاوے

حالاں کہ اہل حق اور عاقل و خدا ترس مسلمان اور مرد مؤمن کا یہ مشرب و مسلک ہونا ضروری ہے : ؎

سنیے لاکھ گر تجھ کو کئی سناوے	کیجیو وہی جو رب کو تیرے بھاوے

مگر ہمارا حال برعکس ہے کہ جان تو لیتے ہیں مانتے نہیں، گویا جاننا ہی اصل کل ہے، حالاں کہ ایمان محض جاننے کا نام نہیں، ماننا ہی ایمان ہے۔ اب تو عجیب حال ہے کہ ایسی باتیں سننا بھی گوارا نہیں، ایسوں کو چاہیے کہ جب نہیں سننا چاہتے تو کہیں اور جائیں مگر نہیں جاتے تو پھر یوں کیسے کام چلے!، جب یہاں آئے ہیں تو بھائی آنے کا مقصد علم و عمل سے ایمان کی تکمیل ہے، اس کو ہر قدم پر ملحوظ رکھنا اور ایمان کو غور و فکر و نگرانیٔ نفس، محاسبہ اعمال سے درست اور مضبوط کرتے رہنا

ضروری ہے اور اس قسم کی باتیں بتلانے والے کو اپنا حقیقی اور صحیح معنی کر خیر خواہ اعتقاد کرنا اور اس کی تعلیم و تلقین پر اعتماد کرنا، اس کی روک ٹوک کے ساتھ انقیاد واتباع کرنا ضروری ہے۔

تحت الباب مذکورہ آیت سے خوارج، معتزلہ ومرجیہ پر امام بخاریؒ کا رد

فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ: امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ باوجود اقتتال کے اہل قتال کو مؤمنین فرمارہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ارتکابِ معصیت سے مؤمن کافر نہیں ہوتا، یہ تو خوارج ومعتزلہ پر رد ہوا۔

اور اے مرجیہ دیکھو! اصلاح کا حکم فرمارہے ہیں، اصلاح فساد پر واقع ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے ایمان میں بگاڑ آ گیا تھا۔

۲۹: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْمُبَارَكِ، حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ، حَدَّثَنَا أَيُّوبُ، وَيُونُس، عَنِ الْحَسَنِ، عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ، قَالَ: ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَ هَذَا الرَّجُلَ، فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرَةَ فَقَالَ أَيْنَ تُرِيدُ؟ قُلْتُ: أَنْصُرُ هَذَا الرَّجُلَ، قَالَ: ارْجِعْ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: إِذَا التَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ، فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ هَذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُولِ قَالَ: إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ.

"أَنْصُرَ هَذَا الرَّجُلَ" میں هَذَا الرَّجُلَ سے مراد حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ ہیں، موقعہ جنگ جمل یا جنگ صفین کا ہے، احنف بن قیس فرمارہے ہیں کہ ان کا طرف دار بن کر مقابل سے لڑنے کو جارہا ہوں، ابوبکرہؓ نے اس پر فرمایا کہ میاں! گھر بیٹھو۔ چوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب دو مسلمان تلواروں سے مقابل ہوں تو قاتل، مقتول دونوں دوزخ میں جاتے ہیں؛ الحدیث۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالی عنہ کا اس حدیث کو اس موقع پر پڑھنا سمجھ میں

نہیں آتا، چوں کہ یہ جنگ حضرت علی وعائشہ رضی اللہ تعالی عنہما یا حضرت علی ومعاویہ رضی اللہ تعالی عنہما کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ حضرات کس درجہ کے ہیں، پھر یہ حدیث اس موقع پر سنانا عجیب ہے، خیر واقعہ کے تحت دیکھا جائے گا۔

تحت الباب مذکور حدیث سے خوارج، معتزلہ ومرجیہ کے خلاف استدلال

اس وقت امام بخاریؒ کے مقصد پر نظر کرنا ہے، وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو مسلمان مؤمن بھی فرمایا اور **کلاھما فی النار** بھی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ معصیت دخولِ نار کا باعث تو ہوئی مگر باعث کفر نہیں، پس معتزلہ وخوارج کا قال وخیال باطل ہے، ہمارا مذہب حق ہے، ہم حق پر ہیں، اگر معصیت سے مؤمن کافر ہوتا تو حضور اقدس ﷺ اس جگہ "**خرجا من الایمان**" یا "**ارتدا عن الاسلام**" فرماتے، مگر ایسا نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ اس معصیت سے مرتد وخارج عن الایمان نہیں ہوئے، پس ہمارا مذہب صحیح اور محقق ہے، معتزلہ وخوارج کا بالکل غلط ہے۔

اور اے مرجیہ! اگر اعمال سیئہ ایمان کے لیے عرض نہیں ہوتے تو پھر فی النار حدیث شریف میں کیوں ارشاد ہوا، نار اس کا ظرف کیوں ہوئی؟ معلوم ہوا کہ ایمان مانع عن دخول جہنم نہ بنا، قوت ایمان سلب ہوگئی، اس کے متعلق اور کچھ چیزیں ہیں، وہ پھر ہو جائیں گی۔

اب رہا یہ کہ یہ حدیث احنف بن قیس کی حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی نصرت کی تیاری کے موقعہ پر کیوں پڑھی یہ مستقل حکایت واقعہ کی محتاج ہے۔ ان شاء اللہ تعالی دوسرے وقت اس کو بیان کیا جائے گا اس وقت تو مقصود بالبیان مرجیہ کا رد ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

الدرس الحادی والأربعون

جنگ جمل یا صفین کے موقع پر حضرت ابوبکرہ رضؓ کے حدیث ہٰذا کو بیان کرنے پر اشکال

اوپر سے امام بخاریؒ مرجیہ وخوارج معتزلہ کی تردید کرتے آرہے تھے، اسی سلسلہ میں اس بَابٌ: ''المَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الجَاهِلِيَّةِ'' کو لائے تھے کل گذشتہ اس باب کے تراجم اور دونوں حدیث باب کے متعلق بیانات اور ربط ومناسبت سب ہو چکے تھے مگر ایک بات اشکال کی باقی رہ گئی تھی جس کو آج بیان کرنا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کی نصرتِ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے روانگی پر ''الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ'' والی حدیث جو پڑھی، وہ بہ ظاہر واقع وحال پر منطبق نہیں ہوتی؛ اس لیے کہ هَذَا الرَّجُلَ سے مراد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، موقعہ جنگ جمل یا جنگ صفین کا ہے اور مقابلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وحضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھ صحابہؓ کی جمعیتیں ہیں۔

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کے بعض فضائل

پھر حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ تابعین میں سے ہیں، ناواقف نہیں، نہایت جلیل القدر، زہد وورع وتقویٰ وصفائی قلب میں مابین الصحابہ ممتاز اور مشہور شخص ہیں، نہایت درجہ حلیم، نہایت بلند اخلاق شخصیت کے مالک، اس کے باوجود یوں فرمایا کرتے کہ لوگ مجھے حلیم حلیم کہتے ہیں حالاں کہ میں حلیم نہیں ہوں

صرف حلیم ہونا ظاہر کرتا ہوں (۱)۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے حلم کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہت بڑے منکسر المزاج ہیں اور علم حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ وغیرہ اجلہ صحابہ سے حاصل کیا ہے، بہ ایں ہمہ ان کو حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی امداد سے **الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ** کی حدیث سنا کر روکنا گویا انطباق کرنا اور مصداق سمجھنا اور بتلانا ہے۔ حدیث مذکور کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا۔

مذکورہ اشکال کا جواب

جواب اس کا یہ ہے کہ دراصل حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالی عنہ کے سامنے واقعے کی نوعیت محقق طریق سے سامنے نہیں آئی تو یوں خیال فرمایا کہ کہیں ایسی حالت میں اس حدیث کے مصداق نہ ہو جائیں تو بنا بر خوف وحزم واحتیاط خود بھی الگ ہیں اور حضرت احنف کو بھی منع فرما رہے ہیں (۲)۔

اس موقعہ پر حضرات صحابہؓ کے تین گروہ ہو گئے، تمام قبائل انصار حضرت علیؓ کے ساتھ اور اکثر مہاجرین بھی، اور مہاجرین میں سے بعض حضرت عائشہؓ وحضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے اور بعض خاموش تھے، دونوں طرف سے الگ، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ بھی خاموش تھے، اسی وجہ سے حضرت ابوبکرہؓ بھی اس خیال سے خود بھی

(۱) عَنِ الْحَسَنِ قَالَ :قَالَ الْأَحْنَفُ: إِنِّي لَسْتُ بِحَلِيمٍ، وَلَكِنِّي أَتَحَالَمُ. (سير أعلام النبلاء :۹۲/۴، رقم الترجمة: ۲۹)

(۲) فإن قلت القاتل والمقتول من الصحابة في الجنة إذا كان قتالهم عن الاجتهاد الواجب إتباعه قلت ذاك عند عدم الاجتهاد وعدم ظن أن فيه الصلاح الديني أما إذا اجتهد وظن الصلاح فيه فهم مأجوران مثابان من أصاب فله أجران ومن أخطأ فله أجر وما وقع بين الصحابة رضي الله تعالى عنهم هو من هذا القسم فالحديث ليس عاماً. فإن قلت فلم منع أبوب كرة الأحنف منه وامتنع بنفسه منه قلت ذلك ايضاً اجتهادي فكان اجتهاده أدى إلى الامتناع والمنع فهو أيضاً يثاب في ذلك. (الكواكب الدراري: ۱۴۳/۱)

الگ ہیں اور دوسرے کو بھی منع فرما رہے ہیں کہ ابھی تحقیق نہیں ہوئی، بعد تحقیق شرکت کرنا درست ہے، ورنہ بلا تحقیق شرکت میں کہیں خلافِ حق قتل وقتال سرزد ہوکر اندیشہ ہے کہ اس حدیث کے مصداق بن جائیں، اس لیے تاوقت تحقیق الگ رہنا ضروری ہے، یہ مطلب نہیں کہ ان کو مصداق حدیث ٹھہرا رہے ہوں۔

مشاجراتِ صحابہؓ میں لب کشائی کی اجازت نہیں ہے

الحاصل! یہ حدیث اپنے اطلاق پر مبنی نہیں کہ ہر قتل وقتال مورد حدیث ہوجائے بلکہ مقید ہے بقید نفسانیت، پس حق کے اوپر لڑنا عین مطلوب شرع ہے، جیسا کہ حضرات صحابہؓ کے تمام مشاجرات میں یہی حقیقت کارفرما تھی، جو کچھ آپس میں خلاف وجدال ہوا، اختلافِ اجتہادی سے ناشی تھا، پس کسی کو ان حضرات پر لب کشائی کا حق نہیں، حدیث شریف میں مشاجرات صحابہؓ میں زبان کھولنے کی ممانعت ہے، نیز وارد ہے: ”اللّٰهَ اللّٰهَ فِي أَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِي، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ“ (۱)۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے متعلق اور بھی احادیث ان کی فضیلت میں وارد ہوئی ہے۔

حضرت مسیح الامتؒ اور ایک صاحب کے درمیان دل چسپ مکالمہ

غرض یہ حدیث (الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ) اطلاق پر نہیں، بعض حضرات مطلق سمجھتے ہیں، جیسے احباب میں سے ایک حدیث ”مَنْ رَأَى مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ

---

(۱) سنن الترمذی، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رضی الله تعالى عنه، أبواب المناقب عن رسول الله ﷺ باب فيمن سب أصحاب النبي ﷺ، رقم الحديث: ۳۸۶۲.

أَضْعَفُ الْإِيمَانِ'' (۱) کے متعلق فرمانے لگے اور کہنے لگے کہ نصیحت کی بات تو ہر ایک کہنے کا حق رکھتا ہے، جو چاہے کہہ دے، جس کو چاہے کہہ دے، میں نے کہا: نہیں! اس کے قیود وشرائط ہیں، ایسی مطلق اور عام نہیں۔ پھر فرمانے لگے: حدیث میں آتا ہے: الدِّينُ النَّصِيحَةُ (۲)، وَالنُّصحُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (۳)، اس سے تو اسی طرح کا عموم ظاہر ہوتا ہے، میں نے کہا: نہیں! اس کے قیود خود لفظ نصیحت بتلا رہا ہے، باہر بھی جانے کی ضرورت نہیں، پھر انہوں نے كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ پڑھ دیا (۴)۔ میں نے کہا: یہاں بھی لفظ راعی ورعیت اپنے قیود وشرائط پر دلالت کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ بیٹے، شاگرد، غلام باپ، استاذ، آقا، کی رعیت نہیں، ماتحت ہیں۔

الحاصل الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ والی حدیث مطلق نہیں۔

---

(۱) صحيح مسلم، عن طارق بن شهاب - وهذا حديث أبي بكر - كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان، وأن الإيمان يزيد وينقص، وأن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر واجبان، رقم الحديث: ۷۸ (۴۹).

(۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الدِّينُ النَّصِيحَةُ ثَلَاثَ مِرَارٍ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ لِمَنْ؟ قَالَ: لِلَّهِ، وَلِكِتَابِهِ، وَلأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ. (سنن الترمذی، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّصِيحَةِ، رقم الحديث: ۱۹۲۶.)

(۳) یہ ایک حدیث کا جزء ہے، پوری حدیث اس طرح ہے: عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رضی الله تعالى عنه قَالَ بَايَعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى إِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالنُّصحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (صحيح البخاری، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: "الدِّينُ النَّصِيحَةُ: لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلأَئِمَّةِ المُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ"، رقم الحديث: ۵۷)

(۴) صحيح البخاری، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابٌ: المَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا، رقم الحديث: ۵۲۰۰.

مؤمنین کے ساتھ قتال وجدال کے مسئلے میں مذاہبِ فقہاء

مسئلہ قتال وجدال میں تین مذاہب ہیں : اول یہ کہ فتنین وشرارت پسند مسلمان مسلمانوں پر حملہ آور ہوں تو دوسرے کو مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ خاموش رہیں، اپنے گھر میں چپ بیٹھ جائیں، حتیٰ کہ اگر گھر پر چڑھ آئیں اور گھر پر ہی حملہ آور ہوں، تب بھی خاموش رہیں، خواہ قتل ہو جائیں، مدافعت کے لیے بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ یہ عجیب مذہب ہے، **الْقَاتِلُ وَ الْمَقْتُولُ فِي النَّارِ** کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔

دوسرا مذہب یہ ہے (جو ابن عمرؓ کا ہے) کہ بلوائیوں اور شرارت پسندوں کے ساتھ شریک نہ ہوں، ان کے ساتھ کھڑا نہیں ہونا، بیٹھے رہنا ضروری ہے لیکن اگر گھر پر چڑھ آئیں اور شرکت کے لیے زور دیں، حملہ کریں تو مدافعانہ سعی کر و اپنی حفاظت کرو۔

تیسرا مذہب اکثر صحابہؓ جمہور علماء، محققین وفقہائے کرام کا ہے کہ جب دو جماعتیں مسلمین کی آپس میں قتل وقتال میں مشغول ہوں تو اولاً انہیں تحقیق کرنا چاہیے کہ کون حق پر ہے پھر اہل حق کے اعطائے حق میں نصرت اور پوری جد وجہد کرنا چاہیے، اپنی پوری پوری مقدرت وقدرت کے مطابق، اس لیے کہ اگر نصرت نہیں کی تو معاصی بڑھیں گے شرور وفتن پھیلیں گے، شریروں کو موقع ملتے رہیں گے، اس لیے ضرورت ہے کہ شرور وفتن کا انسداد کیا جائے اسی پر فتویٰ ہے(۱)۔

---

(۱) واختلف العلماء في القتال في الفتنة : (۱) فمنع بعضهم القتال فيها وإن دخلوا عليه، عملا بظاهر هذا الحديث، وبحديث أبي بكرة في صحيح مسلم الطويل :(إنها ستكون فتن) الحديث. وقال هؤلاء :لا يقاتل، وإن دخلوا عليه وطلبوا قتله، ولا تجوز له المدافعة عن نفسه لأن الطالب متأول، وهذا مذهب أبي بكرة وغيره. وفي (طبقات) ابن سعد مثله عن أبي سعيد الخدري، (۲) وقال عمران بن حصين وابن عمر وغيرهما :لا يدخل فيها، فإن قصدوا دفع عن نفسه. (۳) وقال معظم الصحابة والتابعين وغيرهما :يجب نصر الحق وقتال الباغين لقوله تعالى :{فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله} (الحجرات : ۹) وهذا هو الصحيح. (عمدة القاري: ۱/۲۱۲)

جمہور کے موقف پر دلائل

اب اگر کہا جائے کہ یہ تو حدیث الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ کے خلاف ہے، پھر اس مسلک ومذہب کی کیا دلیل ہے؟ جواب یہ ہے کہ دلائل بہت ہیں: اول یہ کہ اگر الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ والی حدیث کو علی الاطلاق والعموم رکھا جائے تو ہابیل وقابیل کے بارے میں کیا کہیں گے؟ کیا اس حدیث کی بناء پر دونوں کو جہنمی کہہ دیں گے؟ دونوں کو جہنمی کہنا تو صحیح نہیں، کلامِ پاک میں ان کا واقعہ جس انداز سے بیان فرمایا گیا ہے، وہ دلیل ہے صرف قابیل کے مجرم اور جہنمی ہونے پر، نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر چور ڈاکو اپنے گھر آجائے، تم اپنی جان، مال، عزت کی حفاظت کے لیے مدافعت کرو، اس صورت میں قتل ہوجاؤ گے تو شہید ہوگے (۱) ۔ یہ شہادت کیسی جو موجب جنت ہے اور بعض اعتبار سے صدیقیت کے بعد شہادت ہی کا درجہ ہے، اس حدیث کے اطلاق پر تو مالک مکان کے مقتول ہوجانے پر وہ جہنمی ہوگا اور یہ اس حدیث کے خلاف ہوگا، تو ایک حدیث کا دوسری حدیث کے خلاف ہونا لازم آئے گا۔

چور کا شر دفع کرنے کا احتیاطی طریقہ

فقہاء وصوفیاء ان ہی دونوں جماعتوں سے نظام شریعت قائم ہے، مصلح امت ہیں، ایک عجیب بات کہتے ہیں کہ چور وغیرہ جو گھر میں گھس آتے ہیں، دفعۃً اس پر حملہ نہ کرو بلکہ پہلے اس کو قسم دے کر کہو کہ تجھے قسم ہے، اس سے باز آجاؤ، ورنہ تم کو

---

(۱) عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ رضی اللہ تعالی عنه قَالَ :سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ :مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دِينِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أَهْلِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ.(سنن الترمذی، أَبْوَابُ الدِّيَاتِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ ،بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ،رقم الحديث: ۱۴۲۱)

دق پہنچ جانے اور تمھارے قتل ہو جانے کا ذمہ دار نہیں، یہ اس لیے کہ شاید وہ اس سے باز آجائے تو نجات ہوگئی اور نہ باز آئے تو مدافعت کے لیے حملہ کرو، اگر ایسا کاری زخم اس کو ہو گیا کہ اب وہ معذور ہو گیا کچھ نہیں کر سکتا تو اب ہاتھ روک لو کہ مقصد حاصل ہے، اب اس سے خطرہ نہیں اور زخم کھا کر بھاگ گیا تو پیچھا نہ کرو کہ یوں بھی مقصد حاصل ہو گیا۔ اور اگر مر گیا تو اس شخص کے پاس تمھارے سامان کے علاوہ جو کچھ ہے اس پر ہاتھ نہ ڈالو کہ یہ زیادتی ہے، ایسا کرنے میں اب تم بھی سارق ہو جاؤ گے، فقہاء نے احادیث سے یہ احتیاطی احکام بتلائے، تو دیکھیے اَلْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِی النَّارِ حدیث کو اپنے ایسے اطلاق پر رکھنے کی صورت میں سارق وقاطع اور مالک مکان اور ہابیل سب کا جہنمی ہونا لازم آتا ہے، حالاں کہ یہ بالکل خلاف مقصد شرع ہے۔

جمہور کی طرف سے تحت الباب مذکور حدیث کا جواب

علاوہ ازیں ہم یہیں سے اس حدیث کو مقید کرتے ہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مرد یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی نصرت کرنے جا رہا ہوں، اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے ساتھ صحابہؓ کی کثیر جماعت ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی طرف حضراتِ عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ اور کچھ اور صحابہ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین ہیں، اب ان دونوں طرف کے مقتولین کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کیا خدانخواستہ، نعوذ باللہ وہ جہنمی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ عشرہ مبشرہ وہ ہیں جن کے جنتی ہونے کی خوش خبری بذریعہ وحی آچکی ہے، ان ہی میں سے حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالی عنہما دونوں ہی حضرت عائشہ کی طرف سے شہید ہو جاتے ہیں تو یقینی طور سے ان کا جنتی ہونا مثل انبیاء کے جنتی ہونے کے مسلم ہے، تو یہ حدیث اگر مطلق رکھی جائے تو اس میں

خرابی لازم آوے گی کہ بشارت صحیح نہ ہو، تو ایک فرمان رسول اللہ ﷺ دوسرے فرمان نبوی ؐ کے خلاف ہوگا کہ ایک سے دوسرے کی تکذیب لازم آئے گی، عیاذ باللہ! اور یہ باطل ہے؛ پس **الْقَاتِلُ وَ الْمَقْتُولُ فِي النَّارِ** حدیث کا اطلاق باقی رکھنا بھی غلط ہو گیا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حدیث مذکور مؤول ہو اور ایسے معنیٰ مراد لیے جائیں کہ تمام احادیث کا صحیح اور صادق ہونا صاف طور سے سمجھ میں آجائے۔

پس مطلب یہ ہے کہ ارادۂ قتل بہ نیت فاسد ہو، تب یہ وعید ہے، قتل وقتال کا مقصد عصبیت ہو کہ بدون تحقیق کسی کا ساتھ دینے کھڑے ہو جائیں کچھ حق و باطل کی تمیز نہ کی تو اس طور سے قتل وقتال معصیت ہے، اس میں بدون قتل کے وقوع کے بھی وعید ہے کہ معصیت ہے، اگر چہ قتل کا صدور کسی مانع کے سبب نہ ہو، چناں چہ اس ارادۂ قتل ہی کے سبب یہ حکم شریعت ہے کہ اگر چند اشخاص کسی شخص کے قتل کے ارادے سے جمع ہوں، درآنحالیکہ وہ لائق قتل نہ تھا اور ان میں سے ایک شخص نے قتل کر دیا تو فقہاء کہتے ہیں کہ سب پر قصاص واجب ہے، فرماتے ہیں کہ سب شریک تھے؛ اس لیے سب سے قصاص لیا جائے گا (١) "**إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ**" اس پر دال ہے۔

نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو قتل کا عزم اور نیت کرے گا قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا : **يیئس من روح الله** (٢)، تو جب ارادہ پر رحمت حق سے مایوسی اور جہنم ضروری تو بھلا جس نے قتل ہی کر دیا،

---

(١) (وَإِذَا قَتَلَ جَمَاعَةٌ وَاحِدًا عَمْدًا اُقْتُصَّ مِنْ جَمِيعِهِمْ) لِقَوْلِ عُمَرَ - رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ - فِيهِ:لَوْ تَمَالَأَ عَلَيْهِ أَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ.(الهداية :٥٢/٤، كتاب الجنايات، فصل : وإذا اصطلح القاتل وأولياء القتيل على مال إلخ)

(٢) وَفِي الحَدِيث من أَعَان عَلَى قتل مُؤمن بِشَطْر كلمة جَاءَ يَوْم الْقِيَامَة مَكْتُوب بَين عَيْنَيْهِ : أيس من رَحْمَة الله.قلت رُوِيَ من حَدِيث أبي هُرَيْرَة وَمن حَدِيث ابْن عَبَّاس وَمن حَدِيث ابْن عمر وَمن حَدِيث عمر بن الْخطاب.أما حَدِيث أبي هُرَيْرَة ←

اس کا کیا حال ہوگا، معلوم ہوا کہ طمع دنیا، حرص دنیا، مال وجاہ طلبی، ملک گیری دونوں طرف سے ہو، تب ''الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ'' صادق آئے گا۔

خود اسی حدیث شریف سے یہ بات اور یہ قید نکل رہی ہے کہ جب ایک صحابیؓ نے اپنا خلجان پیش فرمایا اور سوال کیا کہ مقتول کیوں جہنم میں جائے گا تو جواب ارشاد فرمایا :إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ، معلوم ہوا کہ ان نیتوں اور عزموں سے جو قتل وقتال ہو، اس کے متعلق یہ حدیث الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ والی وارد ہوئی، اس معنی سے بہ سہولت احادیث جمع ہو جائیں گی؛ اس لیے فقہائے کرام وجمہور علماء نے خوب جانا اور بہتر سمجھا، اس حدیث سے متعلق یہ مذاہب تھے، اکثر صحابہؓ کی یہی رائے تھی، اس لیے صحابہؓ کی نیات اچھی تھیں، ان پر یہ حدیث منطبق نہیں ہوتی۔

پھر حضرت ابوبکرہؓ نے یہ حدیث جو سنائی، اس کی توجیہ عرض کر دی گئی کہ احتیاطاً اپنے دین کی حفاظت اور دوسرے کو بھی اسی احتیاط کے پیش نظر اندیشہ دلا کر خیر خواہی منظور تھی، چوں کہ ابھی انھیں واقعہ محقق نہ تھا یا پھر ممکن ہے کہ ان کے نزدیک بھی ابن عمرؓ والا مذہب مختار رہو۔

واقعۂ جنگ کی تفصیل

واقعہ کی نوعیت عجیب وغریب ہے: مصر میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالی عنہ گورنر تھے، اہل مصر کے شریروں نے خواہ مخواہ مطالبے شروع کر دیے،

← فَرَوَاهُ ابْن ماجة فِي سنَنه فِي كتاب الدِّيات من حَدِيث يزِيد بن أبي زِيَاد عَن الزُّهْرِيّ عَن سعيد بن الْمسيب عَن أبي هُرَيْرَة قَالَ قَالَ رَسُول الله ﷺ من أَعَان عَلَى قتل مُؤمن بِشَطْر كلمة لَقِي الله تَعَالَى مَكْتُوب بَين عَيْنَيْهِ أيس من رَحْمَة الله تَعَالَى إلخ (تخريج الأحاديث والآثار الواقعة في تفسير الكشاف للزمخشري للزيلعي : ۱/ ۳۴۶)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس تین سو کی تعداد پر مشتمل گروہ پہنچا اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہ کی شکایات سامنے رکھیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ بہت نرم دل تھے، خیال کرنے لگے کہ یہ بضد ہیں، یہ خوش ہیں، اس لیے عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہ کو مصر سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیں گے اور یہ لوگ جن کو چاہ رہے ہیں یعنی محمد بن ابی بکرؓ، ان کو مصر کا حاکم بنا دیں، یہ محمد بن ابی بکر حضرت علیؓ کے ربیب ہیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے محمد بن ابی بکرؓ کی والدہ اسماء رضی اللہ تعالی عنہا (جو بیوہ تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ کی، ان) سے نکاح کرلیا، محمد بن ابی بکرؓ کم سِن تھے، حضرت علیؓ نے ان کی تربیت فرمائی۔

مروان کی خیانت

غرض حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ نے منظور فرمالیا اور عمر بن العاصؓ کے نام حکم نامہ تو تحریر فرمایا اور اس میں یہ بھی تھا کہ جب محمد بن ابی بکرؓ تمھارے پاس پہنچے تو ان کا حاکم ہونا قبول کرو۔ "فاقبلوہ" لفظ تھا۔ یہ حکم نامہ تحریر فرما کر میر منشی مروان بن حکم کو مہر لگانے کے لیے دے دیا۔ مروان بن حکم خائن تھا، اس کو حضرت محمد بن ابوبکرؓ سے کچھ پرخاش تھی، اس لیے "فاقبلوہ" کو بدل کر "فاقتلوہ" بنا دیا اور مہر لگا دی، حضرت عثمانؓ نے دوبارہ نظر فرمائے بغیر اپنے خاص اونٹ پر مع اپنے غلام کے حکم نامہ روانہ فرما دیا(۱)۔

(۱) یہ واقعہ تاریخ کی تقریباً تمام معتبر کتابوں میں ہے اور مروان کی خیانت کا ذکر بھی صاحب العقد الفرید (۵/۴۱) وغیرہ بعض مؤرخین نے کیا ہے لیکن مروان نے "فاقبلوہ" کی جگہ "فاقتلوہ" کر دیا تھا، اس کی صراحت کسی کتاب میں بندے کو مل نہیں سکی، علامہ البانی اس کے بارے میں لکھتے ہیں: قلت على معناها وقفت، أما على نفس اللفظة: فاقتلوه، لا .. الذي ورد أنه اتهم عثمان ..،

←

حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کا دل دہلا دینے والا واقعہ

بلوائیوں کے قافلہ نے اس کو روک لیا اور حکم نامہ لے کر کھول لیا، جب اس میں "فاقتلوہ" دیکھا تو غصہ کی آگ بھڑک گئی، یہی خیال کیا کہ ہم کو دھوکہ دیا گیا ،اس کا اعلان کر دیا کہ خط میں اس طرح کیوں لکھا؟ بس اب ان کی خیر نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے اس ہنگامے کو روکنا چاہا اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالی عنہما کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے مکان کے دروازوں پر اور حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالی عنہما نے بھی اپنے لڑکے بٹھا دئے، یہ نوبت واقعہ کی تحقیق نہ

← گویا ان کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے، آگے لکھتے ہیں: اتهم بذلك، اتهم أنه لما جاء وفد المصريين والعراقيين إلى عثمان واصطلحوا معه على خمس :أنه المنفي يُرَدُّ، والمحروم يُعطَى .. إلى آخره، ثم رجعوا إلى ديارهم، وفي الطريق اكتشفوا رجلاً يعرض لهم ثم يهرب، يعرض لهم كأنه يقول خذوني كما في الرواية، هنا توقفوا وقبضوا عليه، وفور قبضهم عليه سألوه :ما خبرك؟ قال :معي خطاب من عثمان إلى والي مصر مختوم، فطلبوا منه كشفه حتى كشفوه، فوجدوا فيه أن يقتل محمد بن أبي بكر وفلان وفلان، ويحلق لحاهم، كما في بعض الروايات، ويفعل ..ويفعل ..هنا رجع الوفد إلى المدينة، وجاؤوا يحاجون عثمان رضي الله عنه بذلك، فحلف لهم عثمان بأنه لم يكتب كتاباً قط، فاتهموا مروان؛ لأنهم وجدوا عليه خاتماً، كما يقولون ويزعمون، ولأنهم وجدوا مع هذا الرجل أيضاً بعير لعثمان، فهنا قالوا :إما أن تكون أنت كتبته أو أن واليك الذي يحمل خاتمك قد كتبه، ثم ثارت الفتنة ..هذا مجمل الروايات التي وردت في ذلك، ولكن أنا شككت في صحة أن يكون هذا مرسل من مروان أو من عثمان أو غيره، والذي ترجح لدي أو ملت إليه ووضعت احتمال، احتملت أنهم يكونوا في الطريق دبروا هذه المؤامرة وكتبوا هذا الخطاب، وأوعزوا إلى هذا الرجل أن يأتي ويعرض لهم كأنه يقول خذوني إلخ، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو :(موسوعة الألباني في العقيدة:۳۸۷/۸)

کرنے کے باعث ہوئی بالآخر بلوائیوں نے دیوار پھاند کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہا کو جا گھیرا اور محمد بن ابوبکر نے وہ خط دکھلایا کہ آپ نے میرے قتل کا حکم لکھا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ نے سمجھانا چاہا مگر غصہ میں سننے کو تیار نہیں ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کو گرا کر سینے پر چڑھ گئے اور داڑھی پکڑ لی حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ تیرے باپ اس ڈاڑھی کی عزت کرتے تھے، اگر وہ تیری یہ حرکت دیکھتے تو سخت ناراض ہوتے، محمد بن ابوبکر پر اس بات کا اثر ہوا اور ڈاڑھی چھوڑ کر سینے سے اتر گئے۔

بلوائیوں کا مقصد تو محض شرارت ہی تھی، جب انھوں نے صلح کا رخ دیکھا تو اس کو گوارا نہ کیا، آخر ایک نے بڑھ کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہا کے پیچھے سے گردن میں نیزہ مارا اور بعض نے گلا گھونٹ دیا، اس وقت قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے، زخمی ہوئے، خون کا قطرہ ان الفاظ پر گرا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ شہید ہو گئے۔

حضرت عائشہؓ وغیرہ کا حضرت علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ اور حضرت علیؓ کی عذر خواہی

اب شہادت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہا پر تشویش اور کھل بلی مچ گئی، حضرت علیؓ بہت رنجیدہ ہیں، اب یہاں سے حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالی عنہا چلے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی خدمت میں پہنچے (حضرت عائشہؓ حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف فرما تھیں) اور ان سے کہا کہ آپ مدینہ نہ جائیں، ورنہ سخت اندیشۂ فساد ہے، یہیں رہ کر حضرت علیؓ سے مطالبۂ قصاص کریں یا تو قاتلین عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ سے قصاص لیں، نہیں تو ان کو ہمارے سپرد کریں۔ ادھر شام

سے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ نے لکھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کا قصاص لیں، ورنہ قاتلوں کو ہمارے حوالے کردیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ جواب میں فرماتے ہیں کہ شرارت ختم ہونے کا انتظار کیجیے اور ابھی حکومت جمنے تو دیجیے۔ علاوہ ازیں تعین قاتلین تاہنوز نہیں، کہیں ایسی صورت میں بلاتحقیق قصاص لینے سے کوئی ناحق میرے ہاتھ سے خون نہ ہوجائے، امر خلافت مستحکم ہو اور سکون ہوجائے، تب قصاص لینا درست ہوگا مگر اسی پر زور رہا کہ ابھی فوراً ہو۔

مقامِ حوأب سے حضرت عائشہؓ وغیرہ کا واپسی کا ارادہ اور بلوائیوں کی شرارت سے جنگ جمل کا آغاز

جب فوری منظوریٔ مطالبہ نہ ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالی عنہما بصرہ لے کر پہنچے اور ان کو اپنا ہم خیال کیا، لشکر جمع کرکے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے مقابلہ کے لیے چل پڑے ادھر حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو وہ بھی مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے؛ تاکہ شر کا دفعیہ فرمائیں، حضرت عائشہؓ کا لشکر رات کو چل رہا تھا کہ ایک جگہ کتا بھونکا، معلوم کیا کہ یہ کون سا مقام ہے؟ بتلایا گیا کہ یہ حوأب ہے، حضرت عائشہؓ کو حدیث یاد آئی کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ عائشہ! تم علی کے مقابلہ کے لیے نکلوگی اور مقام حوأب پر کتا بھونکے گا اور علی حق پر ہوں گے(۱)۔ یہ حدیث یاد آتے ہی اپنی غلطی سمجھ میں آئی اور واپسی کا قصد فرمالیا اور حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ تعالی عنہما بھی جنگ سے الگ ہوگئے۔

(۱) ان الفاظ کے ساتھ بندے کو کہیں حدیث نہیں ملی، البتہ بہت سی کتب حدیث وتاریخ میں یہ روایت اس طرح ملتی ہے: عَنْ قَيْسٍ (ابنِ أبِی حَازِمٍ)، قَالَ: لَمَّا أَقْبَلَتْ عَائِشَةُ، مَرَّتْ بِبَعْضِ مِيَاهِ بَنِي عَامِرٍ طَرَقَتْهُمْ لَيْلًا، فَسَمِعَتْ نُبَاحَ الْكِلَابِ، فَقَالَتْ: ←

بلوائیوں نے یہ صلح دیکھی تو گھبرائے، وہ تو یہی سوچتے تھے کہ یہ لڑتے رہیں تو اپنا کام بنتا رہے، اگر مل گئے تو شامت آجائے گی، بلوائی دونوں طرف ہیں۔ رات کے وقت جب لوگ سو گئے تو نصف شب کو بلوائیوں نے پتھر پھینکنے شروع کیے، دونوں طرف اب شور مچا، ہر فریق کو خیال ہوا کہ ہمارے ساتھ دھوکہ کیا گیا، آخر جنگ شروع ہوگئی، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا اونٹ پر سوار تھیں، ان کے ہودج کی حفاظت کے لیے بڑے بڑے لوگ آتے اور شہید ہو جاتے، حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالی عنہما بھی اسی میں شہید ہوگئے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کے اونٹ کی کونچیں کاٹ دی گئیں، جب ہودج گرنے لگا تو فوراً حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ آگے بڑھے اور گرنے سے سنبھال لیا، بحفاظت اتار لیا اور ان کو بحفاظت مدینہ پہنچا دیا جنگ ختم ہوگئی، حضرت علیؓ کو غلبہ رہا؛ اسی لیے اس جنگ کو جنگ جمل کہتے ہیں کہ اونٹ پر سوار تھیں۔

← أَيُّ مَاءٍ هَذَا؟ قَالُوا :مَاءُ الْحَوْأَبِ، قَالَتْ :مَا أَظُنُّنِي إِلَّا رَاجِعَةً، قَالُوا :مَهْلًا يَرْحَمُكِ اللهُ، تَقْدَمِينَ فَيَرَاكِ الْمُسْلِمُونَ، فَيُصْلِحُ اللهُ بِكِ، قَالَتْ:مَا أَظُنُّنِي إِلَّا رَاجِعَةً، إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ ، يَقُولُ:كَيْفَ بِإِحْدَاكُنَّ تَنْبَحُ عَلَيْهَا كِلَابُ الْحَوْأَبِ.(صحیح ابن حبان، ذِكْرُ الْإِخْبَارِ عَنْ خُرُوجِ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ إِلَى الْعِرَاقِ،رقم الحدیث : ۶۷۳۲) اسی طرح یہ واقعہ امام ابن جریر طبریؒ نے تاریخ طبری (۴/۴۶۹) علامہ ابن الاثیرؒ نے الکامل (۲/ ۵۷۳) علامہ ابن خلدونؒ نے تاریخ ابن خلدون (۲/ ۶۰۸) میں اور دیگر مؤرخین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اس واقعے کی پیشین گوئی پر مشتمل ایک اور حدیث بھی کتب احادیث میں حضرت علیؓ سے روایت کی جاتی ہے، افادۃً واستفادۃً یہاں نقل کی جاتی ہے :عَنْ أَبِي رَافِعٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِعَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ:إِنَّهُ سَيَكُونُ بَيْنَكَ وَبَيْنَ عَائِشَةَ أَمْرٌ، قَالَ:أَنَا يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ:نَعَمْ،[قَالَ :أَنَا؟ قَالَ :نَعَمْ، قَالَ:] فَأَنَا أَشْقَاهُمْ يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: لاَ، وَلَكِنْ إِذَا كَانَ ذَلِكَ، فَارْدُدْهَا إِلَى مَأْمَنِهَا.(غاية المقصد في زوائد المسند للهيثمي : ۴/ ۲۰۷، رقم الحديث: ۴۸۴۳، كتاب الفتن، باب فيما كان بينهم يوم صفين، رضي الله عنهم.)

جنگ صفین اور اس کا پس منظر

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کا بھی یہی مطالبہ تھا، فوری قصاص یا قاتلین کو اپنے حوالہ طلب کرر ہے تھے، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے جواب دیا کہ جلدی کرنا خلافِ مصلحت وخلافِ حکمت ہے مگر جذبہ میں غور نہیں کیا گیا، شام والوں سے معاہدہ اور بیعت لے لی، چنانچہ شام والوں نے انھیں امیر المؤمنین بنالیا، یہ خلافت نہ تھی۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے مقابلہ، کیا اس میں بھی اجلہ صحابہؓ شہید ہوئے بالآخر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ ہی کو غلبہ حاصل رہا۔ حق پر حضرت علیؓ تھے، یہ محقق ہے، سب جانتے اور مانتے ہیں۔ خود حضور اقدس ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی: **اللَّهُمَّ أَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ**: اے اللہ حق کو علی کے ساتھ دائر رکھیے۔ جدھر علی ہوں، ادھر ہی حق ہو (۱)۔

(۱) پوری حدیث اس طرح ہے: عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ "رَحِمَ اللهُ أَبَا بَكْرٍ زَوَّجَنِي ابْنَتَهُ، وَأَعْتَقَ بِلالاً مِنْ مَالِهِ، وَحَمَلَنِي إِلَى دَارِ الْهِجْرَةِ، رَحِمَ اللهُ عُمَرَ، يَقُولُ الْحَقَّ وَإِنْ كَانَ مُرًّا، تَرَكَهُ الْحَقُّ وَمَا لَهُ مِنْ صَدِيقٍ، رَحِمَ اللهُ عُثْمَانَ، تَسْتَحْيِيهِ الْمَلائِكَةُ، رَحِمَ اللهُ عَلِيًّا، اللَّهُمَّ أَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ" رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ. (سنن الترمذی، بَابُ مَنَاقِبِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، رقم الحدیث: ۳۷۱۴) حضرت علیؓ کے حق پر ہونے کی دلیل یہ حدیث بھی ہے: عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قُتِلَ عَمَّارًا الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ۔ (صحیح ابن حبان، ذِكْرُ الْخَبَرِ الدَّالِّ عَلَى أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ كَانَ فِي تِلْكَ الْوَقْعَةِ عَلَى الْحَقِّ، رقم الحدیث: ۶۷۳۶) اور جنگ جمل وصفین دونوں میں حضرت عمارؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور جنگ صفین میں شہید ہوئے تھے۔

جنگ جمل وصفین میں دونوں طرف کے صحابہؓ نیت میں برحق تھے

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ تعالی عنہما کے بعد سب سے افضل حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ ہیں، اس پر اجماع ہے مگر ادھر ام المؤمنین ہیں، بڑی عالمہ محدثہ فقیہہ ہیں اور واقعہ سخت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ جلیل القدر خلیفۃ کا قتل ہے، دونوں طرف بڑے بڑے صحابہؓ ہیں، اس لیے فساد نیت کا گمان کسی کے متعلق نہیں کیا جا سکتا، ہر دو طرف نیت انسدادِ فتن اور دفع شر ہے، یہ اجتہادی بات ہے کہ ایک طرف اس میں جلدی کرنا ضروری سمجھا جا رہا ہے، حضرت علیؓ جلدی کرنا مفید کے بہ جائے خلافِ حکمت ومصلحت خیال فرما رہے ہیں، مجتہد کو اصابۃ پر دو اجر ہیں، خطا پر ایک اجر ہے (۱)، دونوں ماجور ہیں۔

بعض محققین نے حضرات صحابہؓ کے متعلق بڑی عجیب بات فرمائی، بہت دل کو لگتی ہے، وہ یہ کہ حضرات صحابہؓ کا مرتبہ اجتہاد سے اونچا اور نبوت سے نہایت نیچا تھا، ان کے ذوق کو کوئی مجتہد بھی نہیں پہنچ سکتا، بڑی اونچی شان والے ہیں، جس فعل کو کر رہے ہیں، اس میں حسنِ نیت نہایت اعلی پیمانے پر ہے، بہت اونچی نظر سے ان کے اعمال ہوتے تھے؛ اس لیے ان کے کسی فعل کے متعلق معصیت کا تصور ہی درست نہیں۔ طمع، عصبیت وغیرہ ان میں کچھ نہ تھیں کہ "کلاھما فی النار" کو ان

---

(۱) (۱) إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ. (سنن أبی داود، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ تعالی عنه، كِتَاب الْأَقْضِيَةِ، بَاب فِي الْقَاضِي يُخْطِئُ، رقم الحدیث: ۳۵۷۴.)

کے حق میں تصور کیا جا سکے۔ اس لیے وہ ہر حال میں ماجور ہیں کہ ہر دو طرف سے اجتماعِ قوت اور جنگ کی بنیاد دفع شر و انسداد فتنہ کی نیت پر مبنی تھی۔

جنگ جمل و صفین کے وقوع کی بہترین توجیہ

اور اگر یوں کہہ دیا جائے تو شاید بے جا نہ ہو کہ تکوینی طور سے یہ ضروری تھا، چوں کہ ایسی صورت زمانۂ نبوی میں پیش نہ آئی تھی، اگر ان صحابہؓ کے زمانہ میں دو مسلم جماعتوں کے ایسے جنگی واقعات پیش نہ آتے تو احکام وقوانین شرعیہ ایسے مواقع کے کیسے مقرر ہوتے؟ فقاہت کیسے بنتی (۱)؟۔ ادھر **أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ، فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ** ارشاد فرما چکے۔ پس جنگ صفین و جنگ جمل ہمارے لیے قانون بنا لائے، فقاہت قائم ہوگئی۔ نیت ان حضرات کی حسن تھی، دونوں فریق مثاب و ماجور ہیں۔ پس ان کے واقعات میں لب کشائی لائق نہیں، اس لیے بعض حضراتِ مصنفین نے فریقین میں فیصلہ نہیں فرمایا، سکوت اختیار فرمایا اور بعض حضرات نے جمہور کے موافق حق کہا اور دوسری طرف سے اجتہادی لغزش ہونا کہا۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کے مشاجرات میں گفتگو نہ کرنا یعنی کسی کو طعن نہ کرنا کسی کو عیب نہ لگانا (۲)، تمھیں کیا مطلب اے امتیو! خبردار لب کشائی تک نہ کرنا ان سے حسن ظن رکھنا، سوئے ظنی سے دور رہنا۔

---

(۲) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول غالباً اسی طرف مشیر ہے: مَا يَسُرُّنِي لَوْ أَنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ ﷺ لَمْ يَخْتَلِفُوا ,لِأَنَّهُ لَوْ لَمْ يَخْتَلِفُوا لَمْ تَكُنْ رُخْصَةً. (الإبانة الكبرى لابن بطة: ۲/۵۶۴)

(۲) غالباً اس سے حضرت ابن مسعودؓ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: إِذا ذُكِرَ أَصْحَابِي فأَمْسِكُوا الحديث۔ اس کی شرح میں علامہ مناویؒ فرماتے ہیں: (إذا ذكر أصحابي) بما شجر بينهم من الحروب والمنازعات (فأمسكوا) وجوبا عن الطعن فيهم والخوض في ذكرهم بما لا يليق فإنهم خير الأمة والقرون لما جرى بينهم محامل۔ (فيض القدير شرح الجامع الصغير: ۱/۳۴۷)

اور جب عرض کر دیا گیا کہ وہ حضرات صحابہ (رضوان اللہ تعالی علیہم أجمعین) اجتہادیت کے مرتبہ سے بھی فائق اور برتر تھے پھر آج والوں کو یہ کہنا کہ صحابہؓ کی زندگی معیاری نہ تھی اور غیر مقلدین کا مجتہدین کے مقابلے میں اجتہاد شروع کر دینا یہ کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟۔

اس تفصیلی بیان کے ضمن اختلافِ نظریات اور حسنِ نیات مذاہب ثلثہ ابوبکرہؓ، ابن عمرؓ اور جمہور کے معلوم ہوجانے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت ابوبکرہؓ کا حدیثِ الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ احنف بن قیس کی روانگی بہ نصرتِ حضرت علیؓ کے وقت پڑھ کران کو روکنا ان کے اپنی نظریہ کے مطابق صحیح ہے۔

مشاجرات میں حضراتِ صحابہؓ کی بے نفسی اور ہماری نفسانیت

حضرت ابن عمرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ شریک نہ رہے، تاہم حضرت علیؓ ان سے ناراض نہیں تھے، حضرت ابن عمرؓ کی مدح فرمایا کرتے تھے، کچھ برا نہیں مانا، ناگواری وگرانی نہیں فرمائی، مثل سابق ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھی۔ ہم کلامی وہم طعامی قطع نہیں فرمائی۔

ہمارا حال نہایت قابل افسوس اور ضروری التبدیل ہے کہ ذراسی کسی بھائی کی طرف سے خلافِ طبع وخلافِ رائے کوئی بات صادر ہوجائے تو سلام کلام قطع اور تعلقات ختم، ادنی مروت برتنا گوارا نہ کریں، پوری نفرت وبغض وعداوت ہوجائے، صورت تک دیکھنا پسند نہ کریں، اس کی کسی راحت وفرحت کو دیکھ پائیں تو بہ جائے خوشی کے رنج ہو، اس پر کوئی آفت آجائے تو خوش ہوں، اور یہ معاملہ صرف ذاتی مفاد ومصلحت سے متعلق امور میں ہے، اور شریعت کی خلاف ورزیوں اور صریح معاصی

میں یہ معاملہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ مخالفت شریعت میں ہے، اگر موافقت مصالح ذاتیہ واغراض نفسانیہ کے ساتھ جمع ہو جائے تو خوش ہی خوش رہیں، ناگواری وتکدر کہیں تک بھی نظر آنا مشکل ہو جائے ،تو ''الحب للہ و الغض فی اللّٰہ'' کے بہ جائے بالکل اس کے برعکس ''الحب و البغض للنفس و الشیطان'' ہمارے اندر جاگزیں ہے، کس قدر دردناک اور حسرت ناک مرض میں مبتلا ہیں، کاش ہم سمجھیں اور انجام سوچیں اور جلدی اس کی اصلاح کی فکر اور اہتمام میں مصروف ومشغول ہو جائیں۔

توجس طرح حضرت علیؓ کا حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ یہ برتاؤ خلوص ومحبت کا جاری رہا، بے نفسی ظاہر باہر ہے۔حضرت ابن عمرؓ کو بھی جب محقق ہو گیا کہ حضرت علیؓ حق پر تھے تو رویا کرتے تھے کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی مجھ کو ساتھ دینا چاہیے تھا۔قیامت میں باز پرس ہو کہ علیؓ کی نصرت کیوں نہیں کی تھی تو کیا جواب دوں گا! دیکھا آپ نے؟ حسن نیت کے یہ آثار ہوتے ہیں، وہاں بات اور اپنی رائے کی پیچ اور ضد وخود غرضی نام نشان کو بھی نہ تھی ،جس کا ثمرہ آپس کی پھوٹ اور عدم رؤیت ،صورتِ قطع سلام وکلام ومواکلہ مشاربہ ہوتا، یہ حضرات نہایت عالی الظرف وبلند حوصلہ تھے،ہم کو بھی چاہیے کہ حسن نیت کا اہتمام کریں۔

رجوع الی المدعیٰ

اس تفصیلی بیان واقعات صحابہ وہابیل وقابیل سے محقق ہو گیا کہ **الْقَاتِلُ وَ الْمَقْتُولُ** والی حدیث مطلق نہیں، ورنہ عشرۂ مبشرہ وہابیل کا جہنمی ہونا لازم آئے گا جو صریح غلط ہے،(مذکورہ حدیث) مقید بہ قید حرصِ دنیا و بدنیتی وعصبیت وفتنہ وفساد ہے۔اللہ تعالیٰ ان حضرات کے صدقہ میں ہم سب کو آپس میں حسن نیت کے ساتھ محبت قائم رکھنے اور عصبیت کو جنگ وجدال سے محفوظ رہنے اور جمیع طرق جہنم سے مجتنب رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔(آمین)

۳۰: حَدَّثَنَا سُلَيمَانُ بنُ حَرْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ وَاصِلٍ الأَحْدَبِ، عَنِ المَعْرُورِ بنِ سُوَيْدٍ، قَالَ: لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ، وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ، وَعَلَى غُلاَمِهِ حُلَّةٌ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ: إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ، فَقَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ، إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ۔

اس حدیث اور حضرت ابوذرؓ کے نظریے سے کمیونزم کی حقانیت پر استدلال کرنے والوں کا رد

یہ حدیث باب المعاصی من امر الجاہلیۃ کے تحت سلیمان بن حربؒ استاذِ بخاریؒ کی ہے، اس کے متعلق مضامین بیان ہو چکے، ربط اور مناسبت بھی بیان ہو چکی۔ اب یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنے غلام کے ساتھ مساواتی معاملہ کیوں فرمایا؟ جیسا کہ عبارت "وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ، وَعَلَى غُلاَمِهِ حُلَّةٌ" سے ظاہر ہو رہا ہے، اس معاملۂ ابوذرؓ مع الغلام سے یہ مساواۃ کا مسئلہ مستنبط کرنا (جو آج کل کے بعض غلط ذہنوں میں گونج رہا ہے) صحیح نہیں ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نو تعلیم یافتہ اور ان کے ہم خیال غیر محقق "نیم ملا خطرۂ ایمان" کے مصداق مولویوں کا یہ تخیل ہو گیا ہے کہ کمیونسٹ اور کمیونزم طریقہ نہایت بہترین ہے، یکساں اور مساویانہ زندگی کا حامی ہے، تفوق معیشت کہ کوئی لکھ پتی ہو اور کوئی کوڑی تک کو ترسے، یہ ٹھیک نہیں، یہ انسانیت کے خلاف ہے، مساوات ہونا چاہیے، اسلام میں بھی مساوات کی تعلیم ہے کہ نماز میں امیر و غریب، عالم و جاہل، چھوٹا اور بڑا نماز کی صف میں برابر ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، یہ مساویانہ برتاؤ ہے، اسی طرح حضرت ابوذرؓ اپنے غلام کے ساتھ مساوات

فرمارہے ہیں، اکل وشرب میں اورلباس میں غلام کومثل حلۂ خود حلہ پہناتے ہیں، جس کوآج کل سوٹ کہتے ہیں۔

آج کل عورتوں کالباس اوپر سے نیچے تک، سر سے پیر تک یک رنگ ہوتا ہے، مردوں کا بھی اسی طرح ہونے لگا، خیر خلاف شرع نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ یہی وہ طریق ہے کہ جس کوآج بعض نے نکالا ہے کہ سب کو یکساں ہونا چاہیے۔

اس خیال کے لوگ نو تعلیم یافتہ ہیں اور نوخیز مولوی بھی ان کے شریک ہیں، یہ بالکل غلط ہے، یہ حضرات حضرت ابوذر رضی کی زندگی اوران کے طریق زندگی کو سامنے رکھ رہے ہیں کہ یہ بہت بڑے عابد وزاہد ہیں، بڑے درجے کے صحابی ہیں ۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانہ تک میں وہ کنز اورسیم وزر کے جمع کے سخت خلاف رہے۔

روم کے مقابلہ اسلامی فوج میں یزید سپہ سالار ہیں، اس فوج میں حضرت ابوذر رضی بھی شریک ہیں، اس موقع پر فتح اہل اسلام کو ہوئی تو تقسیم غنائم کے طریق پر حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ نے نکیر فرمائی کہ یہ کیا کہ کسی کو کم، کسی کو زائد؟ کنز بنانا تو غلط ہے، سب کو برابر تقسیم کردو، یزید نے ہر چند سمجھایا مگر ان کے سمجھائے نہ سمجھے، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ نے بھی سمجھایا، ان سے بھی نہیں سمجھے، انھوں نے مدینہ طیبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس بھیج دیا، وہ بھی سمجھارہے ہیں، وہاں حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود ہیں، انھوں نے فرمایا کہ ذرا غور فرمائیے! ہمارے مذہب سابق میں بھی یہ بات تھی اور اسلام تو سہل اور پورا معتدل جمیع وجوہ کی رعایت پر مشتمل ہے، کوئی اس میں ایسی ایک طرفہ نظر پر فیصل نہیں قرار پاتا، اس میں یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ ان کو یہودی بچہ کہہ دیا(۱)، وہ خاموش ہوگئے، دیگر صحابہ رضی بھی ان کو ہر چند سمجھاتے ہیں مگر سب کو جواب دے دیتے ہیں کہ تم سب نے کنز بنانا

(۱) شعب الإيمان، التَّشْدِيدُ عَلَى مَنْعِ زَكَاةِ المَالِ، رقم الحديث: ۳۰۳۷.

شرع کر دیا۔

تو یہ حضرات نو تعلیم یافتہ و نو خیز مولویان کہتے ہیں کہ اس درجہ قوت و مضبوطی کے ساتھ برقرار ہیں، جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ ہیں، اس کے علاوہ بہ موقعہ ہجرت انصار کے اموال، جائداد و ازواج کا مہاجرین میں تقسیم کر کے برابر کا شریک کر دینا بھی صاف بتلا رہا ہے کہ کمیونزم بالکل اسلام کے قریب ہے، نیز حدیث میں وارد ہے :إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا (۱) مطلق اور عام ہے، لہٰذا ضرورت سے زائد میں دوسروں کا حق ہے۔

جواب یہ ہے کہ ایک صحابی کے طور و طریق سے مذہب اسلام اور اسلامی قانون نہیں بنتا، جمہور صحابہ و جمہور علماء کا جو مسلک ہوتا ہے، وہ مذہب کہلاتا ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اس طریق کو جمہور صحابہ اختیار نہیں کر رہے، اس کو پسند نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اس کو مدلول نص کے خلاف فرما رہے ہیں، چناں چہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اس مسلک پر برقرار رہنے اور ہر ایک سے وہی بات کہنے اور منوانے پر مدینہ میں ان کا ایک کھیل سا بن گیا، لڑکے ان کو چھیڑتے رہتے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تنگ ہو کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے جس سے میری زندگی سکون سے گذر جائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مقامِ ربذہ جانے کا مشورہ دیا، جو مدینہ سے تین منزل فاصلہ پر ایک جگہ ہے، چنانچہ دورِ عمری میں یہ ایک چھاؤنی تھی، تیس ہزار گھوڑے یہاں جمع رہتے تھے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لے گئے اور وہیں اپنی بیوی اور غلام کے ساتھ رہنے لگے، حسبِ پیشن گوئی نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ ”ابوذر رضی اللہ عنہ سب سے الگ تھلگ رہے گا، الگ

(۱) سنن الترمذی، عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رضی الله تعالی عنها، کتاب الزکاة عَنْ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ، رقم الحدیث: ٦٦٠ .

تھلگ زندگی گذارے گا (۱)'' وہاں جنگل ہی میں انتقال فرما گئے۔ وہاں ایک قافلہ گذر رہا تھا، انہوں نے ان کے کفن دفن کو انجام دیا۔

غرض حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ آیت کنز کو ظاہر پر محمول فرماتے تھے مگر جمہور صحابہ نے ظاہری مفہوم مراد نہیں لیا۔ اس لیے کہ جب آیت کا نزول ہوا تو تمام صحابہ (رضوان اللہ تعالی علیہم أجمعین) اس کے ظاہری مفہوم اور وعید منصوص سے گھبرا گئے تو حضرت عمرؓ دربار رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر پریشانی اور گھبراہٹ کا ذکر کرتے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس سے زکوٰۃ مراد ہے کہ زکوٰۃ نہیں دیتے، اس کو بھی بچا اور جمع کر کے رکھنے پر یہ وعید ہے؛ کیوں کہ شریعت نے زکوٰۃ ضروری قرار دی یعنی مال کا چالیسواں حصہ غرباء کو دینے کا حکم فرمایا(۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعطائے اموال وتقسیم اموال میں مساوات معہود نہیں، جمع مال کی مطلقاً ممانعت نہیں؛ بلکہ بہ حدودِ شرع اجازت ہے، خود حضور ﷺ جب

---

(۱) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رضی الله تعالی عنه قَالَ:لَمَّا نَفَى عُثْمَانُ أَبَا ذَرٍّ إِلَى الرَّبَذَةِ ,وَأَصَابَهُ بِهَا قَدْرُهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتُهُ وَغُلَامُهُ ,فَأَوْصَاهُمَا أَنِ اغْسِلَانِي وَكَفِّنَانِي وَضَعَانِي عَلَى قَارِعَةِ الطَّرِيقِ ,فَأَوَّلُ رَكْبٍ يَمُرُّ بِكُمْ ,فَقُولُوا :هَذَا أَبُو ذَرٍّ صَاحِبُ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَعِينُونَا عَلَى دَفْنِهِ. فَلَمَّا مَاتَ فَعَلَا ذَلِكَ بِهِ ,ثُمَّ وَضَعَاهُ عَلَى قَارِعَةِ الطَّرِيقِ، وَأَقْبَلَ عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُودٍ فِي رَهْطٍ مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ عُمَّارًا ,فَلَمْ يَرُعْهُمْ إِلَّا بِالْجَنَازَةِ عَلَى ظَهْرِ الطَّرِيقِ قَدْ كَادَتِ الْإِبِلُ أَنْ تَطَأَهَا ,فَقَامَ إِلَيْهِ الْغُلَامُ , فَقَالَ :هَذَا أَبُو ذَرٍّ صَاحِبُ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَعِينُونَا عَلَى دَفْنِهِ، فَاسْتَهَلَّ عَبْدُ اللهِ يَبْكِي , وَيَقُولُ صَدَقَ رَسُولُ اللهِ، تَمْشِي وَحْدَكَ وَتَمُوتُ وَحْدَكَ وَتُبْعَثُ وَحْدَكَ، ثُمَّ نَزَلَ هُوَ وَأَصْحَابُهُ فَوَارَوْهُ، ثُمَّ حَدَّثَهُمْ عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُودٍ حَدِيثَهُ وَمَا قَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي مَسِيرِهِ إِلَى تَبُوكَ.(الطبقات الكبرى:۴/۲۳۴)

(۲) سنن أبي داود، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی الله تعالی عنهما، كِتَاب الزَّكَاةِ،بَابٌ فِي حُقُوقِ الْمَالِ، رقم الحديث:۱۶۶۴.

تجارت فرماتے تھے، بہت مال جمع ہو جاتا تھا، آپ سب کو خرچ نہیں کرتے تھے۔ حضرات صحابہ (رضوان اللہ تعالی علیہم أجمعین) میں بعضے بڑے بڑے مال دار تھے، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ بہت بڑے مال دار تھے، اس کے خرچ کا بھی آپ نے حکم نہیں فرمایا، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ کے برابر آج کوئی مال دار نہیں کہ اونٹوں پر مال آتا تھا، شمار نہ ہوتا، تولا نہیں جاتا، فرمادیتے کسی کونے میں ڈال دو۔ ان حالات سے معلوم ہوا کہ مطلق کثرت مال، تفوق فی المال کنز ممنوع نہیں۔ حضرات شیخین رضی اللہ تعالی عنہما کے ایک موقع پر اخراج کل واخراج نصف پر نصف والے پر وعید نہیں فرمائی (۱)، ترغیب اخراج کل نہیں فرمائی، خود حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس اونٹ، بکری، گدھے، گدھیا، باغ، زمین کافی تھی، معلوم ہوا کہ ان کا بھی یہ خیال صرف نقد کے بارے میں تھا، دیگر کل اموال میں نہیں۔

کمیونزم کی عمارت صریح ظلم پر کھڑی ہے

پس کمیونزم یعنی ایک مالک سے اس کے املاک زمین وغیرہ لے کر دوسرے کو دینا کھلا ظلم ہے اور مسلمان ایسا کریں تو اور بھی زیادہ ظلم ہے، ووٹ (vote) کے ذریعہ نہایت درجہ ظلم ہے، حضرت عثمان وحضرت عبد الرحمٰن بن عوف

---

(۱) یہ غزوۂ تبوک کے واقعے کی طرف اشارہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترغیب دلانے پر حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بڑھ چڑھ کر اپنے اموال خرچ کیے تھے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ گھر کا سارا مال لائے تھے جو چار ہزار درہم کی شکل میں تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا آدھا مال لائے تھے، حیاۃ الصحابہ میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ہل أبقیت لأ ہلک شیئاً؟ تو آپ نے جواب میں عرض کیا: الله ورسوله أعلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا تو عرض کیا: **نعم، نصف ما جئت به**۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ عمل کا علم ہوا تو کہنے لگے: **ما استبقنا إلى خير قط إلا سبقني إليه إلخ**۔ (حیاۃ الصحابۃ للکاندھلوی: ۲/۱۵)

رضی اللہ تعالی عنہما وغیرہ کے حالات سے اس کمیونزم کا باطل ہونا ظاہر ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے بہ ضرورت ایک زمین لی تھی، اس کی قیمت حسبِ دل خواہ بائع ادا فرمائی تھی، سلب نہیں فرمائی ۔ حال میں ابو السعود نے حرم شریف کو وسیع کیا، جگہوں کو خریدا، کئی کئی گنی قیمت ادا فرمائی اور بدلہ میں جگہ مفت عطا فرمائی، سلب نہیں کی تو اسلام میں ایسی مساوات نہیں جس کو آج گاتے پھرتے ہیں۔ خود کمیونسٹ اس کے قائل ہیں کہ مکانات ایک سے لے کر دوسرے کو نہ دئے جائیں، پس پھر کمیونزم کہاں! علاوہ اس کے اس سے ملک وعالم کا انتظام بھی درہم برہم ہوجائے گا : آقا غلام، چھوٹے بڑے کا فرق اٹھ جائے گا۔ اسی سے نظم قائم ہے، جب چھوٹائی بڑائی ختم تو فساد و بربادی ہوگی، تو علاوہ نقل کے ایسی مساوات خود عقل کے بھی خلاف ہے۔

کمیونزم عقل اور قانونِ فطرت کے خلاف ہے

چوں کہ دنیا متضاد چیزوں کا مقام ہے، یہاں لیل کے ساتھ نہار بھی ہے، ظلمت کے ساتھ نور ہے، مرض ہے تو صحت بھی ہے، خود خلقت انسانی میں تفاوت رکھا ہے : کسی کو قدرت نے لحیم وشحیم بنایا ہے، کسی کو سوکھی لکڑی کہ طمانچہ مارو تو گر جائے ۔ رنگت مختلف رکھی: کسی کو گورا بنایا، کسی کو کالا تو ذاتِ باری خالق کائنات نے تفاوت رکھا ہے، معلوم ہوا کہ انھیں عالم میں تفاوت پسند ہے پھر کسی کو مال دار بنایا، کسی کو نادار ومفلس، ایک شخص بہت بڑے عہدے پر فائز ہو گیا، دوسرا کچھ نہیں، حالاں کہ قابلیت وسند، علم وہنر میں دونوں برابر ہیں تو عقل بھی کہتی ہے کہ ایسی مساوات جو آج کل بتلائی اور بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ بالکل بھی صحیح نہیں۔

اور لطف یہ ہے کہ حامیین اور قائلین مساوات مذکورہ اپنے متعلق خود بھی یہ

مساوات پسند نہیں کرتے، خود بڑی تن خواہ پاتے ہیں اور اپنے چپراسی کو نہایت قلیل دیتے ہیں، اپنے لیے کرسی، فرنیچر، ہوائی جہاز اور دوسرے کے پاس فرش اور گاڑی بھی نہیں۔

قائلین مساوات کے دلائل کے جوابات

ہجرت کے واقعہ کو (دلیل میں) پیش کیا، وہ احکام منسوخ کردئے گئے، ایک وقت محدود کے لیے وہ احکام مقرر فرمائے تھے (۱)۔ ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ [التوبة: ۱۰۳]: ان کے اموال سے صدقہ لے کر ان کو پاکیزہ کردیجیے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت ابوذرؓ کے مسلک کے موافق یہ اور دیگر احادیث وآثار اس آیت (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً الآية) سے منسوخ ہوگئے (۲)۔

---

(۱) (وَأُولُوا الْأَرْحامِ بَعْضُهُمْ أَوْلى بِبَعْضٍ فِي كِتابِ اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهاجِرِينَ) قِيلَ: إِنَّهُ أَرَادَ بِالْمُؤْمِنِينَ الأنصار، وبالمهاجرين قريشا. وفية قولان: أَحَدُهُمَا: أَنَّهُ نَاسِخٌ لِلتَّوَارُثِ بِالْهِجْرَةِ. حَكَى سَعِيدٌ عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: كَانَ نَزَلَ فِي سُورَةِ الْأَنْفَالِ" وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّى يُهاجِرُوا" [الأنفال: ۷۲] فَتَوَارَثَ الْمُسْلِمُونَ بِالْهِجْرَةِ، فَكَانَ لَا يَرِثُ الْأَعْرَابِيُّ الْمُسْلِمُ مِنْ قَرِيبِهِ الْمُسْلِمِ الْمُهَاجِرِ شَيْئًا حَتَّى يُهَاجِرَ، ثُمَّ نُسِخَ ذَلِك فِي هَذِهِ السُّورَةِ بقوله: " وَأُولُوا الْأَرْحامِ بَعْضُهُمْ أَوْلى بِبَعْضٍ" إلخ. (تفسير القرطبى: ۱۴/۱۲۴)

(۲) وأخرج ابن أبي حاتم وأبو الشيخ عن عراك بن مالك وعمر بن عبد العزيز رضي الله عنهما أنهما قالا: في قول الله {والذين يكنزون الذهب والفضة} قالا: نسختها الآية الأخرى (خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها) (الآية)) (الدرالمنثور: ۴/۱۷۹، فى تفسير قوله تعالى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ الآية﴾ [التوبة: ۳۴])

صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کنز والی آیت سے زکوٰۃ کا حکم مؤکد کرنا ہے، اس سے زکوٰۃ مراد ہے، الذہب والفضۃ میں الف لام عہد کا ہے یعنی زکوٰۃ والا سونا چاندی مراد ہے کہ زکوٰۃ روک کر سونا چاندی جمع کیا جائے، اس پر وعید ہے(۱) تو زکوٰۃ فرض ہے بس۔ اور مال تقسیم کرنا فرض اور ضروری نہیں؛ البتہ زمانۂ اضطرار عمومی یا شخصی میں واجب ہوجاتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ صدقات سے امداد واجب ہوگی، یہ ایک وقتی چیز ہے، اس سے حکم اسلام مساوات سمجھنا درست نہیں۔

غرض حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ ایک شخصی حالت ہے جس کو قانون اسلام نہیں بنایا جاسکتا، اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ جب انھوں نے اپنے غلام یا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو طعنہ دیا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی اور اس سلسلے میں علاجاً چند ہدایات ارشاد فرمائی تھیں جن کا حاصل غلاموں کے ساتھ مساوات کا حکم تھا، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالی عنہ نے ظاہر حدیث مساوات پر ہی عمل فرمایا؛ تاکہ اپنے نفس کی اصلاح زیادہ تشدد اور سختی کے ساتھ کریں، دیگر صحابہ بھی تنبیہ نبوی پر اسی طرح نفس پر تشدد و سختی کے ساتھ پیش آتے تھے اور ظاہر حدیث پر پوری مضبوطی کے ساتھ عامل ہوتے تھے، پس حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا یہی اثر کیا، اس کے مثل دوسرے آثار بھی ہیں۔

اس سبب سے بھی کہ اہل مکہ شان بان والے تھے، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے، ان کی بیویاں پلٹ کر جواب نہ دے سکتی تھیں، غلاموں کے ساتھ تو وہ رعایت کا معاملہ کیا کرتے؟۔ مدینہ آکر جب وہاں کی عورتوں کی مردوں پر غالبیت دیکھی

(۱) وفسر غير واحد الانفاق في سبيل الله بالزكاة لماروي عن ابن عباس رضي الله تعالى أنه لما نزلت هذه الآية كبر ذلك على المسلمين فقال عمر رضي الله تعالى عنه.(روح المعاني:۴/ ۲۷۹،فی تفسیر قوله تعالى:﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ الآية ﴾ [التوبة:۳۴])

تو کچھ دیکھا دیکھی ان کی عورتوں نے بھی جواب دینا شروع کر دئے، حتی کہ زوجۂ ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالی عنہا کی بھی دربارِ نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام میں یہ شکایات پیش کی گئیں، ازواج مطہرات بھی ناز نخرے سے پیش آجایا کرتیں، حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہماری بیویوں کو کیا ہوا! ایک وہ زمانہ تھا کہ مجالِ سخن نہ رکھتی تھیں (چنانچہ ایک مرتبہ نفقۂ معہودہ پر زیادتی طلب کی جس پر آپ رنجیدہ ہو کر گوشہ نشیں ہو گئے تھے الخ) اب لوٹ کر جواب دے دیتی ہیں (۱)۔ ان کے مزاجوں کی تعدیل میں ہدایات وتعلیمات نبویہ نے صورتاً مساوات پیدا کر دی تھی، فی الحقیقت مواسات مقصود تھی، نہ کہ مساوات، اور اگر مساوات بھی تسلیم کر لی جائے تو ابتداءً تھی بعد میں منسوخ ہو گئی اسی پر اجماع ہے۔

مواساۃ کے معنی زکوٰۃ کے علاوہ سے حاجت روائی کرنا، یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ خود عیش اور خوش حالی میں ہے اور پڑوسی فاقہ کشی میں مبتلا رہے یا دیگر اعتبار سے پستی میں رہے اور یہ باوجود قادر علی النصرت ہونے کے اس کی ہم دردی اور مددگاری نہیں کرتا، زکوٰۃ پر ہی بس کیے ہوئے ہے، یہ سخت ناپسند حالت ہے، اخوتِ اسلامی کا تقاضا یہی ہے کہ مواسات ہو۔

الغرض! اس حدیث سے شرعاً مساوات سمجھنا غلط ہے کہ اگر کوئی امیر شوربا،

(۱) حضرت صدیق اکبرؓ کے اس واقعے پر احقر مطلع نہیں ہوسکا، البتہ حضرت عمرؓ کا یہ قول امام بخاریؒ وغیرہ نے اپنی اپنی کتابوں میں اس واقعے کے ذیل میں نقل کیا ہے جس کی طرف یہاں بین القوسین اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج سے ناراض ہو کر ایک مہینے کے لیے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے، اس وقت حضرت عمرؓ حاضرِ خدمت ہوئے تھے اور دورانِ گفتگو یہ جملہ عرض کیا تھا: يَا رَسُولَ اللهِ، لَوْ رَأَيْتَنِي وَكُنَّا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ نَغْلِبُ النِّسَاءَ، فَلَمَّا قَدِمْنَا المَدِينَةَ إِذَا قَوْمٌ تَغْلِبُهُمْ نِسَاؤُهُمْ، فَتَبَسَّمَ النَّبِيُّ ﷺ الحديث۔ (صحیح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، كِتَاب المَظَالِمِ وَالغَصْبِ، بَاب الغُرْفَةِ وَالعُلِّيَّةِ المُشْرِفَةِ وَغَيْرِ المُشْرِفَةِ فِي السُّطُوحِ وَغَيْرِهَا، رقم الحديث: ۲۴۶۸)

بریانی، قورمہ کھائے تو ملازم کو بھی قورمہ بریانی ہی کھلائے، اگر اپنے ماتحت کو پتلا شوربا کھلائے تو خود بھی وہی کھایا کریں، آیات واحادیث وواقعاتِ عمومیہ اس کے مؤید نہیں اور واقعاتِ شخصیہ جزئیہ مسلک اور مذہب نہیں؛ لہٰذا اس سے مساوات ثابت نہیں۔

خود حدیث کا مدلول برعکس ہے کہ "مِمَّا" فرمایا کہ "مِن" تبعیض کے لیے ہے، مطلب یہ ہوا کہ بعینہٖ یا آدھا کچھ نہیں فرمایا، نہ یہی فرمایا کہ روزانہ دیا کرو، جی خوش کرنے کو کبھی دے دیا، کبھی ساتھ کھلالیا، چوں کہ اہل مکہ (جیسا کہ معلوم ہو چکا) ناز ونعم سے زندگی گذارنے کے خوگر تھے، چھوٹوں کو حقیر سمجھتے تھے، خلافِ مقدرت کام لیتے۔ آپ نے اعتدال کی تعلیم فرمائی۔

آئین اور قانون سازی کے سلسلے میں ایک بہترین اصول

اسی طرح کفارِ مکہ زمانۂ حیض میں عورت سے مقاطعہ رکھتے، پاک ہونے تک الگ تھلگ، کھانا پینا بیٹھنا اٹھنا سب جدا، حضور ﷺ نے اس کو اپنے عمل سے بھی اعتدال میں تبدیل فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایامِ عادت میں حضور ﷺ میرے بستر پر لیٹ جاتے تھے، میرا جوٹھا پی لیتے (۱)، آپ نے اس کو بالکل بدل دیا۔ چوں کہ قاعدہ ہے کہ جب زیادہ کجی آجاتی ہے تو برعکس موڑ دینے سے

(۱) عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ تعالی عنها قَالَتْ: كُنْتُ أَشْرَبُ وَأَنَا حَائِضٌ، ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعِ فِيَّ، فَيَشْرَبُ، وَأَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَأَنَا حَائِضٌ، ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعِ فِيَّ. (صحیح مسلم، كِتَابُ الْحَيْضِ، بَابُ جَوَازِ غُسْلِ الْحَائِضِ رَأْسَ زَوْجِهَا إلخ، رقم الحديث: ۳۰۰) وفی حدیث میمونة رضی اللہ تعالی عنها: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَضْطَجِعُ مَعِي وَأَنَا حَائِضٌ، وَبَيْنِي وَبَيْنَهُ ثَوْبٌ. (صحیح مسلم، كِتَابُ الْحَيْضِ، بَابُ الاضْطِجَاعِ مَعَ الْحَائِضِ فِي لِحَافٍ وَاحِدٍ، رقم الحديث: ۲۹۵)

اعتدال پیدا ہوجاتا ہے، جیسے کاغذ مڑا ہوا ہوتو اس کو سیدھا کرنے کے لیے اس کے برعکس موڑتے ہیں، اس لیے ایسی تعلیمات جو اعتدال میں لانے کے لیے مساواتی ہیں، وہ آئین نہیں بن سکتیں۔ آئین وہ ہوتے ہیں جو ابتلا کے بعد مستقل حیثیت سے ہوں، تعامل دیکھیے، وہ خود حجت ہے، یہ تقریر اساتذہ کی برکت سے آپ کے سامنے بیان کی گئی؛ تاکہ فریب اہل زمانہ سے حفاظت ہو۔ یہ باب ختم ہوگیا۔

بَابٌ :ظُلْمٌ دُونَ ظُلْمٍ

۳۱: حَدَّثَنَا أَبُو الوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ح قَالَ: و حَدَّثَنِي بِشْرُ بْنُ خَالِدٍ أَبُو مُحَمَّدٍ العَسْكَرِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ: {الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا} [الأنعام: ۸۲] إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ قَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ: أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ؟ فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: {إِنَّ الشِّرْكَ} [لقمان: ۱۳] لَظُلْمٌ عَظِيمٌ.

مختصر گفتگو کرکے ختم کردیا جائے گا۔ یہ ردمرجیہ میں منفی پہلو ہے۔ پہلے "بَابُ كُفْرٍ دُونَ كُفْرٍ" پر تقریر ہوچکی، وہاں بتلایا گیا تھا کہ چار باب اسی سلسلہ کے ہیں۔

تارکِ صلوٰۃ پر اطلاقِ کفر والی نصوص کا جواب

جس طرح کفر میں درجات نکلتے ہیں، اس طرح ظلم میں بھی درجات نکلتے ہیں: ایک ظلم دوسرے ظلم کا غیر اور ایک دوسرے سے کم ہے، بعض نے اس طرح توجیہ کی، بعض نے اس طرح، تو ظلم اور معاصی سے کفر میں اور طاعت وعمل خیر سے ایمان میں مراتب متفاوتہ نکل آئیں گے۔ مگر کفر اور چیز ہے، کافر اور چیز ہے، یہ آج نئی بات کہتا ہوں کہ اطلاقِ کفر تو کرسکتے ہیں، یہ اطلاق تو صحیح ہے مگر کسی پر اطلاقِ کافر صحیح نہیں، تارکِ صلوٰۃ کو کافر نہیں کہہ سکتے اور ارشاد نبوی علی صاحبہ

الصلوۃ والسلام ”مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَر (١)“ بطور محاورہ ہے، اسی طور پر آیت تکلیف ﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الروم : ۳۱] میں بھی یہ عنوان تہدیدی و تغلیظی ہے، جب کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں: ”یہ کیا کافرانہ حرکتیں ہیں!، آپ بھی کیا کفر کی سی باتیں کرتے ہیں! لاحول ولاقوۃ إلا باللہ۔ آپ جب کسی کو دیکھیں کہ کفر کے سے کام کرتا ہے تو اس کو اس طرح کی بات کہہ سکتے ہیں مگر اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ تو کافر ہے“۔

معتزلہ وخوارج پر رد

تو اس سے مرجیہ کے ساتھ معتزلہ وخوارج کی بھی تردید ہوگئی کہ کفر کے مراتب ہیں؛ اس لیے کسی مرتکب کبیرہ کو کافر (جس کے معنی مخلد فی النار ہیں) نہیں کہہ سکتے۔

اس کی دلیل میں امام بخاریؒ نے اولاً یہ آیت پیش فرمائی: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [الأنعام : ۸۲] کہ جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، ان کے لیے امن ہے اور یہ ہدایت یافتہ ہیں، صحابہؓ کا ذہن ظلم سے مطلق معصیت کی طرف گیا، بس گھبرا کر دربارِ نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام میں حاضری ہوئی اور اور عرض کیا: أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ؟ معصیت سے تو کوئی خالی نہیں، بڑی معصیت نہیں کی، چھوٹی تو کی ہے، اب تو نجات مشکل ہے، اس پر آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان] کہ شرک بڑا ظلم ہے، معلوم ہوا کہ یہاں تنوین برائے تعظیم ہے اور مراد ظلم سے ظلم عظیم یعنی شرک ہے، تب

(۱) اس حدیث کی تخریج ”بَابُ كُفْرٍ دُونَ كُفْرٍ“ میں گذر چکی ہے۔

صحابہؓ کو چین آیا(۱)۔

خطابی کے نزدیک منشائے اشکال صحابہؓ یہ تھا کہ صحابہؓ ظلم کا اطلاق شرک وکفر سے نیچے معاصی کبائر صغائر پر جانتے تھے، اس لیے شرک کفر کی طرف ذہن بھی نہیں گیا کہ وہ مراد ہوسکتا ہے، بالیقین اس کو معاصی کے لیے سمجھے اور مطلق معاصی سے کوئی پاک نہیں علاوہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس کا عموم اطلاق علی الکفر والشرک والمعاصی معلوم تو تھا لیکن نکرہ کے تحت النفی ہونے کے سبب عموم سمجھے۔ بہرحال! جواب سے تعین مرادی ہوگئی، اشکال اور پریشانی وضع ہوگئی (۲)۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب اس آیت کے متعلق بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیتِ سورۂ لقمان پہلے نازل ہوچکی تھی تو سوال پیدا ہوگا کہ پھر اشکال کیوں پیش آیا(۳)؟۔

جواب یہ ہوگا کہ وہ حضرات اصحابِ ورع وتقوی تھے، اس لیے عمومِ عنوان سے ذہن احتیاطی بہ غلبۂ خشیت عمومِ مراد ہی کی طرف گیا اور بوجہ غلبۂ خشیت اس

(۱) قلت التنوين في بظلم للتعظيم فكأنه قال لم يلبسوا إيمانهم بظلم عظيم. (الكرماني: ۱/۱۴۶)

(۲) فتح الباري لابن حجر: ۱/۸۸.

(۳) واقتضت رواية شعبة هذه أن هذا السؤال سبب نزول الآية الأخرى التي في لقمان لكن رواه البخاري ومسلم من طريق أخرى عن الأعمش وهو سليمان المذكور في حديث الباب ففي رواية جرير عنه فقالوا أينا لم يلبس إيمانه بظلم فقال ليس بذلك ألا تسمعون إلى قول لقمان وفي رواية وكيع عنه فقال ليس كما تظنون وفي رواية عيسى بن يونس إنما هو الشرك ألم تسمعوا إلى ما قال لقمان وظاهر هذا أن الآية التي في لقمان كانت معلومة عندهم ولذلك نبههم عليها ويحتمل أن يكون نزولها وقع في الحال فتلاها عليهم ثم نبههم فتلتئم الروايتان. (فتح الباري لابن حجر: ۱/۸۸)

طرف سے ذہول ہوگیا، التفات نہ رہا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ بڑوں کو صحابہؓ کو غلبۂ حال ہوجاتا ہے پھر حضور اقدس ﷺ نے وہ آیت یاد دلا کر تسلی فرمادی، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت ﷺ کے سفر آخرت پر جب کہ تمام صحابہؓ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ پر بھی غلبۂ غم طاری ہوگیا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ نے آپ کی وفات شریف وغیرہ کی آیات یاد دلا کر تسلی فرمائی تھی، صحابہؓ فرماتے تھے کہ اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ یہ آیات ابھی نازل ہوئیں (۱)۔ اس درجہ ذہن سے اوجھل ہوگئیں تھیں۔

حضرت نانوتویؒ کی جانب سے مذکورہ اشکال کا جواب

ان جوابات کے علاوہ ایک جواب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو ہم سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے، ان سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اور انھوں نے براہ راست حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا کہ یہاں "لبس" کا لفظ فرمایا، "خلط" نہیں فرمایا۔ ان دونوں میں فرق ہے :اول کے معنی رَلنا اور ثانی کے معنی ملنا ہماری زبان میں رائج ہے۔ مثال یہ ہے کہ ایک بچہ انگلی پکڑے اپنے والد صاحب کی بازار میں جارہا تھا کہ اچانک انگلی چھوٹ گئی، والد صاحب کو دوسری طرف توجہ ہوجانے سے اس کا احساس نہ ہوا، کچھ دیر کے بعد جو التفات ہوا تو بچہ غائب! اب بہت تلاش کررہے ہیں مگر مل نہیں رہا، اس کو کہتے ہیں کہ بچہ رَل گیا تو یہاں دوسرے افرادِ انسانیہ کے ساتھ اتحادِ محل نہیں بلکہ اشتباہ ہوگیا کہ ظہورِ تمیز مرتفع ہوگیا، برخلاف خلط کے کہ اتحاد فی المحل پر صادق آتا ہے، جیسے ایک کا تیل دوسرے کے گھڑے میں مخلوط ہوگیا، مل گیا کہ تمیُّز ہی معدوم ہوگیا، کوئی صورت

(۱) صحيح البخاری، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رضی الله تعالی عنهما، كِتَابُ المَغَازِي، بَابُ مَرَضِ النَّبِيِّ ﷺ وَوَفَاتِهِ، رقم الحديث: ۴۴۵۴.

ہی نہیں جدا جدا کرنے کی، دونوں میں خلط ہوتا ہے، گو نوعیت الگ الگ ہے اور خلط وہاں ممکن ہے کہ محل متحد ہو، اس لیے اشکال صحابہؓ بنظر الی ظلم تھا، اور جواب نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام ناظر الی اللبس ہے۔

حاصل یہ کہ ایمان کے ساتھ وہی ظلم مل سکتا ہے جس کا ظرف ایمان کا ظرف یعنی قلب ہو اور وہ کفر شرک ہے؛ اس لیے یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ برخلاف معاصی کے کہ ان کے محل جوارح ہیں، ان کا ایمان کے ساتھ اختلاط متصور ہی نہیں ہوسکتا، پھر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لبس فرمایا، خلط نہیں فرمایا، چوں کہ لبس میں اختلاط صوری ہوتا ہے اور ضدین میں بھی ممکن ہے، خلط میں اتحاد حقیقی ہوتا ہے جو ضدین میں ممکن نہیں، حضرت نانوتویؒ بہت دور پہنچے، بڑی اونچی شان رکھتے تھے۔

حضرت تھانویؒ سے سنا ہے کہ ایک دفعہ حضرت مولانا نانوتویؒ نے حضرت گنگوہیؒ سے کہا: جیسا فقہ آپ کو آتا ہے، مجھے نہیں آتا۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا: ہم کو چند مسئلے یاد ہوگئے تو رشک فرمانے لگے اور آپ مجتہد بنے بیٹھے ہیں، ہمیں کبھی رشک نہیں ہوا۔

اکابر دیوبند کی بے نفسی کا ایک واقعہ

ان حضرات کا حال عجیب ہی تھا، ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ گنگوہ تشریف لے گئے، نماز جماعت کھڑی ہوگئی تھی، مسجد میں پہنچے، کسی کے منھ سے آواز نکل گئی کہ مولانا یعقوب صاحبؒ تشریف لے آئے، حضرت گنگوہی مصلے پر پہنچ چکے تھے، وہیں سے فرمایا: مولانا وضوء ہے؟ انھوں نے جواب دیا: جی ہاں!، فرمایا: تشریف لائیں (مصلے سے پیچھے ہٹ گئے) فرمایا: نماز پڑھائیے۔ یہ بھی بلا تکلف ہیئت سفر کے ساتھ ہی کہ پائجامہ ٹخنوں سے اونچا پنڈلیوں پر تھا، جیسا کہ

سفر میں پیدل چلتے وقت چڑھا لیا کرتے ہیں، گرد بھی لگی تھی، مصلے پر کھڑے ہو گئے۔ حضرت گنگوہیؒ آگے بڑھے، کہا : ذرا ٹھہریے اور بہ دستِ خود اپنے رومال سے گرد جھاڑی اور پائنچے اتار دیے اور کہا: اب پڑھائیے۔ وہ بھی بلا تکلف کھڑے رہے، نہ ادھر سے تکلف نہ ادھر سے، حضرت گنگوہیؒ کے وہاں مریدین شاگردین کا مجمع تھا۔ کچھ خیال نہیں فرمایا کہ یہ کیا کہیں گے، میرا وقار کم ہوگا، ان کا بڑھے گا، یہ خام خیالی وہاں نہ تھی، تواضع میں حضرت گنگوہیؒ کا یہ حال تھا لیکن نظام شریعت بہت اونچا تھا۔ ایسے تھے یہ حضرات۔

اہل حق کے مذہب کا اثبات اور اہل باطل کے مذہب کا بطلان

درجاتِ ظلم مختلف ہیں، اس سے کفر وشرک میں تفاوتِ مراتب ہوا اور درجاتِ ظلمات کے اختلاف سے ایمان کے تفاوتِ مراتب کا ثبوت ہوا تو ایمان میں ترکیب ثابت بطریق لزوم لعلاقۂ ضدیت، پس معاصی اور طاعات کو ایمان میں دخل ہوا، مرجیہ کا مذہب باطل اور ترکیب ایمان سے نقصان وزیادت ثابت، جو مسلک امام بخاریؒ کا تھا، وہ حاصل وظاہر ہو گیا، اس باب سے اور ماقبل باب سے مناسبت کے ساتھ کتاب الایمان کے ساتھ مناسبت ثابت۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

☆☆☆

الدرس الثانی والأربعون

بَابُ عَلامَاتِ النِّفَاقِ

۳۲: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكِ بْنِ أَبِي عَامِرٍ أَبُو سُهَيْلٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: " آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ "

۳۳: حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الأَعْمَشِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُرَّةَ عَنْ مَسْرُوقٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: " أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ " تَابَعَهُ شُعْبَةُ، عَنِ الأَعْمَشِ

"بَابُ عَلامَاتِ النِّفَاقِ" کا تلفظ فرما کر اس کا ترجمہ تا ختم حدیث فرما کر یوں شروع فرمایا:

بابِ سابق سے مناسبت

اوپر منفی طریقہ سے ایمان کے ذی اجزاء ہونے کو بیان فرمارہے تھے، اسی سلسلہ طورِ نفی میں کفر کا ذی اجزاء ہونا بتلا کر بہ علاقۂ ضدیت التزاماً ایمان کا ذی اجزاء ہونا فرمایا تھا پھر بَابٌ: ظُلْمٌ دُونَ ظُلْمٍ کے تحت شرک وکفر کا انتہائی ظلم ہونا ثابت فرمایا تھا، وہاں ظلم کا اطلاق شرک وکفر ہونا معلوم ہوا تھا۔ یہاں نفاق کا ذکر ہے اور نفاق ایمان کی ضد اور کفر ہے تو جس طرح ظلم میں مراتب ودرجات ثابت ہوئے، اتحادِ موضوع کے سبب نفاق میں بھی درجات ومراتب کا ہونا لازم وثابت ہوگیا۔

اہل حق کے مذہب کا اثبات

اور اہل باطل کے مذہب کا بطلان

نفاق ایک صوری ہوتا ہے، ایک حقیقی، ایک نفاق خالص ہوتا ہے، ایک غیر خالص تو جیسے ظلم ظلم میں فرق ہوتا ہے، نفاق نفاق میں بھی فرق ہے، اُس کا اطلاق شرک پر، اِس کا اطلاق کفر پر ہوتا ہے اور مقصد اس باب سے بھی مرجیہ، خوارج ومعتزلہ کی تردید ہے تو جیسے ظلم کے وجودِ مراتب سے ایمان میں ضعف ونقصان آتا ہے، اسی طرح جس درجہ نفاق ہوگا، اسی درجہ کفر آ کر ایمان میں کمزوری ونقصان پیدا ہوگا تو نفاق معصیت ہوا، پس چند نفاقی امور سے ایمان میں زیادہ نقصان آئے گا اور جوں جوں علاماتِ نفاق کم ہوں گی، ایمان بڑھے گا، ایک کے بڑھنے سے دوسرے کا بڑھنا لازم، ایک کے عدم سے دوسرے کا کمال ہوتا ہے۔ پس اعمال کا ایمان میں بے دخل ہونا بھی غلط، جیسا کہ مرجیہ کا مذہب ہے اور مطلق اعمالِ سوء سے ایمان سے خارج ہوجانا اور کفر میں داخل ہونا بھی غلط، جیسا کہ خوارج ومعتزلہ کا مذہب ہے۔

امام بخاریؒ نے ایمان کے بیان میں کسی جگہ ''**علامة الإیمان**'' فرمایا تھا اور کہیں ''**آیۃُ الایمان**'' کا عنوان اختیار فرمایا تھا، اسی طرح اس کی ضد بیانِ نفاق میں بھی کہیں ''**عَلامَاتُ النِّفَاقِ**'' کا عنوان لائے اور کسی جگہ ''**آیۃُ النِّفاقِ**'' کا عنوان لائے۔

احادیث میں علاماتِ نفاق بیان فرمائی گئیں، اس سے سرسری فہم ونظر سے ایک غلطی ہوجاتی ہے کہ علامات دیکھنے سے ذی علامات یعنی نفاق کا حکم کردیا جاتا اور منافق کہہ دیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں؛ اس لیے کہ ایسا حکم علت کو دیکھ کر

لگانا درست ہوتا ہے، ہر جگہ نہیں، اس لیے قبل حقیقت نفاق بیان کرنے کے علت اور علامت میں فرق بتلا دینا ضروری ہے۔

علامت اور علت میں فرق

(۱) ایک فرق تو یہ ہے کہ کسی شئے کی علتیں متعدد نہیں ہوتیں اور علامات واسبابِ شئے متعدد ومختلف ہوجاتے ہیں۔(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ علت پر معلول کا ترتب ضروری ہوتا ہے اور علامات واسباب پر ذی علامت ومسبب کا ترتب ضروری نہیں ہوتا، مثلاً شربِ ماء رفع عطش کے لیے علامت وسبب ہے لیکن رفع عطش اسی کے ساتھ مخصوص نہیں، چناں چہ شربِ ماء نہ ہو، شربِ خمر ہو، تب بھی رفع عطش ہوجائے گی تو اسباب وعلامات پیاس دفع ہونے کے مختلف ہیں، کوئی ایک بھی پینے کی چیز استعمال کرلی جائے، رفع عطش اسی پر مرتب ہوجائے گا، قطع نظر اس سے کہ وہ شئے حرام ہو یا حلال ہو، اسی طرح دفع جوع کے لیے اکل طعام سبب ہے مگر دفع جوع اس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دفع جوع کے اسباب متعدد اور مختلف ہیں: غلہ کی قسم سے کوئی چیز روٹی وغیرہ کا اکل ہوجائے یا پھل کی جنس سے سیب وغیرہ کا استعمال ہوجائے پھر حلال چیز پر ہی دفع جوع موقوف نہیں، تو علامات واسبابِ شئے متعدد ومتنوع ہوتے ہیں۔

نیز ایک فرد کے تحقق کے ساتھ ترتب ذی علامت مخصوص نہیں ہوتا، کسی بھی فرد کے تحقق سے بھی ترتب وجود ممکن ہے، ضروری نہیں۔ **كما هو حال سائر الأسباب العادية**۔ اسی بناء پر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات اسباب کے تحقق کے باوجود مسبب مرتب نہیں ہوتا، جیسا کہ استعمالِ ادویہ کے باوجود عدم حصول شفا، اسبابِ کسب کے باوجود عدمِ حصولِ مطلوب، علاماتِ شئے موجود، شئے غیر موجود۔ بادل وبارش اور علاماتِ قیامت کی مثال سامنے ہے۔

برخلاف علت کے کہ علت کے ساتھ معلول خاص ہے اور ضروری ہے کہ علت موجود ہو تو معلول بھی موجود ہو، علت معدوم ہو تو معلول بھی معدوم ہو، پس علامات کے وجود سے حکم وجودِ شئے صحیح نہیں ہوگا، جیسے چہرہ کی زردی علامت ہے خوف کی مگر چہرہ کی زردی دیکھ کر حکم لگا دینا کہ خائف ہے، یہ صحیح نہیں؛ اس لیے کہ یہ زردی کبھی غلبۂ صفراء کے باعث بھی ہوتی ہے، مثلاً کوئی شخص کہے کہ اس کا رنگ تو اچھا کھلا ہوا تھا، اب سیاہی آ گئی، معلوم ہوتا ہے کہ رنج وغم ہے، یہ حکم لگانا بھی صحیح نہیں، چوں کہ غلبۂ صفراء وسوداء بھی اس کا سبب ہوتا ہے، پس علامت کو دیکھ کر حکم جلدی نہیں لگانا چاہیے، اس میں توقف وتأمل ضروری ہے۔

اسی طرح دیکھئے! علاماتِ قیامت کا کتنے زمانہ پہلے سے وقوع ہو رہا ہے، آپ ﷺ کی وفاتِ شریفہ بلکہ ولادتِ شریفہ خود علامت قیامت ہے اور ہمارے زمانے میں تو بہت سالوں سے بالکل کھلی کھلی علامات ظاہر ہوتی جا رہی ہیں مگر قیامت کا اب تک وقوع نہیں، معلوم ہوا کہ علامات دیکھ کر ذی علامت کا حکم لگا دینا اور اس کے وجود کا قائل وزاعم ہو جانا ہرگز روا نہیں۔

علاماتِ نفاق دیکھ کر کسی پر منافق ہونے کا حکم لگانا درست نہیں ہے

تو آسانی سے اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا کہ کسی میں علامات نفاق دیکھ کر ”هٰذَا مُنَافِقٌ“ کہہ دینا غلط ہے۔

اس پر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں تو آیا ہے، کہا جائے گا کہ ان کا علم ویسا ہی سرسری ہے، گہراؤ نہیں رکھتا، معلوم ہوا کہ کسی محقق سے نہیں پڑھا، حدیث کا مطلب یہ ہے، آپ ﷺ اس بات کی طرف اور اس خطرہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ

جب علاماتِ نفاق پائی جارہی ہیں تو خطرہ لگ چکا ہے، شدہ شدہ کہیں منافق نہ ہوجائے، بہت جلدی نہ کرو۔ اہتمام سے اس کا انتظام کردینا ضروری ہے کہ ان علامات کو ختم اور اسبابِ نفاق کی روک تھام اوران کا اپنے اندر سے قلع قمع کردیا جائے(۱)۔

یہ ایسا ہے کہ علاماتِ قیامت کا تسلسل جاری ہے تو عن قریب ہی ایک وقت پر قیامت کا وقوع وجود ہوجائے گا یا جیسے سرعت نبض پتہ دے رہی ہے کہ حیات عن قریب ختم ہوجائے گی، بعض دفعہ اس قدر سریع رفتار ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک گھنٹہ بھی اب زندگی مشکل ہے تو کیا اس علامت کے مشاہدہ سے موت کے وقوع کا حکم لگادیں گے؟ اوراس کو مردہ سمجھ لیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہی سمجھنا ہوگا کہ نبض کی حرکت وسرعت بڑھتے بڑھتے خطرہ ہے کہ موت واقع ہوجائے گی۔

تو مطلب صاف ہوگیا ہے کہ علاماتِ منافق رکھنے والا مسلم شرعاً منافق نہیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ کیا کافرانہ یا مشرکانہ یا چمارانہ یا منافقانہ حرکات ہیں! یہ تو نفاقی بات ہے، آپ کے منہ سے تو یہ اچھی نہیں لگتی، تمھارے اندر یہ بات بڑے افسوس کے قابل ہیں، یہ تو منافق کی شان ہے، آپ کی شان تو اس سے بلند بالاتر ہے(۱)۔

---

(۱) وقال البيضاوي :يحتمل أن يكون عاما لينزجر الكل عن هذه الخصال على آكد وجه إيذانا بأنها طلائع النفاق الذي هو أسمج القبائح؛ لأنه كفر ضموا إليه الاستهزاء والخداع برب الأرباب، ومسبب الأسباب، فيعلم من ذلك أنها منافية لحال المسلمين، فينبغي للمسلم ألا يرتع حولها، فإن من رتع حول الحمى يوشك أن يقع فيه.(مرقاة المفاتيح: ۱/۱۲۷،باب الكبائر وعلامات النفاق، الفصل الأول)

(۲) ويحتمل أن المراد بالمنافق المنافق العرفي، وهو من يخالف سره علنه مطلقا، ويشهد له قوله :ومن كانت فيه خصلة، وكذا قوله :خالصا ; لأن الخصال التي يتم بها المخالفة بين السر والعلن لا تزيد على هذا.(مرقاة المفاتيح: ۱/۱۲۷،باب الكبائر وعلامات النفاق،الفصل الأول)

"كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا" پر اشکال اور جوابات

دوسری حدیث میں كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا ہے، اس سے بہ ظاہر اشکال ہوتا ہے کہ اس سے شرعی منافق معلوم ہوتا ہے پھر اس کو جس میں یہ خصلتیں ہوں، کیسے منافق نہ کہیں؟ (۱) پہلا جواب یہ ہے کہ مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والا ان خصلتوں کو کسی شخص میں جمع دیکھ کر یہ خیال کرے گا یا یہ کہے گا کہ تم خالص منافق ہی ہو گئے، پس شرعی اصطلاح کے اعتبار سے منافق ہونا مراد نہیں؛ ورنہ لازم آئے گا کہ جس مسلم میں ایسی خصلتیں ہوں، وہ جہنم کے درک اسفل میں ہمیشہ رہے، حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں بلکہ مسلم خواہ کیسا بھی ہو، ابدی جہنمی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اعمال بد کی پاداش میں جہنم میں داخل ہو جائے لیکن سزا بھگت کر جنت میں آخر داخل ہو ہی جائے گا۔

(۲) دوسری توجیہ و جواب یہ ہے کہ یہ حدیث آپ نے ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے جو آپ کے زمانہ میں ان خصائل سے ملوث تھے یعنی حقیقی منافقین کے بارے میں جن کا عقیدہ عقیدۂ اسلام کے خلاف لیکن عمل ظاہری موافق اسلام تھا، مثلاً فرضیت صلوٰۃ کا عقیدہ نہ تھا مگر نماز پڑھتے تھے، تو جماعت منافقین زمانۂ نبوت کے بارے میں یہ ارشاد ہوا ہے(۱)۔

(۳) تیسری توجیہ یہ کہ اس وقت کے معین شخص کے متعلق فرمایا۔ پس ہمارے زمانہ میں ایمان والا ہو کر کسی میں اگر یہ خصلتیں ہیں، وہ حقیقی و اصلی منافق نہیں(۲)۔

(۱) الخامس :ما قاله بعضهم :المراد به المنافقون الذين كانوا في زمن النبي ﷺ حدثوا بأنهم آمنوا فكذبوا، واؤتمنوا على دينهم فخانوا، ووعدوه في نصرة الدين فاخلفوا.(عمدة القاري: ۱/۲۲۲)

(۲) الرابع :ما قاله بعضهم :ورد الحديث في رجل بعينه منافق، وكان رسول الله ﷺ لايواجههم بصريح القول فيقول :فلان منافق، بل يشير إشارة كقوله عليه السلام:(ما بال أقوام يفعلون كذا) ؟ فههنا أشار بالآية إليه حتى يعرف ذلك الشخص بها.(عمدة القاري: ۱/۲۲۲)

نفاق کی لغوی وشرعی حقیقت

نفاق نافقاء سے مشتق ہے، چوہے کی طرح بالوں والے جانور یعنی گھونس کے (۲) بل کے پوشیدہ سوارخ کو کہتے ہیں، یہ اپنے بل میں دو سوراخ بناتا ہے: ایک ظاہر اور ایک بند، اس پر نرم مٹی وغیرہ کر دیتا ہے، شکاری کے شکار کے وقت اپنے ظاہر سوراخ سے داخل ہوجاتا ہے، شکاری اس پر منتظر بیٹھ جاتا ہے کہ یہیں کو نکلے گا، یہ دوسرے سوراخ سے نکل کر فرار ہوجاتا ہے، ایک خداع سے کام لیتا ہے۔اسی طرح منافق بھی ہے کہ ظاہر سے اس کو مسلمان سمجھا جاتا ہے، باطن میں اسلام نہیں رکھتا، گویا ظاہر سے اسلام میں داخل ہوکر باطن سے اسلام سے فرار ہوجاتا ہے، اپنی اس خداع پر نازاں اور مطمئن وخوش ہے(۱)۔

کذب (جھوٹ) کی حقیقت

"إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ" سے عادتِ کذب مراد ہے، اتفاقی کذب علاماتِ نفاق سے نہیں (۲)۔

جھوٹ اس کو کہتے ہیں کہ نفس الامر کے مطابق علم رکھتے ہوئے خلافِ نفس الامر بات کہی جائے (۳)۔ پس اگر خلافِ نفس الامر اپنے علم کے مطابق کہے، اس کو جھوٹ نہ کہیں گے، گو صورت کذب ہے، اور اپنے علم وعقیدہ کے

---

(۱) كشف المشكل من حديث الصحيحين لأبي الفرج ابن الجوزي:۴۰۸/۳.

(۲) الثالث :ما قاله الخطابي :هذا القول من النبي ﷺ تحذير من اعتاد هذه الخصال خوفا أن يفضي به إلى النفاق، دون من وقعت نادرة منه من غير اختيار أو اعتياد.(عمدة القاري: ۲۲۲/۱)ولأن قيامَ المبدأ لا يوجبُ إطلاقَ المشتقِ عند الأدباء، ما لم يعتاد به حتى يصير له كالعَلَم كما مر.(فيض الباري: ۱۹۸/۱)

(۳) الكذب هو الإخبار على خلاف الواقع.وفي (الكشاف) :الكذب الإخبار بالشيء على خلاف ما هو به.(عمدة القاري: ۲۲۰/۱)

خلاف بات کہی جائے، گونفس الامر کے مطابق تھی تو یہ اگر چہ صورۃً کذب نہ ہومگر حقیقۃً کذب ہوگا۔

غرض خلافِ واقعہ بات کہنا خدا تعالی کونہایت ناپسندیدہ ہے، وہ خود سچا ہے، سچائی کو پسند کرتا ہے۔ جھوٹ ناپسند ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے فتنے فسادات پھیلتے ہیں، دلوں میں برائیاں پیدا ہوتی ہیں، غلط خبروں سے لوگ مغالطوں میں پڑ جاتے ہیں اور ایک غلط بات سے بعض اوقات دوسری ہزاروں غلطیاں رونما ہوکر معاشرت خراب ہوجاتی ہے، دوانسانوں ہی میں نہیں بلکہ ہزاروں خاندانوں میں بربادی ہوجاتی ہے تو کذب فتن وفسادات کا تخم ہے اور فساد مابین سے دنیا اور دین دونوں پر تباہی آتی ہے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فساد اور اسبابِ فساد کی بڑے اہتمام کے ساتھ بڑی روک تھام فرمائی، چناں چہ ارشاد ہے ”إِيَّاكُمْ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ فَإِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ وَلَا أَقُولُ هِيَ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ هِيَ تَحْلِقُ الدِّين“ (۱)۔

فسادذات البین سے بچانے کا شریعت کا اہتمام

اسبابِ فساد سے ممانعت میں مختلف عنوانات سے احادیث وارد ہوئیں: ایک حدیث میں ہے کہ جوشخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کو

(۱) رواه الترمذی بهذه الألفاظ: ”عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَلاَ أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلاَةِ وَالصَّدَقَةِ، قَالُوا: بَلَى، قَالَ: صَلاَحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، فَإِنَّ فَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ. هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ وَيُرْوَى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: هِيَ الْحَالِقَةُ لاَ أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ، وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ.“ (أَبْوَابُ صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالرَّقَائِقِ وَالْوَرَعِ، رقم الحديث: ۲۵۰۹)

چاہیے کہ صرف اچھی بات زبان سے نکالے، ورنہ خاموش رہے(۱)، ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی جماعت جہنم میں اوندھے منہ داخل کی جائے گی، یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنی زبانوں پر قابو نہ کیا تھا(۲)، جھوٹ، غیبت، فتنہ انگیزی، لعن طعن، چغلی، افتراء، بہتان، سب وشتم سے زبان کو لگام نہ دیا تھا۔ ان میں مشغول رہے، اسی طرح یہ حدیث کذب کی مذمت اور اس کا خصلت بد اور دشمنان دین کا خاصہ ہونا بتلا رہی ہے۔

قرآنِ پاک میں ہے: ﴿وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا﴾ [الإسراء]: میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ اچھی بات کہا کریں، شیطان چوں کہ ان کی گھات میں، ان کی فکر میں لگا رہتا ہے، ان کے آپس میں لڑائی جھگڑے ڈلوانے میں لگا رہتا ہے۔ کفار سے فارغ ہو گیا، ان کو تو قعر جہنم میں ڈال چکا، اب تمھاری فکر میں ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، کسی وقت انسان کو چین وسکون سے دیکھنا نہیں چاہتا، ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ ان میں لڑائی ہو، یہاں "عِبَادِيْ" سے مراد خاص بندے یعنی مسلمین ومؤمنین ہیں(۳)، جیسے سورۂ

(۱) صحيح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله تعالی عنه، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ، رقم الحديث: ۶۴۷۵.

(۲) غالباً اس سے حضرت معاذؓ کی حدیث کی طرف اشارہ ہے جو ایک طویل حدیث کا جزء ہے: ثُمَّ قَالَ: أَلاَ أُخْبِرُكَ بِمَلاَكِ ذَلِكَ كُلِّهِ؟ قُلْتُ: بَلَى يَا نَبِيَّ اللهِ، فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ قَالَ: كُفَّ عَلَيْكَ هَذَا، فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللهِ، وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُونَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ فَقَالَ: ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ، وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ أَوْ عَلَى مَنَاخِرِهِمْ إِلاَّ حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ. (سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي حُرْمَةِ الصَّلاَةِ، رقم الحديث: ۲۶۱۶)

(۳) قُلْ لِعِبادِي فِيهِ قَوْلاَنِ: الْقَوْلُ الْأَوَّلُ: أَنَّ الْمُرَادَ بِهِ الْمُؤْمِنُونَ، وَذَلِكَ لِأَنَّ لَفْظَ الْعِبَادِ فِي أَكْثَرِ آيَاتِ الْقُرْآنِ مُخْتَصٌّ بِالْمُؤْمِنِينَ قَالَ تَعَالَى: فَبَشِّرْ عِبادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ [الزُّمَرِ: ۱۷، ۱۸] إلخ. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير للرازی: ۳۵۴/۲۰)

فجر میں ہے:﴿ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝۲۷ۙ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸ۚ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝۲۹ۙ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝۳۰ۧ ﴾ کہ اے نفس مطمئنہ! میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا اور جنت میں داخل ہوجا، ظاہر ہے کہ جنت میں جو بندے ہوں گے، وہ خاص ہوں گے یعنی مسلمین ومؤمنین۔

دیکھئے! حق تعالی اور رسول اللہ ﷺ نے کس قدر اہتمام کے ساتھ زبان پر قابو کرنے کی تاکید فرمائی ہے، لہٰذا ہم کو جھوٹ، چغلی، غیبت، لعن طعن، افتراء، بہتان، سب وشتم اور بیہودگی سے زبان کو بہت اہتمام کے ساتھ روکنا لازم اور ضروری ہے کہ مؤمن کی شان سے بہت بعید ہے کہ اس کی عادت منافقوں جیسی ہو، بے پرواہی کرتے کرتے سلب ایمان کی طرف مفضی ہوجائے، جیسے بد پرہیزی کرتے کرتے سنکھیا بھی کھالیا تو ہلاکت ہوجاتی ہے، روٹی کھاتے کھاتے حد سے زیادہ بڑھ گیا، ہیضہ ہوکر ہلاکت واقع ہوجائے، کھانا جو کہ اچھی اور مفید چیز ہے جب حد سے بڑھنے میں اس پر یہ نتیجہ ہلاکت کا مرتب ہوجاتا ہے تو جو چیز پہلے ہی سے اچھی نہیں تو اس میں عادت ہوجانے سے کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی ہوگا کہ شدہ شدہ کفر حقیقی تک نوبت آجائے گی۔

خطاب بہ طلبہ

اسی لیے آپ کو روکتا ہوں اور متنبہ کرتا رہتا ہوں، ایسی عادتوں سے بچانے کے اسباب چلتے پھرتے بتلاتا رہتا ہوں، البتہ ڈانٹتا اور برا اور سخت نہیں کہتا، کیا ایسا کرکے پہلے خود بڑا بنوں؟ منافقوں کے مشابہ ہوں، تب آپ کو سمجھاؤں؟ یہ نہیں۔ ہاں! شخصیت سے اور اداروں سے اور قوم سے متعلق مضر باتوں کو بتلاتا اور ان سے ڈراتا رہتا ہوں۔

جھوٹ کب جائز ہے؟

تو جھوٹ اسلامیت اور شانِ مسلمان کے بالکل خلاف ہے، نیز جھوٹ لڑائی

فساد کا باعث ہے اور لڑائی وفساد کو شریعت نے نہایت اہمیت سے روکا ہے، اسی وجہ سے اگر سچ سے فساد ہوتا ہو تو سچ بولنا بھی منع اور گناہ ہوتا ہے اور جھوٹ سے اگر دو بھائیوں کے درمیانی فساد کو قطع کرانا ممکن ہو تو اصلاح کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہے، یہ نہیں کہ ہوائے نفسانی وشرارتِ شیطانی کے لیے دوستی کرائی جائے، مطلوب شرعی دوستی اور صلح کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے، ورنہ قبیح دوستی کے لیے قبیح کذب کا اختیار کرنا جائز نہیں، مثلاً باپ بیٹے یا بھائی بھائی میں کچھ ناچاقی اور نااتفاقی ہو جائے اور جھوٹ باتیں بنانے کے بغیر کوئی صورت آپس میں اتفاق اور محبت قائم ہونے کی نہیں تو جھوٹ بول کر ہی اتفاق کرانا ضروری ہے، خلافِ واقعہ بات کہہ دینا بھی اصلاح ذات البین کے لیے ضرورۃً جائز ہے۔ دیکھئے! اصلاح ذات البین کس قدر اہم ہے کہ اس کے سبب تو قبیح بھی حسن ہو گیا، پس اس کے انہدام کے لیے یعنی فساد مابین کے لیے تو قبیح کذب کیوں کر درست ہوگا؟ ہرگز نہیں بلکہ نہایت درجہ قبیح ہو جائے گا۔

وعدہ خلافی نفاق کی علامت کب ہے؟

وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ : وعدہ خلافی دوسری علامت نفاق ارشاد فرمائی، مطلب اس کا یہ ہے کہ وعدہ کرتے وقت ہی دل میں پورا کرنے کی نیت نہ ہو تو یہ منافق کی علامت ہے، پس زبان ودل بہ وقت وعدہ موافق ہونے کی صورت میں اگر کسی عذر کے سبب وعدہ پورا نہ کرسکا تو یہ حقیقۃً وعدہ خلافی نہ ہوگی (۱) (جیسے کہا کہ تم کو روپیہ

(۱) وبقوله :(إذا وعد أخلف) نبه على فساد النية، لأن خلف الوعد لا يقدح إلا إذا عزم عليه مقارنا بوعده، أما إذا كان عازما ثم عرض له مانع أو بدا له رأي فهذا لم توجد فيه صفة النفاق، ويشهد لذلك ما رواه الطبراني بإسناد لا بأس به في حديث طويل من حديث سلمان، رضي الله عنه:(إذا وعد وهو يحدث نفسه أنه يخلف)(عمدة القاري: ۱/۲۲۱)

دوں گا پھر میسر نہ ہو سکے تو یہ وعدہ پورا کرنے میں عذر ہو گیا گو یہ وعدہ شرعاً تھا)۔
گو صورۃً وعدہ خلافی ہو، اس پر وعید نہیں۔

وعدہ اور وعید میں فرق اور ان کا حکم

تو وعدہ کا پورا کرنا تو ضروری ہے مگر وعید کا پورا کرنا منع ہے، جیسے لڑائی اور غصہ میں کسی کو کہہ دیا جائے کہ اچھی بات! فلاں وقت تم کو فلاں ضرر و نقصان پہنچاؤں گا یا کہہ دیا کہ تجھے قتل کر کے رہوں گا، یہ پورا کرنا ہر گز جائز نہیں بلکہ اس کا پورا کرنا حرام ہے، حتی کہ اگر قسم بھی کھا لے، تب بھی قسم کا توڑنا واجب ہے تو آئندہ کسی بات کو کرنے کے متعلق جو صورۃً وعدہ ہے، (اس کی) تین صورتیں نکلیں، جن میں سے دو صورت منع ہیں: ایک صورت وعدہ خلافی، دوسرے وعید، ایک صورت ناجائز ہے یعنی حقیقی وعدہ خلافی کہ زبان سے وعدہ دل میں ایفاء کا ارادہ نہیں، اسی میں آج کل کی ملاقات کے وقت رخصت پر جو کہہ دیا جاتا ہے کہ اچھا دوسرے وقت حاضر ہوں گا، حالاں کہ دل میں اس کا ارادہ تو کیا، تصور بھی نہیں ہوتا، یہ بھی وعدہ خلافی میں داخل اور منع ہے۔

امانت میں خیانت اور اس کا مفہوم

وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ : تیسری علامت نفاق یہ کہ امانت میں خیانت کرے، خیانت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک مال میں خیانت، دوسرے بات کی خیانت، حدیث شریف میں ارشاد ہے: **اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ** (۱) : مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں یعنی جو بات کسی نشست میں، مطلب یہ کہ کسی بھی وقت بیٹھ کر، چلتے پھرتے، کھڑے ہو کر کسی نے اپنی بابت یا دوسرے کی بابت کوئی بات کہی تو وہ امانت ہے، راز ہے، اس کا افشاء کرنا، دوسرے کو اس سے مطلع کر دینا، بات نہ کہنے

---

(۱) سنن أبی داود، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللّٰه تعالی عنهما، كِتَاب الْأَدَبِ، بَابٌ فِي نَقْلِ الْحَدِيثِ، رقم الحديث: ۴۸۶۹.

کی ہو، دوسرے کو کہہ دینا خیانت ہے، امانت کا بالکل ہضم کرجانا اور اس کا انکار کردینا تو سبھی جانتے ہیں کہ خیانت ہے مگر امانت میں بلا اذن تصرف کرنا بھی خیانت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے :وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ: "عَاهَدَ" باب مفاعلہ سے ہے جس کی خاصیت مشارکت ہے، مطلب یہ ہوا کہ دونوں طرف سے وعدہ ہو۔

تحفظِ عہد شریعت اسلام کی ایک خاص امتیازی شان ہے، ایک بادشاہ حضرت عمرؓ کے دربار میں گرفتار ہوکر آئے، اس کی گردن مارنے کا حکم تھا، اس نے پانی پینے کو مانگا، پانی دے دیا گیا، پیالہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہے مگر پانی پی نہیں رہا، کہا گیا: کیوں نہیں پیتا؟ اس نے کہا ڈر ہے کہ پیتے ہوئے گردن نہ ماردی جائے، پانی نہ پی سکوں، فرمایا کہ پانی پینے تک گردن نہ ماری جائے گی، اس نے تین مرتبہ یہ عہد کرالیا کہ اس کے پی چکنے تک امان رہے گا، بس پھر اس نے وہ پانی پھینک دیا اور کہا :اب آپ میری گردن نہیں مار سکتے، چوں کہ امان دے چکے اس پانی پی چکنے تک اور یہ پانی اب پیا نہیں جاسکتا، چناں چہ اس کو رہا کردیا گیا، یہ ہے شان اسلام اور اہل اسلام کی، تمام حضرات نے اس کو عدم استحقاق قتل پر اجماع کیا، خلاصی کے بعد وہ بادشاہ مشرف بہ اسلام ہوگیا اور کہا کہ میں تو پہلے ہی اسلام لے آتا مگر یوں گمان کیا جاتا کہ قتل سے بچنے کے لیے ایمان لایا، اب میں اخلاص سے ایمان قبول کررہا ہوں، عدم اخلاص کا شائبہ بھی نہ رہے(۱)، تو دیکھ لیا زمانۂ عمری کہ مسلمانوں کی شانِ اسلام کیا ہی عظیم الشان تھی، اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر دس سال کا معاہدہ ہوا تھا اس میں کفار نے نقض عہد کیا ورنہ مسلمانان اپنے عہد پر قائم تھے، یہ ہے مسلمان کی شان عہد کو پورا کرے جھوٹ نہ بولے۔

---

(۱) البدء والتاريخ لالمطهر بن طاهر المقدسي:۱۸۰/۵،فتح تستر وخروج الهرمزان.

جھگڑے کے وقت گالی گلوچ کرنا منافقوں کا کام ہے

وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ : ایک علامت منافق کی یہ ہے کہ جب جھگڑے تو گالی گلوچ سے، برا بھلا کہتے پیش آئے، معلوم ہوا کہ یہ بھی تقاضائے اسلام کے بالکل خلاف اور شانِ مسلمانی و مسلمان سے ابعد ترین ہے کہ خفگی برہمی میں سب وشتم اور فحش گوئی، ہرزہ سرائی کے ساتھ ملوث ہو۔

خطاب بہ طلبہ

اب بھی لڑو گے، بخاری شریف بھی پڑھ لی، بہت لمبی سند مولویت کی لو گے بہت سے علماء کے دستخط کے ساتھ، اب تو آپ ماشاء اللہ! اس قابل ہو گئے کہ دوسرے کو چھڑاؤ، اگر چہ چھڑانے میں لاٹھی بھی لگ جائے اور اگر نتھی ہو کر خود ہی لڑنے لگے تو کہاں خیر! دوسرے تو پھر کس شمار میں۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی!

پس جب لڑائی کا وقت آئے تو سوچ لو! شیطان اپنے مقصد عداوت بین المسلمین میں کامیاب ہوا چاہتا ہے، ایک بات ذہن میں آئی کہہ دوں، وہ لفظاً تو چھوٹی ہے مگر معنیً بہت بڑی اور بڑی کامیابی کی ہے۔ کامیابی بالخصوص مؤمن کی بقائے ایمان اور حصول راحت کے لیے دو چیزوں میں ہے: (۱) یقین (۲) صبر، جس میں قوتِ یقین ہوگی، وہ ہر جگہ کامیاب رہے گا، اس کو کہیں ناکامی نہیں، وساوسِ شیطانی امر ایمانی سے متعلق کیسے بھی آئیں مگر قوتِ ایمان سے اب ان کو دفع کر دیتا ہے کہ بالکل خیال نہیں کرتا، خواہ معاش سے متعلق ہوں، خواہ معاد سے، بقائے ایمانی ہو گیا، اور جب کوئی بات مصیبت کی، معصیت کی یا طاعات کی آئے تو استقلال مزاج کے ساتھ، ہوائے نفسانی کا ثبات و مضبوطی سے پورا مقابلہ کیا اور تمام معاصی سے بچتا، طاعات کو نبھاتا رہا، تمام خواہشات کو روکتا ہوا چلتا رہا تو

بس کامیاب ہی کامیاب ہے بحر میں ہو یا بر میں، خلاء میں ہو یا ملاء میں، انفرادی حال میں ہو یا اجتماعی میں، ظلمت میں ہو یا نور میں، کہیں بھی پریشان نہ ہوگا، کسی قسم کی زک نہ اٹھائے گا مگر یہ ہے لوہے کے چنوں سے بھی زیادہ سخت، یہی چیز ہے جو خانقاہوں میں حاصل کرائی جاتی ہے؛ اسی لیے صوفیاء فقر میں، فاقہ میں، راحت میں، تکلیف میں، خوشی میں، غمی میں پریشان وحیران اور تنگ دل نہیں ہوتے۔

بات یہ چل رہی تھی کہ تیزی میں ''إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ'' گالی گلوچ پر اتر آنا، یہ مؤمن کی شان نہیں، اس کی شان سے بعید ہے کہ وہ فاجر بنے، جب یہ عادت اختیار کرے گا اور یہی عادت چلتی رہے گی تو اندیشہ ہے کہ منافق ہوجائے گا کہ گالی گلوچ، بدتمیزی اور بدتہذیبی شانِ اسلامی سے نہایت بعید اور ابعد ہے۔ سمجھ گئے؟ اب دیکھیں گے کون اسلام کا کام کرتا ہے کون نفاق کا۔

میں نے کہا تھا کہ خود تو کیا لڑیں، ایسا ہونا چاہیے کہ دوسرے بھی لڑیں تو ان کو بھی لڑنے نہ دیں، چھڑا دیں فیصلہ اور صلح کرا دیں، یہ بات ذہین نشین اور جذب طبع ہو رہی ہے؟ اس بات کا عزم رکھتے ہو یا ابھی جوانی کے خون میں ہو؟ ایسا ہرگز نہیں چاہیے کہ بے ہودگی اور زیادہ گوئی پر اتر آئے، ایسے موقعہ پر ایک دفعہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے مؤمنو! جب تم لڑنے لگے تو جاہلانہ طریق اختیار کرنا تمھاری شان سے بعید ہے، یہ زمانۂ جاہلیت کی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ تھیں، اب زمانۂ اسلام ہے؛ لہٰذا جاہلیت اختیار نہ کرو، مؤمن کوئی جاہل نہیں ہوتا، ہر ایک اپنے اپنے درجہ پر ذو علم ہے اور جو ظالم اصطلاحی واقعی بھی ہو تو بطریق اولی اس سے بمراحل دوری ضروری ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تنازعہ مخاصمہ میں کچھ تیزی سی ہوجائے، اس کی ممانعت نہیں فرمائی، ہاں اس سے بھی رکے رہنا اولی ہے، سبحان اللہ! لیکن بے ہودگی، بدتمیزی، بدتہذیبی، زبان درازی، دست درازی کی عادت آجائے یہ کیسی بات؟ ہرگز نہیں ہونا چاہیے، ورنہ پھر منافق کی علامت صادق آجائے گی جو ایمان کے خلاف ہے۔

احادیث میں کم زیادہ علاماتِ نفاق بیان کرنے کا اشکال اور جوابات

دونوں حدیثوں کی علامات ملا کر کل علامات نفاق پانچ ہیں: (۱) إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ (۲) إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (۳) إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (۴) إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ (۵) إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ۔ مگر یہ اختلاف عنوان سے معلوم ہوتا ہے، ورنہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل علامات نفاق تین ہی ہیں (۱)۔

دوسری توجیہ یا دوسرا جواب یہ ہے کہ حسبِ وحی جیسا معلوم ہوا فرما دیا تو ایک وقت کچھ معلوم ہوئیں، دوسرے وقت دوسری، بتلا دیں (۲) لیکن سب کا خلاصہ تین چیزیں ہیں: فسادِ قولی، فسادِ عملی، فسادِ باطنی یعنی فسادِ نیت، خیانت فسادِ عملی ہے، کذب فسادِ قولی اور خلافِ وعد، فسادِ نیت ہے، پس ہر قسم کے فساد سے بچو! جب یہ تین باتیں یعنی تینوں فسادوں سے بچوگے، تب اصلاح ذات البین پیدا ہوگی۔

طلبہ مدارس کو اصلاحِ نفس کی جگہیں بھی سمجھیں

برادران وعزیزان ومکرمان! اب صلح آ گئی یا نہیں، بس گردن ہی ہلا دی، یہاں ایسی باتیں بتلائی جاتی ہیں مگر کچھ نہیں، چوں کہ نیت اصلاحِ نفس کی اور خود کو سنوار

(۱) وقال أيضا في شرحه للصحيح :حصل من الحديثين أن خصال المنافقين خمسة، وقال في شرح مسلم :(وإذا عاهد غدر) . هو داخل في قوله :(إذا اؤتمن خان)يعني : أربعة وقال الكرماني :لو اعتبرنا هذا الدخول فالخمس راجعة إلى الثلاث، فتأمل.(عمدة القاري: ۱/ ۲۲۴)

(۲) ولا تنافي بين قوله:ثمه ثلاث، وهنا أربع؛ لأن مفهوم العدد ليس بحجة عند الأكثرين، وعلى مقابله الذي صححه غير واحد فيحتمل أنه - ﷺ - أعلم بالوحي بثلاث، ثم بأربع.(مرقاة المفاتيح: ۱/ ۱۲۷، باب الكبائر وعلامات النفاق، الفصل الأول)

نے کی نہیں ہوتی، طلبہ اگر یہ بات اختیار کرلیں کہ جو اپنے اندر کمی معلوم ہوا کرے گی، اس کو نکالیں گے تو چھے سات سالہ مدتِ تعلیم مدارس میں سوکھی لکڑی ہوجائیں، بس! پھر ایک چلہ میں شیخ طریقت سے بھی اجازت وخلافت حاصل ہوجایا کرے، بلکہ یہاں سوکھی لکڑی کے مانند تمام آلائش شہوات سے خشک ہوجائیں، خانقاہیں نارِ عشق الٰہی سے جلد ہی جل اٹھیں، تو تزکیۂ نفس یہاں ہونا چاہیے، وہاں یعنی خانقاہ میں بس تمکین حاصل کی جائے، نسبت پختہ کرلی جائے۔

کسی شیخ کے یہاں ایک کو حصولِ عجلت خلافت پر مقیمین خانقاہ کو اشکال ہوا، شیخ نے گیلی لکڑیاں دے کر حمام میں نیچے جلانے کو کہا مگر کافی دیر دھو نکنے پر بھی آگ نہ سلگی، فرمایا: کیا کررہے ہو لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ! عرض ہوا: حضرت! لکڑیاں گیلی ہیں، فرمایا: ہمارے حجرہ سے سوکھی لے آؤ، اس پر عمل ہوا تو دیا سلائی دکھاتے ہی جل گئیں، فرمایا: یہ کیا ہوا؟ یہ فرق کیوں؟ جواباً عرض کیا کہ وہ گیلی تھیں، یہ سوکھی ہیں، فرمایا: کم بختو! اب بھی نہ سمجھے، تو عزیزو! اس لیے پڑھا کرو کہ اپنی کمی دور ہوجائے پھر دیکھو ذرا ہی میں عملی واخلاقی تہذیب نفس ہوجائے۔ پڑھتے رہو، جانچتے رہو، بس فراغت درسیات پر جامع علم وعمل اور شیخ وقت ہوکر نکلا کرو۔ یہ بخاری کہہ رہی ہے کہ ایسے کروگے تو منافق، ایسا تو ناقص، ایسا تو کامل تو ایک ظاہری رخ ہے شریعت کا کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ وغیرہ اعمال ہے اور ایک تہذیب اخلاق ہے، دونوں حدیثوں میں مذکور ہیں، اس سے ایمان کا قابل زیادت ونقص ہونا اس سے ترکیب کا ہونا ثابت ہوا، اللہ تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❀ ❀ ❀

الدرس الثالث والأربعون

بَابٌ: قِيَامُ لَيْلَةِ القَدْرِ مِنَ الإِيمَانِ

۳۴: حَدَّثَنَا أَبُو اليَمَانِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ، عَنِ الأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ القَدْرِ، إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.

بابِ ہٰذا کو ماقبل سے ربط ومناسبت

حدیث کی قرأت کے بعد ترجمہ فرمایا، بعدہ فرمایا:

اس باب کو کتاب الایمان سے اور ماقبل باب اور اس کے قبل ابواب سے کیا ربط ہے؟ ربط یہ ہے کہ امام بخاریؒ ترکیب ایمان کے قول کے ساتھ اعمال کے مکمل ومزین ایمان ہونے کے قائل ہیں، اس لیے اجزائے ایمان کو من الدین، من الایمان وغیرہ مختلف الفاظ سے بہ مطابقت احادیث بیان فرماتے چلے آرہے تھے کہ درمیان میں بہ مقابل ایمان کفر وشرک کے درجات کو بیان کرنا شروع فرمادیا تھا، اس سلسلے میں پانچ باب منعقد فرمائے، آخری باب ان میں نفاق کا تھا، اور اس سے اصل مقصد اجزائے ایمان کا بیان تھا، اسی کو واضح کرنے کے لیے کفر کا بیان آ گیا تھا، علاقۂ تضاد سے لزوماً بہ طور التزام ایمان میں اجزاء ہونا اور اس میں درجات کا نکلنا ثابت فرمایا تھا، غرض کفر کا اور اس کے اجزاء ودرجات کا بیان مقصودِ اصلی نہ تھا، ذیلی واستطرادی تھا؛ لہٰذا بیانِ مقصود میں آخری باب افشائے سلام تھا تو اب پھر مقصد اصلی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور جس کو چھوڑ کر ذیلی واستطرادی باتیں آ گئیں تھیں پھر اسی کو اختیار کرتا ہوں کہ اصل طریق وعظ یہی ہے کہ جہاں سے چلے، وہیں آجائے، اسی طرح ربط وترتیب ہاتھ

سے نہ جانے دے اور بخاری شریف بھی وعظ ہی کی کتاب ہے، چوں کہ قرآن وحدیث کی صحیح غرض وعظ وتذکیر ہی ہے، نہ کہ فنی طور پر پڑھ پڑھا لینا، جیسا کہ ہمارے زمانہ میں اسی پر نظریں مقصود ہوگئیں۔

پس یہاں ربط باب لیلۃ القدر کو باب افشاء السلام کے ساتھ اسی طرح ہے کہ لیلۃ القدر کے متعلق سنا ہوگا اور سورۂ قدر پڑھی ہوگی، اس میں سلام کا ذکر ہے، اس رات میں سلام کا نزول ہوتا ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام اس رات میں ہزاروں ملائکہ کے ساتھ تشریف لاتے ہیں، فرشتے ان کے جلو میں پر باندھے ہوتے ہیں، مسجدوں میں، گھروں میں عابدین، ذاکرین، نوافل وتسبیحات ودعاؤں میں، رکوع میں، سجدوں میں مشغول ہوتے ہیں، ان کو یہ ملائک سلام کرتے ہیں (۱) بعض روایات میں آتا ہے کہ مصافحہ بھی کرتے ہیں (۲)، اس کے خاص اثرات ہوتے ہیں، حسب استعداد ایک خاص قسم کی کیفیاتِ ذوق وشوق حاصل ہوتی ہیں جو اس سے قبل رات میں اور ما قبل لیالی میں نہیں تھیں۔

تو جیسا مثبت پہلو میں افشائے سلام پر چھوڑا تھا، اسی کی طرف لوٹ کر سلام ہی کا ذکر پھر شروع فرمایا (۳)۔

نیز منفی طریق میں ابواب کفر کو بابِ علاماتِ نفاق پر ختم فرمایا تھا، بتلایا تھا کہ علاماتِ نفاق مشعر نفاق میں سے ہیں، اب اس باب میں اس کی ضد اخلاص کی علامات کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں، ان سے اخلاص کا علم ہوگا، معلوم ہوجائے گا کہ کس میں کس درجہ اخلاص ہے اور کس میں کس درجہ کا ناقص ہے یا کامل ہے یا اکمل ہے؟ اس طرح کہ لیلۃ القدر جس کا بیان ہورہا

(۱) تفسیر القرطبی: ۱۳۴/۲۰، فی تفسیر سورۃ القدر.

(۲) فضائل الأوقات للبیھقی: ص ۲۴۹، عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ تعالی عنھما، فَصْلٌ فِي التَّرْغِيبِ فِي طَلَبِهَا لَيْلَةَ سَبْعٍ وَعِشْرِينَ، رقم الحدیث: ۱۰۹.

(۳) عمدة القاري: ۲۲۵/۱.

ہے، وہ فرائض اور واجبات اور تاکیدی امور سے نہیں، امورِ فضائل اور مستحسنات سے ہے، یہ رات کا وقت ہے جو دن بھر کے مشاغل اور امور شاقہ کے تعب وتکان واضمحلال رفع کرنے کے لیے اور استراحت پا کر تازہ دم ہونے کے لیے موضوع ہے، اس کے باوجود رات کو آرام چھوڑ نا رات کو زندہ کرنا اور رات کو اٹھنا یا جاگتے رہنا بڑی محنت ومشقت کا کام ہے، عادت کے بالکل خلاف ہے، جس کا اختیار کرنا نفس کو پامال کرنا، خواہشات کو قربان کرنا خاص محبت اِلٰہی واخلاص ایمان کی علامت ہے، اور یہ شب بیداری دن بھر کے متاعب ومشاق واضمحلال وتکان کے باوجود بڑی مشکل ہے؛ اس لیے ہر کس وناکس کا کام نہیں یہ صاحب اخلاص ہی کرسکتا ہے پھر جاگنا، ثلث، نصف، پوری شب کے مطابق درجات اخلاص پر دلالت کرے گا، جو جتنی رات جاگتا اور عبادت وذکر میں مشغول ہوتا ہے، اسی قدر اخلاص کی علامت ہے تو ربط قرب ومتصل باب سے بھی ہے اور اس سلسلہ کے ماقبل باب سے بھی ہے، بڑی عجیب مناسبت سے باب قائم فرمایا شراح واساتذہؒ کے بیان کے مطابق اس باب کے یہ روابط ہیں جو ذکر کیے گئے۔

حضرت مدنیؒ سے بخاری شریف پڑھی ہے، اللہ تعالی ان کی قبر انوار سے بھر دے، اسفار بہت کرتے تھے، بہ وقت واپسی کتب خانہ تشریف لے جاتے، مطالعہ فرماتے، بخاری شریف کی شرح عینی وغیرہ سامنے رکھتے، دارالحدیث شرح بخاری کے ساتھ تشریف لاکر شرح سامنے رکھ کر خود ہی عبارت کی قرآت فرماتے، شرح میں عبارت پڑھنا بڑا مشکل ہے مگر ان کو بڑی مہارت اور ملکہ وکمال تھا۔

غرض عجیب ذہانت ہے امام بخاریؒ کی، بہت دور تک ذہن پہنچاتے ہیں، طلبہ کو ذہین بناتے ہیں، تشحیذ اذہان کے لیے مثل دیگر کتب عالیہ فن حدیث میں بخاری شریف ہے۔

شب قدر کی تعیین میں علماء کا اختلاف

لیلۃ القدر جس کا اس باب میں ذکر ہے، اس میں بہت اختلاف ہے، اس کی تعیین میں تقریباً پچاس اقوال ہیں، بعض فرماتے ہیں کہ یہ پورے سال میں دائر سائر رہتی ہے، سال کی کسی بھی رات کو یہ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، بعض فرماتے ہیں کہ پورے رمضان دائر ہے، رمضان کی کوئی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے (۱)، بعض کہتے ہیں کہ رمضان شریف کے آخر اور وسط کے حصہ میں کوئی رات ہوتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ رمضان شریف کے اخیر عشرہ میں کسی رات میں ہوتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ جفت راتوں میں، بعض طاق راتوں میں ہونے کے قائل ہیں، بعض کہتے ہیں ۲۳ر میں، بعض ۲۵ر کو اور بعض ستائیسویں کو ترجیح وتعیین دیتے ہیں (۲)۔

ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی

اب ان اقوال وروایات کو سامنے رکھتے ہوئے اخلاص کی پرکھ اور شناخت بڑی مشکل ہوگئی، چوں کہ پورے سال میں شب قدر ہوگی تو کسی کا اندازۂ اخلاص کیسے

(۱) فقيل هي في السنة كلها وهو قول أبي حنيفة وصاحبيه.وقيل بل في شهر رمضان كله وهو قول ابن عمر (الكواكب الدراري: ۱۵۲/۱)

(۲) وقيل :بل في العشر الأوسط والأواخروقيل :بل في الأواخر, وقيل :يختص بأوتار العشر, وقيل :بأشفاعهوقيل :بل في ثلاث وعشرين أو سبع وعشرين, وهو قول ابن عباس. وقيل :في ليلة سبع عشرة, أو إحدى وعشرين, أو ثلاث وعشرين, وقيل :ليلة ثلاث وعشرين, وقيل :ليلة أربع عشرين, وهو محكي عن بلال وابن عباس رضي الله عنهم, وقيل :سبع وعشرين, وهو قول جماعة من الصحابة, وبه قال أبو يوسف ومحمدإلخ(عمدة القاري: ۲۲۵/۱.)

ہو؟ وہ تو شب بیداری کرنے سے ہو اور تمام سال شب بیداری مشکل ہے۔

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی	ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی(۱)

مگر بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ راتوں جگتے ہیں، ہماری مرادیں تو گھی، دودھ خالص ہیں مگر ان کی یہی مراد ہے کہ راتوں جگے، دن بھر کام کرنا، پڑھنا پڑھانا، رات بھر جگنا تو موت سے پہلے موت کے مصداق ہیں لیکن ہماری اس چودھویں صدی میں کم سے کم ہمتیں ہوتی ہیں، اس لیے میں بشارت دیتا ہوں کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لیا کریں اور ہمیشہ احیائے لیل کی فضیلت حاصل کر کے ''ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی'' کے مصداق ہو جایا کریں اور اگر کہیں صبح تک سوتے رہنے والے کے فکر رکھ کر سو جایا کریں اور آنکھ کھلتے ہی اٹھ جایا کریں کہ حدیث میں آیا ہے کہ صبح تک سوتے رہنے والے کے کان میں شیطان پیشاب کر دیتا ہے (۲)۔ اس کو سوچ کر بس آنکھ کھلتے ہی فوراً لاحول پڑھتے ہوئے کھڑے ہو جایا کریں تو صبح کی جماعت بھی حاصل ہو جائے، اس کی پوری رات عبادت میں لکھی جایا کرے گی پھر تو ''ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی'' پورے طور پر صادق ہوگا، اگرچہ اقوال اور بھی ہیں مگر اتنا بھی کر لیا جائے تو محروم نہیں، یہ بات میری زبان سے ہو رہی ہے مگر محققین ہی کا ایک قول یہ بھی ہے (۳)۔ اور یہ

(۱) اے بزرگ شب قدر کی کیا نشانی پوچھتے ہو، ہر رات شب قدر ہے اگر تم قدر جانتے ہو۔

(۲) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ، قَالَ :ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ رَجُلٌ نَامَ لَيْلَهُ حَتَّى أَصْبَحَ، قَالَ: " ذَاكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّيْطَانُ فِي أُذُنَيْهِ، أَوْ قَالَ :فِي أُذُنِهِ"(صحیح البخاری، كِتَابُ بَدْءِ الخَلْقِ، بَابُ صِفَةِ إِبْلِيسَ وَجُنُودِهِ، رقم الحدیث: ۳۲۷۰)

(۳) وَقَالَ الشَّافِعِيُّ - رَحِمَهُ اللّٰہُ - فِي كِتَابِهِ الْقَدِيمِ مَنْ شَهِدَ الْعِشَاءَ وَالصُّبْحَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَقَدْ أَخَذَ بِحَظِّهِ مِنْهَا.....وَرَوَى الطَّبَرَانِيُّ فِي مُعْجَمِهِ الْأَوْسَطِ بِإِسْنَادٍ فِيهِ ضَعْفٌ عَنْ ابْنِ عُمَرَ - رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُمَا - قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ - ﷺ - مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ وَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ مِنْ الْمَسْجِدِ كَانَ كَعَدْلِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (طرح التثریب: ۱۶۲/۴)

رمضان شریف میں سحری کے وقت اٹھنے میں ایسا بھی کرلیں کہ اس وقت چند رکعات تہجد پڑھ لیا کریں تو مزید برآں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر کی تعیین اس قدر مخفی کیوں کردی گئی؟ بات یہ ہے کہ قدر و قیمت کی چیز چھپائی ہی جایا کرتی ہے، پردے سے باہر نہیں لایا جاتا، جیسے موت، ساعت جمعہ، قیامت۔

لیلۃ القدر کی وجہ تسمیہ

قدر کے معنی اندازہ کرنا، تقسیم کرنا، عزت، اس رات میں اللہ تعالی کی طرف سے تقدیرات و تقسیماتِ ارزاق واعمال وغیرہ ہوتے ہیں اور عزت و عظمت بھی اس رات کو جو حاصل ہے، وہ اوروں کو نہیں (۱)، اور راتوں میں تو حدیث میں آتا ہے کہ آخر شب میں سمائے دنیا کی طرف نزول باری تعالی ہوتا ہے (۲) یعنی خاص تجلیات وتوجہات ہوتی ہیں لیکن اس رات میں شام کے وقت سے ہی انتہائی تجلیات وتوجہات ونزولِ برکات ہوتا ہے جو دوسری راتوں کو حاصل نہیں، اس رات میں جبرئیل علیہ السلام مع ہزارہا ملائک تشریف لاتے ہیں اور صبح تک اسی شان کے ساتھ سلام ہی سلام کہتے رہتے ہیں، آخر کوئی تو وجہ ہے کہ اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک میں فرمایا، نیز اس رات میں جو عبادت کرتا ہے، جو اس کا احیاء کرتا ہے، اس کی بھی عزت وعظمت بڑھادی جاتی ہے، اس لیے اس کا نام لیل القدر ہوا (۳)۔

(۱) المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج للنووی:۸/۵۷،باب فضل ليلة القدر والحث على طلبهاوبيان محلها وارجاء أوقات طلبها.

(۲) صحيح البخاری،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، كتاب التهجد،بَابُ الدُّعَاءِ فِي الصَّلاَةِ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ،رقم الحديث:۱۱۴۵.

(۳) أَوْ لِمَا يَحْصُلُ لِمُحْيِيهَا بِالْعِبَادَةِ مِنْ الْقَدْرِ الْعَظِيمِ.(طرح التثريب في شرح التقريب :۴/۱۴۹، بَابُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ.)

ردعلی مرجیہ

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ مستحبات ومستحسنات میں سے ہے، فرائض میں سے نہیں اور مقصود مرجیہ پر رد کرنا ہے کہ اے مرجیہ تم کہتے ہو کہ اعمال کو ایمان میں دخل نہیں، تم خیال کرو، دیکھو لیلۃ القدر میں عبادت نفل ہے، اس سے اس درجہ ایمان میں نور اور رونق وجلاء وقوت پیدا ہوجاتی ہے کہ فرشتہ سلام کرنے لگتے، مصافحہ کرنے لگتے اور عابدین ذاکرین کے اردگرد خوشی خرمی سے گھومنے لگتے ہیں تو جب نوافل ومستحبات سے ایمان کا یہ عالم ہوجاتا ہے تو جب ان کو اتنا دخیل ہوا تو فرائض واجبات وغیرہ دیگر اعمال کو بطریق اولی ایمان میں دخل اور ان سے اس کی تقویت اور ازدیاد وانجلاء میں لامحالہ مزیت وترقی ہوگی، پس تمھارا یہ کہنا کہ اعمال کو ایمان میں کچھ دخل کسی قسم کا نہیں، محض لغو اور باطل ہے، ہمارے اس دعوی پر کہ اعمال کو ایمان میں دخل ہے، الفاظ حدیث "**إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا**" دلیل ہیں۔

ردعلی مرجیہ وخوارج ومعتزلہ

آگے ارشاد ہے: **غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ**: کہ پہلے سب گناہ معاف ہوگئے کہ اس رات کی عبادت کی برکت سے پچھلی کمیاں اور خامیاں جو گناہوں سے ایمان میں آگئی تھیں، ان سب کا تدارک ہوگیا اور ایمان میں زیادتی وانجلائیت ہوگئی، اس سے مرجیہ کے ساتھ ساتھ خوارج ومعتزلہ پر بھی رد ہوگیا کہ گناہ سے کافر اصلی اور شرک حقیقی میں داخل نہ ہوا تھا، گو کمی آگئی تھی، اسی لیے بلا تجدید ایمان بلکہ بلا توبہ محض اس لیلۃ القدر کی عبادت سے ذنوب دور ہوگئے اور ایمان میں جلاء اور زیادت آگئی۔

طلبہ کو نصیحت

یہاں ایک بات خیال میں آئی : حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر شب قدر کا تعین واضح ہوا، من جانب اللہ آپ کو بتلا دیا گیا کہ فلاں تاریخ میں ہے، آپ نے ارادہ فرمایا کہ امت کو اس سے آگاہ فرمائیں، چناں چہ اس ارادہ سے آپ اپنے حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لائے تو دو شخصوں کو جھگڑتے دیکھا، آپ ﷺ ادھر متوجہ ہوئے؛ تا کہ ان کا جھگڑا ختم فرمائیں اور صلح کرادیں، پس ادھر متوجہ ہونے سے آپ کے ذہن مبارک سے تعیین نکل گئی (۱) ، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑنے اور جھگڑنے کی یہ نحوست ہے اور اس کا اثر جب دوسروں پر یہاں تک پڑتا ہے کہ علمیت جو کہ ایک نورانیت ہے اس کا زوال ہوجاتا ہے، تو خود متنازعین کے قلوب میں تو کیوں کر نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا اور کس قدر ،کس درجہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ بہت زیادہ ہوگا، ایک نور عظیم سے حرمان وخسران واقع ہوگا، جب یہ ہے تو پھر ہمارے طلبہ ایسی تعلیمات کے باوجود نحوست کی چیز لڑنے جھگڑنے میں مبتلا ہوتے ہیں، اس بناء پر علم نور کی دولت گھٹتی رہتی ہے۔

دوسری بات اس حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسبابِ عالم میں ہونے کے سبب بھوک ، ضعف ، ذہول وغیرہ اثرات حضور پرنور ﷺ کی زبردست اور مقدس ہستی پر بھی ہوئے ہیں، معلوم ہوا کہ جب غلط صحبت کا اثر کچھ نہ کچھ کسی درجہ میں جب آپ ﷺ پر بھی ہوا تو اب کسی کو صحبت بد میں رہ کر عدم تأثر کا دعوی کرنا ادعائے محض اور باطل ہے، اس لیے صحبت بد سے گریز کرنا اور ایسے اسبابِ نحوست واثرات بد سے بچنا اور بہت بے انتہا دور رہنا ضروری اور لازم ہے۔

---

(۱) صحيح البخاری، عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی الله تعالى عنه، كتاب فضل ليلة القدر، بَابُ رَفْعِ مَعْرِفَةِ لَيْلَةِ القَدْرِ لِتَلاَحِي النَّاسِ، رقم الحديث: ۲۰۲۳.

”إِیمَانًا“ کی قید کا مطلب اور فوائد

تو آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ شب قدر کی عبادت ایسی برکت اور ایسی خاصیت اور اتنی زبردست اثر والی ہے کہ اس سے سب گناہ ختم ہوجاتے ہیں، مگر اس میں دو شرطیں لگادیں: ”إِیمَانًا وَ احْتِسَابًا“۔ یعنی تقاضائے ایمان سے ہو، میں نے کہا تھا کہ مطلب یہ ہے کہ اخلاص ہو، وہ سبب ہو اس شب بیداری کا اور شب بیداری ایمان کا مقتضا ہو، وہ بھی کیا ایمان ہے (اشارۃً فرمارہے ہیں) کہ لیلۃ القدر اس پر گذرے اور وہ اس رات بھی شب بیداری نہ کرے، اس رات کی قدر نہ پہچانے، اس کو عبادت سے رونق نہ دے اور کم سے کم عشاء کی نماز بھی جماعت سے نہ پڑھے اور فجر کی جماعت لینے کی نیت کرکے نہ سوئے، وہ کیا ایمان والا ہے! اس کا ایمان کیا شمار کے قابل ہے؟ مطلب یہ نہیں کہ وہ کافر ہے۔

ابھی پڑھ چکے کہ ایک صاحبِ ایمان جہنم سے آخر میں نجات پائے گا، سب سے بعد میں جہنم سے نکالا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس ایمان مانع دخول جہنم نہیں، نادراً ہو تو وہ اللہ کے علم میں ہے (جیسے واقعۂ زانیہ: حدیث میں ہے کہ ایک ہانپتے دم توڑتے کتے کے پیاسا ہونے پر رحم کھایا تو نجات ہوگئی (۱) مختصراً بقول حضرت تھانویؒ کہ کسی نے دستوں کے دوران جنگل میں زمین سے خزانہ پایا، دوسرے نے بھی حرص میں دست آور دوائی کھالی مرنے کو ہوگیا؛ مگر خزانہ نہیں ملا تو یہ کوئی قاعدہ نہیں)۔ ایسے کسی کے ایمان میں کوئی خاص بات ہو تو وہ اللہ تعالی جانتے ہیں، کوئی ضابطہ اور اصول نہیں، یہ کہیں نہیں لکھا؛ اس لیے احتمال وخیالِ خام پر تکیہ لگالینا اور بے فکر رہنا شیطانی راہ وسخت حماقت اور سب ہلاکت ہے۔

(۱) صحیح البخاری، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُ، كِتَاب بَدْءِ الخَلْقِ، بَابُ إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ إلخ، رقم الحدیث: ۳۳۲۱.

تو تقاضائے ایمان ہے رات کو جاگو گرچہ یہ ہمارا جاگنا نفل ہوگا مگر وہ کیسا مؤمن ہے جو نفل بھی چھوڑ دے۔

”اِحتِسَابًا“ کی قید کا مطلب اور فوائد

دوسری قید ”اِحتِسَابًا“ ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بات تو پوری ہوگئی کہ تقاضائے ایمان ہے شب بیداری، عبادت گزاری کا تو شب بیداری کر کے عبادت گزاری کا کام پورا ہوگیا، پھر یہ قید کیوں لگائی؟۔

جواب یہ ہے کہ اس میں ایک عجیب اشارہ ہے، جس کو صوفیہ خوب نبھاتے ہیں، شاید آپ کہیں کہ روز روز صوفیہ ہی کا ذکر کیا جاتا ہے، بات یہ ہے کہ دو ہی جماعت ہیں جن پر دین اسلام کی بقاء وتحفظ کا مدار رہے: ایک صوفیائے محققین، ایک فقہائے محققین، غور کرنے کی بات یہ ہے (یہ بات کتابوں ہی کی ہے، ترتیب میری ہے) کہ مسلمان جب خاندانی طور سے یا ابتداءً کلمہ پڑھ لینے سے مسلمان ہوتا ہے تو وہ اعمال کا مکلف ہوجاتا ہے بلکہ طرح طرح کے اعمال اس کی زندگی میں پیش آتے ہیں: اختیاری، غیر اختیاری، تکلیفی، تکوینی، طبعی، شرعی، پھر شرعی و تکلیفی بعض ایسے ہوتے ہیں جن میں خاص دشواری نہیں ہوتی، بعض دقت طلب اور محنت ومشقت کے ہوتے ہیں، ایسے کہ جن سے ہمت پست ہوجاتی ہے، انسان ضعیف البنیان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

بعضے اعمال ایسے ہیں کہ زیادہ محنت اور مشقت تو ان میں نہیں مگر نیت کا استحضار ہی نہیں، سمجھتا ہے کہ اس عمل میں ثواب نہیں، یہ بھی کوئی قرب کی بات ہے؟ اسی طرح بیوی اولاد کو کھلانا پلانا یوں ہی سمجھتا ہے، خیال کرتا ہے کہ اہلیہ کے اخراجاتِ خورد ونوش، پوشاک اور معالجات کے بارےمیں ہی کیا، سب ہی

مسلمان، غیر مسلمان اٹھاتے ہیں تو سب کچھ محن ومشاق جھیلے جارہے ہیں مگر ثواب کا خیال اور استحضار نہیں بلکہ عدم اجر ونفی ثواب کا خیال ہوتا ہے۔

اور کچھ اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں کہ دنیوی تعلق، دنیوی نظر سے دوسروں کے ساتھ معاشرتی طور سے کر گذرتا ہے: مبارکبادئ شادی، شرکت غمی، جنازہ کے کفن دفن وتعزیت کے سب امور اس لیے انجام دیتا ہے کہ یہ حالات آگے پیچھے سب ہی کو پیش آتے رہتے ہیں، آج ان پڑوسیوں یا عزیزوں کو پیش آرہے ہیں تو کل ہمیں بھی پیش آنے والے ہیں تو آج اگر ان کے شریک حال نہ ہوں گے تو کل یہ ہمارے مصائب اور تنگیوں میں کام نہ آئیں گے، ہمارے جنازہ اور اس کے کفن دفن میں شرکت نہ کریں گے، اس وقت تنہا رہ جائیں گے، زیادہ پریشانی کا باعث ہوں گے، اس لیے ان امور کی شرکت ضروری ہے رکھ رکھاؤ کے لیے ہے، میں اس کے یہاں، وہ میرے یہاں۔شرکت وتعاون لابدی اور لازمی ہے، زندگی یوں ہی گذاری جاتی ہے، اس میں ثواب کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا۔

اور لیجیے! بعض اعمال تکوینی طور پر غیر اختیاری طریقہ سے آفاقی وانفسی صادر ہوتے ہیں، مثلاً مالی، جاہی ضرر ہو گیا کہ چنگاری اڑ کر چھپر میں لگ گئی، گھر جل گیا، بکس کے کپڑ جل گئے، نوٹ بھی جل گئے، کھلیان سے اناج چور لے گئے یا ہوا سے اڑ کر، آگ لگ کر جل گیا، اس میں بھی حصولِ ثواب کا تصور وخیال تک نہیں آتا۔ایسے موقعہ پر ایک طرفہ نظر کے سبب نقصان محض خیال کرتا اور غم سے پگھلتا اور اپنے جسم کا نقصان کرتا ہے، بعض اوقات ایسے مواقع پر کلماتِ شکایت کفریہ تک صادر ہوجاتے ہیں، دل میں حق تعالی کی طرف سے ایک ناگواری سی پیدا ہوجاتی ہے تو اجر وثواب اور نفع عظیم پنہاں ہے اور نقصان قلیل بلکہ بہ نظر غائر مطلق نقصان نہیں لیکن انسان اپنی ناواقفی سے خود بڑے بڑے خساروں میں پڑ جاتا ہے، بڑے اجر اور ثواب سے محروم ہوجاتا ہے، اس طرح بدعقیدگی کے سبب ثواب سے

محروم ہو گیا۔

نیز اس طرح بھی کہ علم نہ ہونے کے سبب ظاہری سرسری مشقت اعمالِ اختیار یہ گوارا نہ کی، اعمال پست ہمتی کے باعث ترک کردیے اور فرائض واجبات سے پچھڑ گیا، نوافل و مستحبات سے رہ گیا، نقصانات میں قصورِ نظر و عدمِ علم کے باعث گھبرا کر خودکشی کر کے حرام موت پا کر خدا کی گرفت میں آجاتا ہے، ان سب مشکلات ونقصانات سے بچانے کے لیے آں حضرت ﷺ نے یہ نہایت آسان گُر ارشاد فرمایا کہ ایمان کے ساتھ احتساب بھی ہو کہ بدونِ ایمان تو کوئی عمل ثوابِ آخرت کے قابل ہی نہیں بنتا اور احتساب سے، استحضارِ ثواب سے ہمت شکنی کے بہ جائے بلند حوصلگی، عالی ہمتی پیدا ہو کر تعب و مشقت ہلکی اور آسان ہو جاتی ہے، اپنے یا پرایوں سے معاشرتی مروتی سلوک بے کار نہیں جاتے بلکہ غیر مثاب کے بہ جائے مثاب اور مزید اضافات ثوابات کے بے بہا دولتوں، خزانوں سے مالامال ہو جاتے ہیں۔

حدیث کا یہ لفظ تو مختصر ہے مگر معانی کو اس درجہ محیط ہے کہ افعالِ اختیاری اور غیر اختیاری، آفاقی، انفسی سب کو اپنے اندر گھیرے اور سمیٹے ہوئے ہے، حضرات صحابہؓ تو اہل لسان تھے وہ اتنے ہی لفظ سے سب کچھ سمجھ گئے، پھر ان سے واسطہ در واسطہ اساتذہ سے ہم نے سمجھ لیا اور اب ہم نے آپ حضرات کو پہنچا دیا۔ اب کل کو آپ حضرات بھی سمجھانے بیٹھ جائیں گے۔

اور سمجھاؤں! ''اِحتِسَابًا'' حَسِبَ سے مشتق ہے، اس کا مادہ حَسِبَ ہے، اسی سے محتسب ہے، یہ آپ کے سمجھانے کے لیے کہہ رہا ہوں، مجھ تک اس طور پر اس طرز سے نہیں پہنچے، محتسب اس کو کہتے ہیں جو حکومت اسلام کی طرف سے لوگوں کی جانچ پڑتال کے لیے مقرر ہوتا ہے، وہ دُرہ لیے گھومتا پھرا کرتا ہے جس کا کام خلافِ شرع ہوتا ہے، اس کو تنبیہ کرتا ہے، اس سے زبردستی اس کام کو چھڑاتا ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اسی سے یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ ''احتساب'' کے معنی برابر نفس کی نگرانی وجانچ پڑتال کرتے رہنے کے ہیں، عبادت نفس کی آمیزشوں سے اسی وقت پاک ہوسکتی ہے اور اسی وقت عبادت خالص عبادت بن سکتی ہے، اسی پر کامل اجر وثواب کا ترتب ہوتا ہے، پس کسی نیک کام اور عبادت میں بہ وقت ابتداء اس کام کی بجا آوری اور عبادت کا قصد وارادہ کرنا یہ اولی اور کم سے کم درجہ ہے، اس کو فقہا فرض اور ضروری کہتے ہیں، اگر یہ بھی نہیں تو عبادت ہی صحیح نہیں تو صحت عبادت کے لیے اتنا کافی ہے، مثلاً ظہر کی نماز ادا کرنے کی نیت وارادہ کر کے شروع کر دینا یہ ادائے عبادت کے لیے کافی ہے، اتنا بھی نہ ہو تو نماز نماز ہی نہیں ہوگی، اسی طرح سحری میں کچھ کھائے پیئے بھی نہیں مگر روزہ رکھنے کی نیت کر لے تو روزہ صحیح ہو جائے گا مگر اسی قدر پر اکتفاء کر لینا کوتاہی ہے اور بڑے نقصان کا موجب ہے، پھر بھی افسوس ہے کہ اس سے زائد کو ضروری نہیں جانتے اور عوام سے گفتگو نہیں، وہ تو درکنار، طلبۂ علم دین بلکہ اساتذہ، مولوی صاحبان بھی اس سے تغافل برتتے ہیں، ہم لوگ احتساب کو نہ ضروری جانتے ہیں، نہ مفید خیال کرتے ہیں، بالکل اس کا خیال نہیں کرتے، اہتمام نہیں رکھتے، تو ہم بس یوں ہی پڑھ پڑھا لیتے ہیں۔ ان کا اہتمام کرنے والے حضراتِ صوفیاء کرام ومشائخ عظام ہیں۔ اب تک بات کھلی نہیں، وہ کون چیستاں ہے۔

غور سے اور دھیان سے سنو! وہ ارادہ ونیت ادائے فرض وغیرہ کے ساتھ اس بات کا استحضار اور دھیان جمائے رکھنا کہ میری یہ عبادت اللہ کے لیے ہے۔ گویا جو شروع نیت تھی، اس کا برابر علم رکھنا، اس سے ذہول وغفلت نہ کرنا، یہ آپ کی زبان میں سنا رہا ہوں، اصطلاحِ صوفیہ میں نہیں کہہ رہا۔ مثلاً فرض ظہر شروع کیے تو اب اس کا آخرِ نماز یعنی سلام تک علم رکھنا، دھیان قائم رکھنا۔ یہ ہے احتساب۔

ہماری نمازوں کی تصویر کشی

تو نفس کی نگرانی رکھنا ہمہ وقت ضروری ہے کہ اس کے بغیر تکمیل ایمان ناممکن ہے اور تکمیل ایمان فرض ہے، پس اس کا موقوف علیہ یعنی نفس کی نگرانی اور جانچ پڑتال کرتے رہنا، اس سے حساب لیتے رہنا، وہ بھی لامحالہ فرض ہے مگر ہمارا حال نہایت افسوس ناک ہے، یہ حال ہے کہ اللہ اکبر کہہ کر جو نماز شروع کی اور سبحانک (ثنا) پڑھنا شروع کیا تو سبحانک پڑھ رہے ہیں تو اسٹو (stove) چلا رہے ہیں، الحمد پڑھ رہے ہیں تو دھوبی کے یہاں جارہے ہیں، سورۃ پڑھ رہے ہیں تو بازار جارہے ہیں، رکوع میں گئے تو کسی لڑکے سے بات کررہے ہیں، کیا یہ بات نہیں؟ سوچئے! ذہناً یہ انطباق کرارہا ہوں، اچھی طرح سمجھ لینا، اب سجدہ میں جارہے ہیں تو سفر میں جارہے ہیں، سجدہ سے اٹھ رہے ہیں تو وہاں کے قیام کی تدبیر ہورہی ہے، دوسرے سجدے میں احباب سے ملنے جلنے کا تخیل وتفکر ہورہا ہے، غرض اسی گونا گوں افکار وتصورات کے شغل کے ساتھ ساتھ چار رکعات پوری پڑھ لی، سلام پھیرنے کو آئے تو پھر نماز پڑھنے کا وہ خیال آیا تو یہ نماز ایماناً تو ہوگئی مگر احتساباً نہیں ہوئی۔

برا نہ ماننا اور سمجھاؤں؟ مجھے درسی تقریر نہیں آتی، ایسے ہی بول لیتا ہوں، باریک باریک باتوں کو موٹے موٹے لفظوں ہی سے سمجھاتا ہوں تو احتساب کے معنی استحضار رہنا، یادداشت رکھنا، حضورِ قلب، مشاہدۂ حق کا قائم رکھنا، اب اصطلاحات درسی آگئیں۔ یہ معنی ہیں احتساب کے۔ آپ فرمانے لگیں: احتساب کے بغیر نماز جائز تو بہر حال ہوگئی۔ جی ہاں! اب آپ عالم ہوگئے، فقیہ ہوگئے۔ اب آپ کے سامنے کیا بولیں، نماز جائز ہوگئی تو کیا آگے کچھ درکار نہیں؟ ایسا ہی ہے تو آں حضرت ﷺ نے ایماناً پر کیوں قناعت نہیں فرمائی؟ بس اسی پر اپنا بیان کیوں

نہ ختم فرمادیا؟اس کے بیان کی آگے ضرورت کیا تھی؟اگر طولِ لاطائل اور یہ لفظ غیر مفید تھا؟ حاشاوکلا!ایسانہیں ہوسکتا،آپ ﷺ کاارشاد ہے کہ میری بات مزاحاً بھی ہوتو اس میں بھی تعلیم ہوتی ہے (۱) ۔ پھر جب کہ تعلیم ہی مقصود ہو، جیسے یہاں فرمارہے ہیں کہ جانچ کروکہ ذہولِ قلب تونہیں، دل کی توجہ کس درجہ ہے، دل ادھر لگاہواہے یانہیں؟تو دل کادھیان ویادداشت واستحضار ہے۔

اس کے بعد سمجھئے کہ غیر اختیاری نقصانات یااختیاری معاشرتی مروتی افعال: تعزیت، کفن دفن کی شرکت وغیرہ جوکچھ احتساب کے ساتھ ہوں،ان میں ثواب بھی ہوتا ہے اور وہ آسان بھی ہوجاتے ہیں،اس تصور وخیال اور استحضار ویادداشت اورعدم ذہول سے مشقت وتعب کے کام بھی ہوں گےتو آپ ان کو سوچیں گےاورنفس سے کہیں گے کہ اے نفس کام کچھ نہیں مگراجرعظیم اور بہت اونچا ، بہت بڑاہے، بڑی عزت، بڑی قدرومنزلت اور بہت اعزاز ہے۔

کیاہے تجھے کتابوں نے کورذوق اتنا،	صباسے بھی نہ ملاتجھے بوئے گل کاسراغ

مگرتو دن رات ذنب اور گناہ کے کام کرتاہے، کوئی سانس گناہ سے خالی نہیں، تجھے کہاں جائز ہے کہ اس سے غافل بھی ہو،چہ جائے کہ نافرمانی میں گذارے،خیراسی رات کی قدر کرلے،سب گناہ دھل جائیں گے ،معیت حق حاصل ہوجائے گی،خداتعالی کے ساتھ ایک خاص علاقہ پیداہوجائے گا،اس کو برابردل میں قائم اور یادو مستحضررکھو، یہ نہیں کہ تھوڑاساخیال کرکےبس ختم، یہ مؤثر نہیں،مفیدنہیں ہوگا،آسانی اسی دھیان و یادداشت سے ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عبادت کی ہم کو بڑی مشقت معلوم ہوتی ہے اوراحتساب رکھنے والے صوفیاء حضرات کے سامنے بھاری سے بھاری عبادت ہلکی سے ہلکی ہوتی ہے، سمجھے آپ!

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالُوا :يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّك تُدَاعِبُنَا قَالَ :إِنِّي لاَ أَقُولُ إِلا حَقًّا. (الشمائل المحمدية، ص۱۹۵،بَابُ مَا جَاءَ فِي صِفَةِ مِزَاحِ رَسُولِ اللهِ ﷺ رقم الحديث :۲۳۸)

یہ ہے تصوف وسلوک کی حقیقت۔

اس وقت ڈھونڈلو، تلاش کرلو! اس حدیث پر عمل پیرا محض مدرسہ والا نہ ملے گا، بس خانقاہی ملے گا، اگر مدرسہ میں ملے گا تو وہ خانقاہی ہی ہوگا۔

اس طرح اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کی بات ہے، آپ ہی کے درمیان ہورہی ہے، باہر نہیں ہورہی ہے، اپنوں کے عیب کھولا نہیں کرتے بلکہ کھلے ہوئے عیبوں کو بھی چھپایا کرتے ہیں، غیروں کے خوب فاش کرنے چاہئیں؛ تا کہ اپنے ان کی ظاہری بناوٹوں سے دھوکہ نہ کھائیں، ایسا نہیں، جیسا کہ عوام طلبہ کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کے معائب پر تو پردہ ڈالتے ہیں اور طلبہ کے ساتھ بے گانگی کا معاملہ کرتے ہیں، ان کی ذرذراسی باتوں کو اچھالتے اور مشہور کرتے ہیں، حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ طلبہ کو میں ہی کہہ لیتا ہوں، کوئی اور کہہ کر دیکھے، چناں چہ عوام میں سے اگر کوئی طالب علم کے ساتھ ایسا برتاؤ اور ڈانٹ وغیرہ کا کرتا تو اس کی خوب خبر لیتے تھے۔

تو عزیزان! ہم آپ کو نہیں کہیں گے تو پھر کس سے کہیں گے؟ تبلیغ کا موقعہ اور محل، طرز اور عنوان ہوتا ہے۔

ہاں! تو ہمارے اندر یہ کتنی بڑی کوتاہی اور خامی ہے کہ احتساب نہیں کرتے، اور تو اور، ہم طلبہ پر پنج وقتہ نماز بھی گراں ہیں، کیا پڑھا نہیں؟ خیال نہیں؟ یاددہانی نہیں؟ سب کچھ ہے مگر احتساب نہیں؛ اس لیے سب پڑھنا پڑھانا اور سمجھانا اور بار بار یاد دلانا بے کار ثابت ہورہا ہے، یوں کچھ لحاظ وغیرہ سے نماز پڑھ لی، ورنہ خیر۔ جیسے علی گڑھ میں ہوسٹل میں نماز کی حاضری کے لیے رجسٹر ہے، مسجد بھی ہے، امام بھی مقرر ہے، اذان بھی ہوتی ہے، دس پندرہ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ہم کو غیرت آنا چاہیے کہ طلبۂ علم ودین ہوکر نماز سے جی چرائیں اور انگریزی طلبہ پابندی کریں، بڑی غیرت اور عبرت کی بات ہے۔ ہمارا یہ حال ہے۔

دیکھ لیجئے! شام کو مغرب کے وقت پیالہ لیے جوانان راستہ میں نظر آتے ہیں، بعضے دیکھ کر چھپ جاتے ہیں، جماعت میں حاضری نہیں، جماعت کے وقت دوسرے دھندے میں مشغول، ایمان ہی تو ہے، احتساب نہیں۔ بس نماز پڑھی تو نہیں، نفس سے حساب اور جائزہ نہیں لیا، اپنی ذات کے محتسب نہیں، دوسروں کے اوپر بڑا محاسبہ رکھتے ہیں: اپنے چھوٹوں یا قوم پر، اپنے نفس کا بھی تو محاسبہ چاہیے بلکہ نفس سے بڑی شدت اور کڑی نگرانی کے ساتھ حساب کرنا چاہیے، پھر کسی محتسب کی ضرورت نہیں کسی نگراں کی حاجت نہیں۔

کتابوں کا بھی ادب واحترام کیجیے

عزیزانِ من! میں تو شرماتا ہوں طلبہ کی نگرانی کرتے ہوئے، چور ہیں جورات کو نگرانی ہو؟ کہیں شریفوں کی بھی نگرانی ہوتی ہے؟ طلبۂ علم دین کو شریف ہونا چاہیے اور طلبہ شریف ہی ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ طلبہ کی نگرانی کرنے پر مجبور ہیں کہ کہیں لڑائی جھگڑا نہ ہوجائے، چناں چہ رات جو ایک صاحب کے پاس گذرے تو کتاب لیے لیٹے ہوئے سو رہے ہیں، لالٹین جل رہی ہے، کتاب دیکھنے کا یہ قاعدہ نہیں، خلافِ ادب ہے، حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کتاب کا اس طرح مطالعہ فرماتے کہ کتاب کو گھوماتے پھراتے بھی نہیں تھے، جس طرف کا حاشیہ دیکھنا ہوتا، خود گھوم جاتے تھے، کہنیوں کو زمین پر رکھ کر جھک کر مطالعہ فرماتے، دیکھتے ہی معلوم ہوجاتا کہ کوئی بہت دل چسپی کے ساتھ انہماک سے مشغول ہے، ایک اور صاحب کو دیکھا کہ غیر درسی کتاب ''شمع رسالہ'' ہاتھ میں ہے، بتلائیے! عربی کا طالب علم اور سینما کی باتیں، یہ حالات ہیں جو نگرانی پر داعی ہیں، یہی وہ ہیں جو دوسروں کے واعظ بن جاتے ہیں تو غیروں کے محتسب ہیں مگر اپنے محتسب نہیں، تقریبات، تعزیات (مرنے والوں کے اقرباء سے تسلی کی باتیں) وغیرہ اسلامی حق سمجھ کر کرو، یہ حقوق میں

سے ہیں، نفس سے احتساب اور نگرانی کرو کہ اس خیال اور دھیان سے ان کاموں کو انجام دے، ثواب بھی ملے گا، آسان بھی رہے گا، بے کار سمجھ کر کر کے بددل نہ ہوگا بلکہ ایک مفید اور کارآمد قربِ خدا کی چیز سمجھ کر کر کے منبسط ومنشرح رہے گا۔

اسی طرح بیوی کو کھلانا، اس کے منہ میں لقمہ رکھنا یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ کی بندی میری ذمہ داری میں ہے، اس کا میرے اوپر حق ہے، اسی طرح اولاد کو کھلانے، پلانے، پہنانے میں دھیان کر کے انجام دے، محض طبعی جذبے وتقاضوں کے ہی پیش نظر ان امور کو انجام نہ دے، اسی طرح کسی کے گھر میں آگ لگ جائے یا جاہ میں فرق آجائے یا خلافِ طبع ہو جائے یا کوئی سخت بول گیا، اس کو سبکی خیال کر کے اندر اندر ہی نہ گھٹے، اینٹھ مروڑ اور نفس طبیعت میں اشتعال نہ ہونے دے، بے قرار نہ ہووے، بے صبری نہ کرے، یہ جذبہ نہ ابھرنے دے کہ جب تک بدلہ نہ لے لوں، چین سے نہ بیٹھوں بلکہ ان سب مواقع میں نفس کو اس کے تقاضوں وجذبات اور اشتعال، بے قراری سے روکے رہے، اسی کو صبر کہتے ہیں۔ شکوہ، شکایت، بے ہودہ الفاظ، زبان درازی سے گالی طعن وغیرہ سے احتراز کرے، بس صبر سے کام لے تو ان سب میں ثوابات بہت ملیں گے، خاص قسم کی ایک معیت حق اور نصرتِ حق حاصل ہوگی۔

اسی طرح امر انفسی کے پیش آنے، بیمار ہو جانے پر خیال کرے کہ اللہ کی مصلحت ہے، میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا، قربِ حق حاصل ہوگا، ان کی مرضی یوں ہی ہے، میں نے تو جان بوجھ کر سبب اس کا اختیار نہ کیا تھا، اس پر صبر کیا تو اس پر بھی ثواب مل گیا۔ پہلے ذہول تھا، اب اس کا علم مستحضر ہو گیا، اس احتساب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قدم قدم پر ثواب اور تعب ومشقت کی چیز آسان ہو جائے گی، اس لیے احتساباً فرمایا۔ شب بیداری چوں کہ مشقت وتعب کی چیز ہے تو تنبیہ فرما دی کہ اے مؤمن! تجھے ذہول تھا، اب بچ کر چلا تو تیرے لیے یہ آسان ہے، اسی کا نام مراقبہ ہے۔

اصطلاحاتِ قوم سے حقائق ومعانی نہیں بدلتے

سب شریعت وقرآن وحدیث میں موجود ہیں، یہ فنی اصطلاحات ہیں، ان اصطلاحات کو قرآن وحدیث میں نہ پا کرا چٹنا اور وحشت کھانا نہ چاہیے، معانی پیش نظر رہنے چاہئیں جو کہ قرآن وحدیث میں موجود ہیں، اصطلاحات مقرر کر لینے سے وہ معانی نہ بدلیں گے، اگر کوئی رات کی روشنی کو کہے کہ دن ہو رہا ہے تو کیا رات نہیں رہی، دن ہو گیا یا دن میں بادل، آندھی وغیرہ سے اندھیرا ہو گیا، اس وقت کوئی کہے کہ رات ہوگئی بلکہ رات سے زیادہ رات تو کیا دن نہیں رہا؟، ثابت ہوا کہ اصطلاحاتِ قوم سے حقائق ومعانی نہیں بدلتے۔

بس حدیث میں ایماناً کے بعد احتساباً فرمایا، دلیل ہی اس بات کی ہے کہ یہ ضرور نافع چیز ہے، آج ہم مولویوں نے اس کو غیر ضروری، غیر مفید مان لیا۔ حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ ضروری اور نافع اور اہم ہے۔

چوں کہ احتساب سے ایمان میں زیادتی وترقی ہوتی ہے، عدمِ احتساب سے کمی ونقصان آتا ہے تو گویا امام بخاریؒ فرما رہے ہیں کہ اے مرجیہ! ہوش کی (دوا) کھاؤ! تم تو اعمالِ ضروریہ کو کہتے ہو کہ ان کو ایمان میں دخل نہیں، ہم کہتے ہیں کہ اعمال غیر ضروری کو بھی اس درجہ ایمان میں دخل ہے کہ ان سے ایمان میں رونق وجلاء آتی ہے، اس حدیث میں تشویق دلائی شب بیداری کی کہ احتساب کرو گے تو شب بیداری آسان ہو جائے گی اور اس کا شوق پیدا ہو جائے گا۔

غرض بہ ظاہر بات یہ چھوٹی تھی مگر آج آپ کو معلوم ہوا کہ احتساب بہت بڑی چیز ہے (یہ زینت ذو ایمان کی آرائش ہی نہیں، بلکہ بسا اوقات حفاظت ایمان کا سبب ہوتا ہے) کیوں نہیں؟ آپ ﷺ کی شان جامع الکلم ہے، چھوٹی بات بہت معانی کو جامع ہوتی ہے، اس باب کا ماقبل سے ربط اور دعوی پر دلیل

اور مرجیہ پر رد اچھی طرح ہو گیا۔ پس جہاں تک ہو سکے، اس رات احیاء کرنا چاہیے، نہ کہ مردہ کہ سوئے رہیں، نیز معلوم ہوا کہ ذنوب وسیئات ایمان کو زائل نہیں کرتے، پھر وہ حسنات سے، توبہ سے رفع ہو کر صفائی حاصل ہو جاتی ہے، ربط وطریق : سلسلہ مثبت سے بھی، سلسلۂ منفی سے بھی ہو گیا، باب وحدیث سے متعلق سب مضامین ختم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

❁ ❁ ❁

الدرس الرابع والأربعون

بَابٌ :الجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ

۳۵:حَدَّثَنَا حَرَمِيُّ بْنُ حَفْصٍ قَالَ:حَدَّثَنَا عَبْدُ الوَاحِدِ قَالَ:حَدَّثَنَا عُمَارَةُ قَالَ:حَدَّثَنا أَبُو زُرْعَةَ بْنُ عَمْرِو بْنِ جَرِيرٍ قَالَ:سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ انْتَدَبَ اللّٰهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ، لاَ يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيمَانٌ بِي وَتَصْدِيقٌ بِرُسُلِي، أَنْ أُرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ، أَوْ أُدْخِلَهُ الجَنَّةَ، وَلَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ، وَلَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ.

ترجمۃ الباب کی عبارت قراءت فرما کر اس کا ترجمہ فرمایا، بعدہ قراءتِ حدیث محمدی فرمائی، پھر اس طرح شروع فرمایا:

ترجمۃ الباب کا حاصل

یہ باب بھی جس میں جہاد کے متعلق بالا یمان ہونے اور ایمان میں دخل رکھنے کا بیان ہے، مقصود وہی مرجیہ پر رد کرنا ہے کہ دیکھو! من جملہ اعمال جہاد بھی ہے، اس کا ایمان میں دخل رکھنا اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے، پس تمہارا یہ کہنا کہ اعمال خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، ان کو ایمان میں کوئی دخل نہیں۔ محض لغو اور باطل و بے بنیاد ہے۔

”بَابٌ: قِيَامُ لَيْلَةِ القَدْرِ إلخ“ کے ساتھ اس باب کے عدم ربط کا اشکال اور اس کا جواب

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس باب سے قبل لیلۃ القدر کا باب ہے، اس سے اس باب کو ربط نہیں معلوم ہوتا ہے، ربط تو ماقبل کو آئندہ بابِ تطوعِ رمضان

سے ہے کہ لیلۃ القدر وتطوع رمضان دونوں رمضان سے متعلق ہیں؛ لہٰذا لیلۃ القدر کے باب کے بعد تطوع رمضان لانا چاہیے تھا مگر امام بخاریؒ نے ایسا نہیں کیا بلکہ دونوں بابوں کے درمیان الجہاد من الایمان کو لائے، جو بے ربط معلوم ہوتا ہے تو امام بخاریؒ نے ان تینوں ابواب کو ایسے غیر مربوط طریق پر کیوں قائم فرمایا؟ یہ ایک اہم مسئلہ واشکال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نظر دقیق اور فکر عمیق سے دیکھنا چاہیے! امام بخاریؒ بہت گہرائی اور دقت نظر سے کام لیتے ہیں، اپنے شاگردوں کو بھی وہ اسی طرح دور رس نظر اور نظر غائر کرنا سکھاتے اور اونچے درجے اور علم کی گہرائی تک پہنچانا چاہتے ہیں، چناں چہ یہاں ایک باریک اور عمیق ربط موجود ہے اور دو طریق سے ہے:

ایک یہ کہ بعض چیزیں بڑی مشقتیں رکھتی ہیں، ہر ایک کے بس کی نہیں ہوتیں اور مؤمن مخلص کی شان ان کا کرنا ہی ہے، جیسے منافق کی علامات ان سے جی چرانا، حیلہ سازی کرنا ہوتا ہے، لیلۃ القدر کی عبادت، شب بیداری، تہجد گزاری ایسی ہی ہے کہ سعیٔ بلیغ اور جہد تام، انتہائی دوڑ دھوپ کرنا درکار ہوتا ہے، راحت، نیند جیسی لذائذ ترک کر کے پوری رات بیداری، پھر شہوانی تعلق سے نہیں۔

جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے سنایا تھا کہ ایک شخص کا ایک عورت سے تعلق تھا مگر بات چیت کا موقعہ نہ ملتا تھا، اتفاق سے ایک دفعہ کوٹھے پر تھی، یہ گلی میں جا رہا تھا، نظر پڑی تو ٹھہر گیا اور بات کرنے میں مشغول ہو گیا، گفتگو کرتے کرتے رات ختم ہو گئی، وہ وقت آ گیا کہ مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی تو اس شخص نے حیرت سے کہا کہ بندۂ خدا! آج اتنی جلدی عشاء کی اذان پڑھ دی، کسی گذرنے والے نے یہ سن کر کہا: یہ عشاء کی اذان نہیں فجر کی ہے۔

تو لیلۃ القدر کی شب بیداری ایسی طبعی نفسانی دوستی کے ساتھ نہیں گذار رہا، اس لیے اور بھی شاق درشاق ہے تو قیامِ لیلۃ القدر اس قدر محنتوں اور مشقتوں اور

کوششوں کو چاہتا ہے جو بدونِ مجاہدۂ نفس ممکن نہیں (۱)، اس لیے امام بخاریؒ نے اس جہادِ مضمر (کہ یہ بھی ایک قسم کا جہاد ہی ہے اور اصل جہاد جہادِ نفس ہے، جو کہ جہاد معنوی ہے اس مناسبت سے جہادِ مضمر) کے بعد جہاد صوری کو لائے، اس لیے قیامِ لیلۃ القدر کو پہلے واضح کر دینا اور اس کو صاف طور سے بیان فرما دینا مناسب سمجھا۔ پس یہ باب اپنے ماقبل سے تضمنی ربط رکھنے کے باعث گویا اپنے ماقبل کا تتمہ ہے، اس وجہ سے اس کو مقدم اور تطوعِ رمضان کو مؤخر فرمایا کہ مضمر تک پہنچنا مشکل تھا؛ اس کی وضاحت اولاً ضروری ہے اور تطوعِ رمضان تو ایک خود ہی واضح وصریح چیز ہے، اس کو سب ہی جانتے ہیں۔

دوسرا ربط یہ ہے کہ لیلۃ القدر کے بیان میں عرض کیا گیا تھا کہ اس کی تعیین میں ۵۰/اقوال ہیں، یہ طالب صادق ان سب کو پانا چاہتا اور سب کے درجات وفضائل حاصل کرنے کا خواہش مند ہے، چنانچہ جاگنا، بیدار رہنا اختیار کرتا ہے، اب دو حال سے خالی نہیں : یا تو اپنے مطلوب اور متمنی کے مطابق پائے گا یا نہیں، پہلی صورت میں بڑے سے بڑا اجر حاصل ہوگا اور اگر لیلۃ القدر نہ پا سکا تو من وجہٍ تب بھی پالیا کہ حسبِ طلب اور حسبِ نیت اجر وثواب پا ہی لیا، پالینے پر ایک قسم کا اجر اور نہ پانے پر اور قسم کا اجر۔ بہرحال محروم کسی طرح نہیں۔

یہی دو شانیں جہاد میں بھی ہیں کہ شہادت حاصل ہوگی یا نہیں، پالینے میں عین مقصد حاصل ہوا، نہ پانے میں اجر وثواب کے ساتھ فتح یابی ومال غنیمت بھی حاصل ہوا اور کم سے کم اجر وثواب سے تو بھرپور ہو ہی جائے گا تو تمنائے شہادت

---

(۱) وجه المناسبة بين البابين من حيث إن المذكور في الباب الأول هو قيام ليلة القدر، ولا يحصل ذلك، إلا بالمجاهدة التامة ومقاساة المشقة وترك الاختلاط بالأهل والعيال، فكذلك المذكور في هذا الباب حال المجاهد الذي لا يحصل له الحظ من الجهاد، ولا يسمى مجاهدا إلا بالمجاهدة التامة ومقاساة المشقة الزائدة وترك الأهل والعيال.(عمدة القاري: ۲۲۸/۱)

لے کرمیدانِ جہاد میں جانا بھی اپنے اندر دو شانیں رکھتا ہے جیسے لیلہ القدر میں دوشانیں تھیں؛ لہٰذا قیامِ لیلہ القدر سے جہاد کو یہ ایک اور خاص الخاص مناسبت حاصل ہے، غرض بہت خوب صورتی اور باریک بینی کے ساتھ امام بخاریؒ نے حدیث تلاش فرما کراس سے ترجمہ باب قائم فرمایا(۱)۔

حدیث الباب کا حاصل اور خلاصہ

تو باب کا حاصل یہ ہے، گویا یوں فرمارہے ہیں کہ **"الجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ"** میرا دعوی ہے جس پر یہ حدیث دلیل اور شاہد عدل ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں نکلتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ داری اور ضمان وامان میں آجاتا ہے مگر شرط یہ ہے، اللہ کی راہ میں نکلنا مستحقِ کفالت وضمانت جب ہی ہوسکتا ہے، جب کہ ایمان باللہ وتصدیق بالرسل کے تقاضے نکلنے کے داعی ہوتے ہوں، دیگر اغراض وجذبات نہ ہوں؛ اس لیے کہ ایمان باللہ کا اثر یہ ہے کہ تمام حرص وہوائے نفسانی ختم، لہٰذا یہ باتیں مستحضر رکھے کہ میرا یہ نکلنا مال طلبی اور جاہ طلبی کے لیے نہیں، عصبیت لیے ہوئے نہیں، تعصّبانہ نہیں، لڑکیوں اورعورتوں پر فائز ہونا نہیں، غیظ وغضب وانتقام کے لیے نہیں، حکومت پانے اورصدارت کی کرسی حاصل کرنے وغیرہ کے لیے نہیں بلکہ محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اس کو میں نے اختیار کیا ہے اوربس، اسلام کی بلندی اس میں رکھی ہے، اس کو بلند کرنے اور میرے حاصل شدہ کلمہ وایمان کی حفاظت اورموانع واغیار سے مدافعت میرے ذمہ آگئی، اس لیے (ادھر ادھر نہ

---

(۱) وكما أن القائم ليلة القدر يجتهد أن ينال رؤية تلك الليلة ويتحلى بها، وإلا فيكتسب أجورا عظيمة، فكذلك المجاهد يجتهد أن ينال درجة الشهداء ومنزلتهم وإلا فيرجع بغنيمة وافرة مع اكتساب اسم الغزاة، فهذا هو وجه المناسبة وإن كان الترتيب الوضعي يقتضي أن يذكر باب تطوع قيام رمضان عقيب هذا الباب، وباب صوم رمضان عقيب هذا. (عمدة القاري: ۱/۲۲۸)

دیکھو! جس اعتبار سے کسی کو دیکھتے ہو، اس اعتبار سے مجھے دیکھو! تشبیہ نہیں دیتا کہ ہنسی آئے گی، اسی لیے میں کسی طرف نہیں دیکھتا کہ ذہن مشوش ہوجاتا اور مضمون رہ جاتا ہے، بری بات ہے، خلافِ ادب بھی ہے، امام مالکؒ درسِ حدیث فرما رہے تھے، اسی اثناء میں ایک بچھو نے کاٹا اور بار بار بہت سی مرتبہ کاٹا مگر امام مالکؒ بار بار بچھو کے کاٹنے پر بھی ادبِ حدیث کے غلبہ کے باعث خاموش رہے اور ادھر ادھر حرکت تک نہیں فرمائی، ہم کو ان اکابر سے ادب سیکھنا چاہیے مگر بڑے چلبلے ہیں، دن رات ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں، یہاں ذرا دیر بھی چین سے نہیں بیٹھا جاتا تو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے، اس کی حفاظت کے لیے نکلنا ہو، یوں خیال کرے کہ یہ کلمہ اپنے اندر بہت سی باتوں کو لیے ہوئے ہے، ان تمام کی رعایت اور غیروں کے موانع کی مدافعت دونوں میرے ذمہ آگئی ہیں، اب اس کو روکنے اور حفاظت کرنے اور رفع موانع کے لیے ضرورت ہے کہ زور اور قوت وسطوت ہو کہ بدون اس کے کما حقہ اس کا محفوظ رکھنا ممکن نہیں یہ قید مستحضر رہے۔

بہ غور سنا کیجیے! اپنے اساتذہ واکابر کے طفیل سے سب دفع دخل ہوتے رہتے ہیں۔ تو تمامی انواع واصناف حقوق کے ساتھ بقائے کلمہ ممکن نہیں بدون جہاد کے، اس کلمہ کا نفاذ وجریان وطریان ونشر واعلاء اس کے بغیر ممکن نہیں؛ اس لیے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ کلمہ یوں کہے: صاحبو! یہ کلمہ ہے جو تمام خوبیوں اور بھلائیوں کو جامع ہے، ہم اس کی دعوت دیتے ہیں، اگر آپ کو قبول ہے فبہا، ورنہ تمھاری خوشی کہ ”لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ“ دین میں زبردستی نہیں مگر یہ شرط ہے کہ کلمہ گو لاچار ومغلوب وعاجز ہوکر نہیں رہیں گے، بس لازم ہے اور ضروری ہے کہ آپ غالب ہوکر اور زبردست بن کر نہیں رہ سکتے، چوں کہ ایسی صورت میں اس کی حفاظت اور اعلاء نہیں ہوگا اور اعلاء ضروری، حفاظت لابدی ہے، پس مہربانی فرماکر تابع اور زیردست ہوکر رہیے، جس کی صورت قبولِ جزیہ ہے؛ تاکہ کل آپ

ہاتھ پاؤں نہ نکالنے لگیں، ہمارے کمزور بھائیوں پر دست درازی نہ کرنے لگیں، یہ ہم سے نہیں دیکھا جا سکتا، ہم نے اس کلمہ کو اختیار کیا ہے جو علو چاہتا ہے، سفل نہیں پسند کرتا۔ جب یہ ہے تو آپ کلمہ اختیار کرلو، ورنہ زیردستی اور مغلوبیت اختیار کریں گے یعنی جزیہ قبول کریں گے، ورنہ اعلانِ جنگ ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم بے چارگی اور کمزوری میں رہیں۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ جہاد صرف مدافعانہ ہی نہیں بلکہ ابتداءً بھی ہوئے ہیں، پس ہمارے بعض حضرات کا جہاد کو مدافعانہ طور ہی میں منحصر کردینا غلط ہے، چوں کہ اگرچہ اغیار حملہ آور نہ ہوں تاہم حفظ ماتقدم کے لیے بھی جہاد ہوتا ہے کہ ان کے حوصلے بڑھنے کا موقعہ نہ دیا جائے، کہیں ایسا کرنے یعنی ترکِ حفاظت ماتقدم سے کہیں ذلت کی زندگی نہ دیکھنی پڑے، ہمارے سلاطین اسلام نے پابندی چھوڑ کر یہاں تک نوبت پہنچادی جو مسلمانوں کو دیکھنی اور برتنی پڑ رہی ہے، دوسرے حاوی ہوتے چلے جارہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مجاہد نے طمع زروزن وحصول ملک واقتدار کے لیے نہیں بلکہ محض حصول رضائے باری کے لیے جہاد کیا ہے، اس لیے فرمایا کہ صرف ایمانی تقاضے سے جہاد ہو اور کسی غرض سے نہیں ارشاد باری ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ﴾ [النور: ۵۵]۔ یہ مطلب ہے حضور کی بتلائی ہوئی بات، حدیث شریف کا جو بیان کیا گیا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ اللہ تعالی کے ذمہ داری لینے کا مطلب اور اس کا اثر کیا ہے؟ سو مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کے ہر حال میں اللہ تعالی کی طرف سے کامیابی کا معاملہ ہوتا ہے، گویا حق تعالی یوں فرماتے ہیں کہ یہ بندہ میرے راستہ میں نکلا

ہے، پس یہ کسی حال محروم نہیں، خواہ ظاہری ہار ہو، پس اس سے ہمت اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔

دیکھا ہارنے والے کی بھی ذمہ داری لی ہے، یہ کیوں لی؟ اس لیے کہ اس کا نکلنا طمع وحرصِ زن دوشیزہ، غیظ یا انتقام وغیرہ کے لیے نہیں، فقط طلب رضائے الٰہی، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے تھا، تو گویا یوں فرما رہے ہیں کہ تمھاری بلا سے جیتے یا ہارے، تم دونوں صورتوں میں جیتے، ہارے کہاں؟ اس لیے کہ جان و مال یا صرف مال، دیگر موت ہتھیلی پر لے کر گھر سے نکلے تھے، پس تم نے جد و جہد اور خون پسینہ ایک کیا تو گو ظاہراً کامیاب نہ ہوئے مگر اصل مقصود رضائے حق اور اجر تھا، وہ تو حاصل ہو گیا، لہٰذا مایوس اور شکستہ دل اور متألم اور رنجیدہ کیوں ہو؟ پس میری ذمہ داری ہے، رہا یہ کہ ظاہری شکست کیوں دی؟ سو اس کو میں جانوں، غرض فی الحقیقۃ مجاہد دونوں صورتوں میں کامیاب اور بامراد و ماجور ہے۔

جہاد میں شکست کی عجیب حکمت

اجر دو قسم پر ہے : اجر آخرت، اجر دنیا۔ ظاہری شکست اس لیے کہ پھر لوٹ کر جہاد ہو، اس وقت کامیابی بھی اور اجر وثواب بھی، ایک پہلے جہاد کا، دوسرا اس جہاد کا، دو اجر ہو گئے تو دوہرا اجر دینا تھا، اس لیے ظاہری شکست دی گئی، غزوات میں جب کہیں ایسا ہوا، اسی حکمت سے ہوا، مصیبت پر مصیبت، ایک مشقت جہاد دوسرے شکست، تو طبعی رنج دیا گیا، اس پر بھی اجر ملا، گویا شکست میں بھی اجر اور فتح وظفر ہوئی تو ثواب کے ساتھ دنیاوی منافع غلام باندیاں، سیم وزر، آلاتِ حرب، پس ثابت ہوا کہ مجاہد ہر حال میں کامیاب اور بامراد ہے۔

"مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ" کے "أَوْ" کی بحث

مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ : اس پر اشکال ہوتا ہے کہ تردید سے معلوم ہوتا ہے کہ یا

اجر ملے گا یا غنیمت تو کیا غنیمت کے ساتھ اجر نہ ملے گا؟ اساتذہ اور شراح رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اجر تو معلوم تھا، چوں کہ نیت خالص تھی؛ اس لیے غنیمت کے ساتھ اجر کا ذکر اختصاراً حذف اولی ہوا(۱)۔

البتہ غنیمت کا ذکر برموقع اور پُر فائدہ ہے، اس لیے کہ غنیمت کا حصول معرضِ خفا میں تھا، چوں کہ حضراتِ صحابہؓ اصحابِ تقوی اور اصحابِ ورع تھے اور حرصِ دنیا سے بہت مجتنب رہتے تھے، ان کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ اعداء مغلوب ومہزوم ہوگئے، یہی مقصود تھا، اب ان کا سامان، لڑکے لڑکیاں وغیرہ چھوڑ دیں، چوں کہ دوسروں کی چیز پر قبضہ کرنا ٹھیک نہیں، ان کی شان بہت اونچی تھی، قبضہ تو درکنار، آنکھ بھر کر دوسرے کی چیز کی طرف نظر نہیں فرماتے تھے، ان کا معاملہ تو نرالا تھا (فی زماننا ایک شخص کی چیز کو ایک دوسرے نے چھودیا تھا تو ابن سعود شاہ عرب نے اس کی انگلی کاٹ دی تھی) تو غنیمت کا بیان فرما کر اس خیالی سوال وکھٹک کو دور فرمادیا، حکم فرمادیا کہ اب ان اشیاء کے مالک تم ہی بنادئے گئے تو بناء برخفا غنیمت کا بیان گویا ضروری تھا۔

یا یوں کہو! (آپ حضرات تو منطق پڑھ آئے) یہ "أو" بہ طور مانع الخلو ہے(۲)۔ اس وقت منطق طبعی تھی، ان حضرات کو نورِ فراست حاصل تھا، منطق پڑھنے کی ضرورت نہ تھی، اذہان میں سلامتی ودرستی تھی۔

أَوْ أُدْخِلَهُ الجَنَّةَ : یا قتل ہو کر شہید ہو گیا تو ذمہ داری یہ ہے کہ بلا حساب کتاب سیدھا جنت میں داخل کروں گا، اس جنت میں جو ساتویں آسمان پر ہے اور

(۱) قال القرطبي :إن الكلام في الأصل كان هكذا من أجر فقط، أو أجر وغنيمة، وكان فيه تكرار، فحذفَ الأجرُ من المعطوف، فصار من أجر أو غنيمة، والاختصار في مثل هذه الواضع شائع. لأن حصولَ الأجر معلومٌ، ومفروغ عنه، فصار ذكره حشوًا، فحذفه اعتمادًا على فَهْم السامع. (فيض الباری: ۱/۲۰۲)

(۲) وأجيب بأن معنى أو، لامتناع الخلو عنهما مع إمكان الجمع بينهما. (عمدة القاري: ۱/ ۲۳۱)

بالائی چھت عرش معلیٰ ہے، شہید ہوتے ہی حور کی گود میں گرتا ہے، وہاں حوریں انتظار میں رہتی ہیں، یہ حدیث میں آیا ہے، اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا تو دنیا سے کوچ کرتے ہی فوراً بلا تاخیر دخولِ جنت سے مشرف ہوگا، قیامت کا انتظار نہ کرنا پڑے گا(۱)، جنت میں آزادی کے ساتھ سیر وسیاحت اور کھانے پینے کی اجازت ہوگی، ارواح شہداء پرندوں کی شکل میں جنت میں مزے اڑاتے پھریں گی، شام کو عرش کے نیچے لٹکے ہوئے قندیلوں میں آ کر آرام وبسیرا کریں گی اور یہ فی الحقیقت پلنگ ہوں گے مگران کی شکلیں قندیل نما ہوں گی۔

شاید آپ کہیں گے: یہ کیسے؟ کیوں کہ یہاں گاؤں والے بھی ہیں، سو معلوم ہو کہ ایک کھاٹ ہوتی ہے، ایک مسہری، ایک چھپر کھٹ، ایک جھولا ہوتا ہے، جیسے ہم بنگلور گئے تھے، وہاں مختلف جگہوں کی سیر کی، مختلف مقامات پر جانا ہوا، نہ معلوم کہاں کہاں، جہاں جہاں کا بھی دانہ پانی تھا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک شاہ صاحب نواڑ کے جھولے میں آرام فرماتے ہیں، تو اسی طرح سمجھو کہ وہ پلنگ بھی تحت العرش قندیل نما ہوں گے۔

آگے فرماتے ہیں: **وَلَوْ لاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ** کہ شہید کے یہ درجات چوں کہ بہت اونچے ہیں اور کیوں نہ ہو، اس نے اپنی جان خدا کی راہ میں قربان کی، اس قربانی کے لیے اپنے اہل وعیال کو چھوڑ کر نکلا تھا، جب اتنے اونچے درجات ہیں تو پھر میں کیوں نہ تمنا کروں شہادت کی مگر کیا کروں؟ میں تو کسی چھوٹے بڑے لشکر سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا، ہر معرکہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں مگر اس وقت امت بڑی خفت میں مبتلا ہوجاتی، خصوصاً

(۱) قال القاضي عياض :يحتمل أن يدخله عند موته كما قال تعالي في الشهداء: {عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ}، وأن يراد دخوله الجنة مع السابقين المقربين بلا حساب ولا عذاب، وتكون الشهادة مكفرة لذنوبه.(شرح الطيبي:۲۶۲۵/۸،كتاب الجهاد،الفصل الأول)

دل دادگانِ سنت! جو سنت کی خاطر جان و مال لٹا دیتے ہیں، یہ لوگ ضرور اس فعل میں میری اتباع کریں گے، دوسرا ایسا کرنے میں اب صحابہؓ پر بھی مشقت ہوگی کہ بسبب مجبوری کے ان کو نکلنا مناسب نہیں ہوگا اور وہ میری محبت کی وجہ سے صبر نہ کر سکیں گے اور یہ ان کے لیے مضر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ قرآن پاک میں حکم ہے: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ ﴾ [النساء: ۷۱] کہ اپنے بچاؤ کا سامان اختیار کرو اور بیت المال میں اتنی گنجائش نہیں اور خود ان کے پاس بھی نہیں، دوسروں کو ان کا یہ حال دیکھ کر قلبی تکلیف ہوگی۔

تیسرے یہ کہ گھر سے زیور وغیرہ سامان چھپ کر نکالیں گے اور فروخت کر دیں گے جس سے اہل و عیال کو تنگی ہوگی اور وہ مشقت میں پڑیں گے، اس لیے ہر لشکر کے ساتھ جانا میں نے اپنے لیے لازم نہیں کیا، (جس لشکر کے ساتھ آں حضرت ﷺ شرکت فرماتے تھے، اس کو غزوہ کہتے ہیں اور جس لشکر کے ساتھ آپ ﷺ نے شرکت نہیں فرمائی، اس کو سریہ کہتے ہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ و جہاد میں حدود و قیود ہیں، سمجھے یا نہیں۔ گویا حضور اقدس ﷺ نے اس خیال سے پیش بندی و حفظ ما تقدم فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے وعظ و ترغیب جہاد سے جوش میں سب میدان جہاد میں نکل پڑیں اور آگا پیچھا کچھ نہ دیکھیں تو میں خود شریک نہیں ہوتا، ذرا مجھے دیکھ لیں، ولولہ و جذبہ روک کر حدود کی رعایت کے ساتھ یہ کام انجام دیا جائے، دیکھو! میں نے اپنا جذبہ روک لیا، آپ کا جذبہ اور رغبت دیکھ کر کون مسلمان بالخصوص صحابہؓ میں سے کون انسان جہاد سے رکتا؟ وہ تو دل و جان سے نثار تھے مگر آپ نے یہ بند لگا دیا لیکن آپ کی بار بار شہادت پانے کی تمنا فرمانے سے مقام شہادت کی بلندی و عظمت معلوم ہوئی نیز یہ کہ اس کے لیے مسلمان کو ہمیشہ ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

خاتمیت جیسا اعلیٰ مقام حاصل ہونے کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے مقامِ شہادت کی تمنا کیوں ظاہر فرمائی؟

اس تمنا فرمانے پر سوال یہ ہوتا ہے کہ اول تو آپ کو مقامِ نبوت حاصل پھر وہ بھی خاتمیت کے ساتھ جو اور بھی اعلی وارفع ہے، آپ ملائکہ سے بھی افضل ہیں پھر شہادت کی تمنا فرمائی تو کیا مقامِ شہادت ان سب مراتب ومقامات سے بھی افضل ہے؟ اساتذہ وشراح نے جواب دیا کہ ہے تو شہادت تیسرے درجہ ہی کی چیز، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَأُولَٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾ [النساء]: لیکن پھر تمنا فرمانا برائے تشویق ہے کہ دیکھو! باوجود میرے اتنے کمالات کے، میں بھی اس کی نیت رکھتا ہوں تو تم کو تو ضرور اور بطریق اولی اس کی نیت رکھنا اور تمنا رکھنا چاہیے۔

دوسرا جواب یہ ہے کئی قسم کے اجر جمع کرنے میں کوئی منافات اور حرج نہیں، جیسے ایک شخص فرض نمازوں کا پابند ہو اور تہجد بھی ادا کرتا ہے تو وہاں کوئی کہنے لگے کہ فرائض پڑھتے ہو، پھر نوافل بھی! کیا نوافل کا درجہ ومرتبہ فرائض سے بھی اونچا ہے؟ تو جواب یہی ہوگا کہ فرائض کا اجر الگ ہے، نوافل کا الگ ہے، دونوں اجر وثواب حاصل ہوجانے میں کچھ حرج ونقصان نہیں، پس یہ باعث خلجان بھی نہیں، ایسے ہی مختلف کارہائے خیر سے آپ کے بھی درجات بڑھتے رہتے ہیں، ہر امتی کے فعل حسن سے بھی آپ ﷺ کے درجات میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

اور یہ ایسا ہی ہے کہ قیامت میں مؤذنین کی گردنیں اونچی دیکھ کر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام غبطہ فرمائیں گے کہ کاش ہم بھی مؤذن ہوتے!، آج

مؤذنین کو معمولی و حقیر سمجھا جاتا ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مؤذنین کے درجات، مراتب انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے اونچے ہوں، تو اسی طرح آپ ﷺ نے بھی شہید کے درجۂ شہادت کو دیکھ کر غبطہ فرمایا مگر آپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔

اللہ تعالی نے اپنے محبوب ﷺ کی شہادت والی تمنا کیوں پوری نہیں فرمائی؟

اس پر پھر اشکال ہوتا ہے کہ آپ تمام مخلوقات سے زیادہ اللہ تعالی کے محبوب اور لاڈلے ہیں، اس کے باوجود آپ کی تمنا اور وہ بھی بار بار ہو رہی ہے، اس کو پورا نہیں فرمایا گیا، حالاں کہ محبوب کی ہر ادنٰی سے تمنا بھی پوری کی جاتی ہے، چہ جائے کہ کوئی تمنا بار بار کی جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بار بار تمنا کرنا گویا دل سے دعا اور چاہت ہو رہی ہے، سو چوں کہ آپ ﷺ میں عبدیت کی شان غالب تھی اور اس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ بار بار طلب اور لگن برابر اپنے مالک کے ساتھ ہو، اور اللہ تعالی کا اس تمنا کو پورا نہ فرمانا اس لیے ہوا کہ اللہ تعالی کے یہاں آپ کا درجہ و مرتبہ اور عزت بہت زیادہ، نہایت اونچا ہے اور شہادت میں ظاہراً تذلیل کی شکل ہے، اس لیے کہ کفار غالب آ کر پچھاڑتے ہیں تو حق تعالی کی غیرت نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ ہمارے محبوب ﷺ کی ظاہری بھی تذلیل اور شکستگی و پستی ہو لیکن آپ کو معنوی شہادت عطا فرمائی گئی، گویا حق تعالی شانہ نے فرمایا کہ اے محبوب! تیری یہ تمنا پوری نہ ہونے دوں گا، چوں کہ اس میں ظاہری ذلت ہے جو آپ کے لیے ہمیں گوارا نہیں۔ ہاں! ایک دوسرے طریقے سے اس کی تکمیل کر دی جائے گی، وہ یہ کہ ایک یہودیہ آپ کو زہر کھلا دے گی جس کا اثر بہ وقتِ موت ظاہر ہوگا اور آپ کی یہ موت

بالمعنی شہادت ہوگی، نیز اس طریقے سے بھی کہ آپ کے نواسے شہید ہوں گے تو ان کو شہادت حاصل ہونا گویا آپ کی ہی شہادت ہے، اور یہ اس لیے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا جسم آپ کے جسم سے بہت اشبہ تھا، ایک کا نصف اعلی، ایک کا نصف اسفل، تو بایں شکل آپ کو شہادت حاصل ہوئی۔

جہاد کی اجازت کب ہے؟

جہاد ایک بہت بڑی چیز اور غیر معمولی بات ہے، اس کی اجازت ایک دم نہ ہوگی بلکہ اس سے پیشتر دوسرے اور جہادات کرنے ہوں گے، ان پر کامیابی کے بعد یہ جہاد حقیقی اور اصلی جہاد ہوگا، ورنہ صوری رہے گا، شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہ کہاں سے کہہ دیا؟۔ سو بات تو میں پڑھی لکھی ہی کہتا ہوں مگر آپ کے نفع کے لیے انطباق کر دیتا ہوں حق تعالی کے فضل اور اکابر کے طفیل سے، چناں چہ یہ بات ایمان باللہ وتصدیق بالرسل سے نکل رہی ہے، چوں کہ اطلاقات میں اصل حقیقت خالصہ اور کاملہ مراد ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ ایمان خالص ہو، اس میں غیر ایمان کی آمیزشات نہ ہوں اور عموماً انسان طمع وحرص اور لالچ وآرزو وغیرہ عادات مقتضائے ایمان کے خلاف میں پیوست ہے، پس ان کو نکال کر اور ان کے مقابل مقتضائے ایمان عادات مثل توکل، صبر، قناعت، رضا سے قلب کو آراستہ ومزین کر کے جہاد میں نکلنا ہوگا اور یہ کام معمولی نہیں، اس میں بہت خطرات ہیں، اس لیے بڑے مجاہدے اور جہادات درکار ہیں جس کے لیے بڑے علم کی ضرورت ہے، معمولی علم کافی نہیں، تو یہ سب مضمون یہیں سے نکل رہا ہے۔

جہاد کی اقسام

تو جہاد کے اقسام متعدد ہوئے: (۱) جہاد مع النفس (۲) جہاد مع الشیطان (۳) جہاد مع الکفار (۴) جہاد مع المنافقین (۵) جہاد مع المبتدعین (۶) جہاد مع اہل المنکرات۔ پھر جہاد مع النفس کی چار شکلیں اور قسمیں ہیں، خوب سمجھ لو اور اچھی

طرح غور کے ساتھ سن لو: (۱) جہادِ علم (۲) جہادِ عمل (۳) جہادِ تعلیم وتلقین (۴) جہادِ استقلال واستقامت اور ثبات وبلند حوصلگی پر قیام۔

جہادِ علمی

نفس کی جبلت جہالت ہے، ورنہ سب مولوی ہوتے، جبل گردد جبلت نہ گردد، حدیث شریف میں ہے: ''إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهِ، فَصَدِّقُوا، وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهِ، فَلَاتُصَدِّقُوا بِهِ، وَإِنَّهُ يَصِيرُ إِلَى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ'' (۱) اگر تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا، اس کی تصدیق کر سکتے ہو اور اگر یہ سنو کہ فلاں شخص کی جبلت بدل گئی تو اس کی تصدیق نہ کرنا، تو علم اگر جبلی ہوتا تو علم سے دور دور رہنا، اس سے بچتے پھرنا (جیسا کہ دیکھا جاتا ہے) کیوں ہوتا؟ سب علم والے ہو جاتے مگر ایسا نہیں بلکہ اکثر لوگ جہل میں ہیں، جہالت سے مانوس ہیں، علم سے گھبراتے ہیں؛ اس لیے علم کے لیے پہلا مقابلہ نفس سے کرنا پڑے گا، مقاومتِ نفس اسی کو کہتے ہیں، اب نفس کو اس کی جہالت سے نکال کر علم کی طرف لگانا ہوگا تو وہ کشاکشی کرے گا، اب اس کو ہمت سے علم میں لگانا مجاہدہ ہوگا پھر استاذ کی قمچی اور کھانا بند ہونا، سب کے سامنے رسوا کرنا، چھے گھنٹے مقید رہنا وغیرہ بہت سے مشقتیں دشواریاں برداشت کرنا سہارنا ہوں گی، کیوں؟ ''لِكُلِّ شَيْءٍ آفَةٌ، وَلِلْعِلْمِ آفَاتٌ'' (۲)،

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل، عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضی الله تعالی عنه، مِنْ حَدِيثِ أَبِي الدَّرْدَاءِ عُوَيْمِرٍ رضی الله تعالی عنه، رقم الحديث: ۲۷۴۹۹.

(۲) قال القاري: هو من كلام بعض الأعلام، وأقول: قال النجم: "لكل شيء آفة" رواه الحارث بن أبي أسامة عن ابن مسعود بلفظ: "لكل شيء آفة تفسده، وآفة هذا الدين ولاة السوء". ورواه الديلمي عن أبي هريرة بلفظ: "لكل شيء آفة تفسده، وأعظم الآفات آفة تصيب أمتي؛ حبهم الدنيا وحبهم الدينار والدرهم، يا أبا هريرة لا خير في كثير من جمعها؛ إلا من سلطه الله على هلكتها في الحق". وتقدم في "آفة الكذب بأبسط". (كشف الخفاء ومزيل الإلباس: ۲/۱۷۱، حرف اللام، رقم الحديث: ۲۰۶۴)

نفس کہاں کہاں کی باتیں لاکھڑا کر دیتا ہے اور موانع میں اُلجھا دیتا ہے، اس لیے کہا جاتا ہے : جس نے علم دین حاصل نہ کیا، اس نے دونوں جہاں کی بدبختی اور بد نصیبی اپنے سر رکھی، اس لیے بھائی صاحبان! علم کے موانع دور کرو اور الجھنیں کاٹو، خیالات پراگندہ، اوہام فاسدہ دور کرو اگر علم چاہتے ہو۔

علم دنیا تو طبع اور مذاق کے موافق ہے، نفس اس سے بڑا خوش ہوتا ہے، فیس داخلہ اور فیس امتحان، کرایہ، بورڈنگ اور کھانے کے دام خوشی خوشی برداشت کرتا ہے، ابھی ایک صاحب پاکستان سے آئے، وہ سنا رہے تھے کہ ستر سے نوے تک کا ماہانہ کھانا ہے مگر وہ گوارا ہے، اماں بھی خوش اور ابا بھی خوش، یہ اس لیے کہ یہ علم نہیں، دنیا ہے، اس لیے اس کی طرف نفس چلتا ہے، دماغ بھی رغبت کرتا ہے اور زبان بھی چوں و چرا نہیں کرتی، برخلاف علم دین کے۔ جیسے ایک دورۂ حدیث کے طالب علم صبح کو میرے پاس پہنچے، وہ جلدی دورہ لینا چاہتے تھے، ان کو سمجھانا بڑا مشکل ہو گیا، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کے والدین موجود ہیں: ابا بھی، اماں بھی۔ میں نے کہا: پھر کیوں اس قدر جلدی ہے؟ آپ کے سر پر تو والد صاحب کا سایہ ہے، انھوں نے کہا کہ والدین نے الگ کر دیا، پھر بیوی کو میکے چھوڑ آؤ، سسرال والے بھی ساتھ نہیں دیتے۔ دیکھئے بی اے اور ایم اے اور ایل اے میں ساتھ دیتے، یہاں علم دین میں انھوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

تو بچو! پہلا جہادِ علمی ہے اس میں اول کامیاب بنو۔

جہادِ عملی

اس کے بعد جہادِ عملی ہے، اب علم تو حاصل ہو گیا مگر عمل کس طرح ہو؟ یہ تو بہت مشکل ہے، اس میں بہت مشقتیں ہیں، نفس کو بڑا کچلنا اور رگڑنا پڑتا ہے؛ اس لیے نفس کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ تو جہلی نماز اور علمی نماز اور مقبول، غیر مقبول سب

جان گیا مگراس کومقبول طریقہ سے ادا کرنے نہیں دوں گا۔ چنانچہ دوست کے ساتھ تو گھنٹوں تک اطمینان کے ساتھ ہم کلامی، خوشی خرمی کے ساتھ رہتا ہے مگر نماز کو (جو کہ پروردگارِ عالم کے ساتھ ہم کلامی ہے، اس کو) قید سمجھتا ہے اور جلد ہی بھاگنے کی سبیل سوچتا ہے، بس آگئے مسجد میں، جیسے بچے بادلِ ناخواستہ مکتب میں آگئے لیکن چھٹی کا انتظار لگا ہوا ہے، بس وقت آنے کو ہوا اور چھٹی سے پہلے ہی بستہ بند کیا اور چھٹی ملتے ہی بھاگے، ایسے ہم مکتب عمل مسجد میں پہنچیں گے ابا کے ساتھ یا خود ہی مگر جاتے ہی نکلنے کی سعی شروع تو یہ بہت خراب حالت ہے؛ اس لیے کوشش کرنا ضروری ہے کہ اس خرابی سے نکل کر علم کے مطابق اپنی زندگی بنائیں، چوں کہ علم بلاعمل ایسا ہے، جیسے خنزیر کے گلے میں ہار۔

تعلیمی و تلقینی جہاد

پس جہادِ علمی کے بعد جہادِ عملی میں کامیابی حاصل ہوجانے کے بعد جہادِ تعلیم وتلقین شروع ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ پہلے اپنے نفس کو علم کا پابند کرنا ضروری ہے پھر دوسروں کے لیے علم کو استعمال کرے کہ جب تک علم وعمل اپنے اندر نہیں، دوسروں کو کیسے پہنچایا جائے؟ اگر پہنچانا ہوا بھی تو خامیوں اور کوتاہیوں، کمزوریوں کے ساتھ ہوگا، صحیح طریقے پر اور پورے طریقے پر پہنچانا علم وعمل پر موقوف ہے، دلیل سے سورۃ العصر ہے، ان ہی چار چیزوں کو بیان فرمایا اور ایمان جو کہ علم وعقائد کا نام ہے اور اس کے بعد اعمال صالحہ کا ذکر مقدم فرمایا، اس کے بعد تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا امر فرمایا، تو علم وعمل ساتھ ساتھ ہونا چاہیے کہ جس بات کا علم ہوا اس پر عمل بھی ہوتا رہے، اس سے علم بھی مضبوط ہوتا رہتا ہے اور آیندہ حقیقی علم کے اضافہ کی قابلیت بھی پیدا ہوتی رہتی ہے، نہ یہ کہ اول علم ہی علم حاصل کرتے رہیں، عمل برائے نام رہے پھر پورے طریقے پر عمل فراغت تعلیم کے بعد کریں، یہ شیطانی رہزنی اور

دھوکہ دہی ہے ۔ پس جب اس طرح علم مع عمل کے ساتھ تعلیم سے فراغت ہوجائے ، اس وقت نیابت رسول حاصل ہوگی اوراب علمائے ربانیین ہوگئے، اس سے قبل محض علم سے ربانیین نہ کہا جائے گا، جب ان تینوں میں مشاق ومحن اٹھالیں۔اب کے حوصلگی مایوسی کی صورتیں آئیں گی، اس وقت پورے حوصلہ مندی سے مرادانہ وارثبات کے ساتھ برابر لگے رہیں ، اداس ہوکر چھوڑ نہ دیں، قدمِ استقلال میں کمزوری، ڈگمگاہٹ پاس نہ آسکے۔

جہاد مع شیطان

شیطان ایمان، اخلاق واعمال کے بارے میں دست برد کرے گا، توحید ورسالت، موت ، قیامت ، میزان ، وزن اعمال وغیرہ میں طرح طرح کے وساوس ڈالنا شروع کرے گا، آپ نہایت قوت کے ساتھ لاپرواہی کر کے ضعف نہ آنے دیں، بے التفاتی کی طاقت سے وساوس کو ختم فرمادیں، اب یہاں قبضہ نہ ہوا تو اخلاق واعمال کے بارے میں دست برد کرے گا، آپ عملی جدوجہد سے اس کا مقابلہ کرتے رہیں، جب دیکھے گا کہ یہ شخص میرے بس سے باہر ہے تو مایوس ہوکر آنا چھوڑ دے گا مگر آپ کے ذرا تغافل سے موقع پا کر پھر چھاپا مارے گا۔ پس باوجود کمال پر ناز ہوجانے کے ایک آن بھی غافل نہیں رہنا، جیسے جہاد میں ذرا غفلت ہونے پر دشمن حملہ کردیتا ہے، اسی طریقے سے شیطان تاک میں رہتا ہے، ذرا غفلت سے فوراً حملہ آور ہوجاتا ہے، لہٰذا اس کے مقابلہ میں بڑی قوتِ صبر سے عملی جدوجہد کے ذریعہ مدافعت کرتے رہنا ضروری ہے۔

جہاد مع الکفار والمنافقین

کفار سے جہاد قوتِ بازو، جسم وجان اور مال کو پوری قوت سے مقابلے میں

خرچ کر دینے سے ہوتا ہے کہ جان خدا کی دی ہوئی ہے، اسی کی راہ میں اس کو خرچ کر دیا جائے، مار کر یا مر کر۔

منافقین کے ساتھ جہاد زبان و دل سے ہوتا ہے اور کبھی جان و مال سے بھی مگر کم؛ اس لیے کہ وہ اپنے میں ملا ہوا ہے تو ان کے ساتھ جان و مال سے مقابلہ نہ کیا جائے گا۔

جہاد مع اہل المنکرات والبدع

ان کے ساتھ تین طرح جہاد ہوتا ہے: ہاتھ، زبان اور دل سے جیسا کہ حدیث ہے: ''مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ''(۱)، سب سے آخری درجہ دل میں ناگواری رہنا ہے، ان کی طرف سے یہ بھی نہ ہو تو اپنے اندر ایمان ہی نہیں ہے۔

جہاد مع الکفار جہادِ نفسی کے بعد ہے

یہ چار اقسام ہیں، ہر ایک کی نوع الگ الگ، جب تک آپ جہادِ نفس کے جمیع اقسام سے فارغ نہ ہوں گے، اس وقت تک کفار و منافقین کے ساتھ جہاد نہیں۔ بس اول درجہ جہادِ نفس کا ہے، اس کے بعد کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کرنے کا ہے، یہی وجہ ہے کہ تیرہ سال تک جہاد کی اجازت نہ تھی کہ نفس و شیطان سے جہاد کر کے تاہنوز یقین و صبر کی قوت محکم نہ تھی، اس لیے یہی حکم ہوتا رہا: نماز پڑھو، اس طریقہ سے علم و عمل دونوں کی ساتھ ساتھ مشق ہوتی رہی، جیسے خیاطۃ میں علم و عمل ساتھ چلتے ہیں، ایسا نہیں کہ کارخیاطہ سیکھنے والے کو پہلے قواعد بیان کرتا ہو پھر عمل کراتا ہو، اسی طرح کتابت میں بھی علم و عمل دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اسی

(۱) صحيح مسلم، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضى الله تعالى عنه، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ بَيَانِ كَوْنِ النَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ مِنَ الْإِيمَانِ إلخ، رقم الحديث: ۷۸.

طرح قرأت میں، اس لیے تیرہ سال تک اجازتِ جہاد نہ ہوئی، نماز وغیرہ علم وعمل، اخلاق، تصحیح اخلاق کی مشق کرائی جاتی رہی، جب تک اس کے خوگر نہ بنے اور اتباعِ شریعت طبیعت ثانیہ نہ بن گئی، اس وقت تک دیگر مشاق کا تحمل نہ کرایا گیا۔ گویا حکم ہوتا رہا کہ نماز وغیرہ کے ذریعہ ان رانوں اور پٹھوں کو مضبوط کرو، ان سے محنت کرو، نماز کے لیے مسجد میں آؤ، دن کو بھی، رات کو بھی، تن درستی میں بھی، بیماری میں بھی حتی الامکان۔

زکوۃ دو: تاکہ مال خرچ کرنے کی عادت ہو، اچھا روزہ رکھو کہ بھوک پیاس کی سہار اور ہم دری، مواسات پیدا کرو کہ جہاد میں ان سب کی ضرورت ہوتی ہے تو جہاد علمی، عملی، تعلیمی سے یقین وصبر کی قوت حاصل ہو جائے تو ہجرت کرائی گئی، تب کفار سے جہاد کرایا، اس سے معلوم ہوا کہ جہاد ہجرت پر موقوف ہے اور ہجرت ایمان پر موقوف ہے، جب انسان ایمان وہجرت و جہاد کا خوگر ہوتا ہے تو فلاحِ دارین اس کو حاصل ہوتی ہے۔

اب اعلائے کلمۃ اللہ ہوا، پس دنیا میں بھی فلاح، آخرت میں بھی، اس تقریر میں ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہو گیا ہوگا، اگر حفظ کر لیا ہوگا تو وعظ کہہ دینا۔ سمجھے مولانا! ابھی بہت سے جہادات کرنے ہیں، ابھی تو جہادِ علمی ہے، عملی نہیں بلکہ برا نہ ماننا، کما حقہ جہادِ علمی بھی نہیں کہ نہ کتب پوری پڑھتے ہیں، اس پر اگر اہل مدرسہ فیل کر دیں یا کھانا بند کر دیں، بھاگ نکلتے ہی، بس ہو گیا پڑھنا، یک در گیر، محکم بگیر، اس کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا، اس لیے ہمیں چاہیے کہ جم کر اور لگ لپٹ کر تعلیم میں لگیں۔

حضرت مسیح الامت اور جہاد نفسی کی اقسامِ اربعہ

بندہ بہ بانگ دہل کہتا ہے: دیوبند کا زمانۂ تعلیم چارسالہ جہاد کے ساتھ گذارا ہے۔ دیوبند میں ہم کو سب نے جانا اور ہم نے کسی کو نہ جانا، پس کتاب ہوتی اور ہم

ہوتے، کبھی جمعرات بعد عصر میاں صاحبؒ کی مجلس میں اور جمعہ کو مزارات میں جانا اور کبھی کبھی حضرت مدنیؒ کے یہاں جانا ہوا۔ اس لیے اساتذۂ کرام اب تک کرم فرما ہیں، یہ جہادِ علمی تھا، اور جہادِ عملی فرائض کی پابندی کے ساتھ اوابین چاشت، اشراق، واخلاق کی نگہداشت۔ اللہ کے فضل سے حضرت شیخ (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے تلاوت ومناجات اور تہجد میں تھوڑی دیر ذکر اللہ، ادھر مطالعہ وتکرار اور امتحان کے موقع پر پوری پوری راتیں جاگ کر گذاریں۔ الحمد للہ تعالیٰ! جہادِ نفس وشیطان کے تمام درجات طے کر کے سند علمی ملی، ادھر شیخ سے بھی اجازت ہوگئی، اب بحمد اللہ تعالی ذکر کے ساتھ زندگی گذر رہی ہے، کبھی یہ دے گیا، کبھی وہ دے گیا، ایسے ہی تم ہو جاؤ، میں یہ چاہتا ہوں؛ کیوں کہ ان جہادات پر رحمت خاصہ آتی ہے، احادیث میں بیانات سب پڑھ رہے ہو، اب عمل کی ضرورت باقی ہے، سو پورے صبر وہمت سے لگے رہو، مایوسی نہ آنے پائے، کمر بستہ ہمت بلند کے ساتھ بس لگے رہو، اس طرح آپ بھی رحمت خاصہ کے مستحق ہو جائیں گے۔

اللہ تعالی عمل کی توفیق عطا فرماویں، آمین یارب العالمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❁ ❁ ❁

الدرس الخامس والأربعون

بَابٌ: تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الإِيمَانِ

٣٦: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ، قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.

کتاب الایمان کے ساتھ بابِ ہٰذا کی مناسبت

امام بخاریؒ اپنے مسلک کے اثبات اور مذہب مرجیہ کے رد میں ایمان میں ترکیب اور قبولِ زیادت ونقصان کو بیان کرتے چلے آرہے ہیں، اسی مقصد کے پیش نظر یہ باب منعقد فرمایا، بتلانا اور ثابت کرنا یہ ہے کہ اعمالِ ضروریہ تو اجزائے ایمان ہیں ہی، ان کے علاوہ اعمالِ غیر ضروریہ جو نفل واستحباب کا درجہ رکھتے ہیں، وہ بھی ایمان میں دخیل ہیں، ان میں قصور وفتور آجانے سے بھی ایمان میں فرق آجاتا ہے، چہ جائے کہ ان کو ترک کیا جائے، تب تو بطریق اولی اور زیادہ فرق آجاتا ہے، دیکھو! میں اس باب میں بعض ایسے ہی اعمالِ تطوع کے متعلق بیان کرتا ہوں اور حضور اقدس ﷺ سے اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں، جس سے معلوم وثابت ہو رہا ہے کہ تطوعات بھی ایمان میں دخل رکھتے ہیں، وہ بھی ایمان کا شعبہ ہیں، ایمان سے الگ نہیں۔

یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، فرماتے ہیں: جس نے بہ تقاضائے ایمان رمضان میں قیام کیا یعنی نماز غیر فرض پڑھی الخ، مراد تقاضائے ایمان سے نیت ثواب ہے، جیسا کہ بیان کیا جائے گا، آگے احتساب پر مزید بیان کیا جائے گا، تطوعاً قیام کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فرائض عشاء سے زائد دوسری چیز کا ذکر ہے، اس پر تمام

گناہ معاف ہونا فرمایا گیا، جب یہ خصوصیت اور اثر تطوعِ رمضان کا ہے تو اس سے اعلی اور ضروری اعمال کیوں کر داخل ایمان نہ ہوں گے؟ ، یہی مقصد ہے ترجمۂ باب ودعوائے امام بخاریؒ کا، اس کی دلیل میں حدیث مسند بیان فرمائی ، مناسبت حدیث بالباب ومناسبت باب بکتاب الایمان تو ظاہر ہے، محتاج بیان نہیں۔

اب رہ گئی یہ بات کہ اس باب کو باب سابق "بَابٌ :الجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ" کے ساتھ کیا ربط اور کیا مناسبت ہے؟ سو میں نے کل بیان کیا تھا کہ اس "بَابٌ : تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الإِيمَانِ" کو "بَابٌ :قِيَامُ لَيْلَةِ القَدْرِ مِنَ الإِيمَانِ" کے ساتھ تو ربط ظاہر ہے، چوں کہ لیلۃ القدر اور قیامِ رمضان دونوں رمضان سے متعلق ہیں لیکن "الجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ" کے ساتھ بہ ظاہر اس کا ربط نہیں ۔ ہاں! نظر عمیق اور غور سے دیکھا جائے تو اس کا ماقبل باب کے ساتھ ایک ربط خفیفی اور عمیق معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ کل دو وجہ "بَابٌ :الجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ" کے "بَابٌ :قِيَامُ لَيْلَةِ القَدْرِ مِنَ الإِيمَانِ" کے ساتھ ربط بیان کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ لیلۃ القدر کا یہ ضمنی مضمون ہے اور مصرح کے ساتھ مضمر کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے قیام لیلۃ القدر کے بعد اس کو لانا ایسا ہے، جیسا کہ کسی مضمون کا ضمیمہ اور تتمہ؛ اس لیے ایک مضمون سے مع متعلقات ومضمرات فارغ ہونا چاہتے ہیں، لہٰذا لیلۃ القدر کے بعد "بَابٌ :الجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ" کا لانا بے ربط نہیں بلکہ ضمنی اور تابع مضمون لا کر اب مستقل دوسرا باب تطوعِ قیامِ رمضان بیان فرما رہے ہیں۔

باب سابق میں اقسامِ جہاد کے سلسلۂ بیان میں بتلایا تھا کہ ظالمین یعنی اہل منکرات وبدعات کے ساتھ بھی جہاد ہوتا ہے، پھر ان سے مدافعت کا طریق بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ علمی وعملی ، تعلیمی وتلقینی ، استقلالی، ثباتی قوتیں پختہ طریقہ سے حاصل کی جائیں ، اس سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جب تک ان تمام جہادات سے فراغت نہ

ہو، لیلی، نہاری، ظاہری، باطنی کوئی عمل کماحقہ انجام پذیر نہیں ہوسکتا نیز بتلایا تھا کہ یقین وصبر یہ دوقوتیں ایسی ہیں کہ ان سے تمام موانع ومضار کی مدافعت آسانی سے ہوجاتی ہے، جتنی ان میں کمزوری ہوگی، اتنی ہی مشکلات پیش ہوں گی، سہولتیں اور آسانیاں معدوم ہوں گی۔ پس اسی طرح قیامِ رمضان بھی ہر ایک کا نہیں، رؤیتِ ہلال کے بعد اول عبادت رمضان شریف کی یہی ہے کہ یہاں تطوعِ رمضان سے بالاتفاق تراویح مراد ہے، علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور عینی رحمۃ اللہ علیہ اور قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ سب اسی پر متفق ہیں۔

پھر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ تراویح کے علاوہ یہ خصوصیت اجر دیگر نوافل رمضان کے لیے بھی ہے یا نہیں، بعض محدثین (جن میں علامہ نووی بھی داخل ہیں) نے دیگر نوافل رمضان کے لیے یہ خصوصیت نہیں مانی، شافعیہ میں ابن حجر اور حنفیہ میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ خصوصیت اجری دیگر نوافل رمضان کو بھی شامل ہے (۱) اور رمضان کے نفل فرضِ غیر رمضان کے برابر ہوتے ہیں، دوسرے مہینوں کے نوافل میں یہ بات نہیں (۲)۔

جہادِ نفس کے بغیر تراویح کی ادائیگی بہت مشکل ہے

تو تراویح وہ ادا کرے گا جس نے جہاد نفس کرلیا ہوگا، ورنہ بعض تو صرف نو رکعت پر ہی بس کرلیتے ہیں آٹھ رکعت چار سنت اور چار نوافل ترک کردیتے ہیں بالخصوص طلبہ، وعلماء، عوام تو بے چارے پڑھتے رہتے ہیں۔

(۱) ومعنى من قام رمضان:من قام بالطاعة في ليالي رمضان، ويقال:يريد صلاة التراويح، وقال بعضهم:لا يختص ذلك بصلاة التراويح بل في أي وقت صلى تطوعا حصل له ذلك الفضل. (عمدة القاری: ۲۳۳/۱،بیان الإعراب والمعاني)

(۲) مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ، كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدَّى فِيهِ فَرِيضَةً كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ الحديث.(صحيح ابن خزيمة،عَنْ سَلْمَانَ رضی الله تعالى عنه،بَابُ فَضَائِلِ شَهْرِ رَمَضَانَ إِنَّ صَحَّ الْخَبَرُ،رقم الحديث:۱۸۸۷)

ایک پرلطف واقعہ: فرض بھی آدھے ہو گئے!

ہماری پھوپی صاحبہ تھانہ بھون تشریف لائیں، حضرت سے بیعت ہوئیں، چھوٹی پیرانی صاحبہ کے یہاں قیام تھا، چھوٹی پیرانی صاحبہؒ جو عشاء کی نماز سے فارغ ہوئیں تو پھوپی صاحبہؒ نے تعجب سے کہا کہ اتنی جلدی فارغ ہوگئیں، فرمایا: جی ہاں! پھوپی نے عرض کیا: کیسے؟ پیرانی صاحبہؒ نے اپنی رکعات شمار کرادیں، انھوں نے بڑا تعجب کیا کہ سترہ میں سے آٹھ ہی پڑھیں!۔ فرمایا: ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے، آپ مہمان ہیں، آپ سے باتیں کرنا تھیں، اس لیے اتنی ہی پڑھ کر بس کیا۔ عرض کیا: اچھا! یہ ضروری نہیں۔ پھر ہم دہلی گئے، وہ بھی ہمراہ تھیں تو وہاں انھیں نماز قصر بتلائی گئی، اس پر کہا: اللہ توبہ! تھانہ بھون تو عشاء کی نماز آدھی ہوگئی تھی، دہلی فرض بھی آدھے ہو گئے۔ عامی تھیں، بس چند سورتیں یاد تھیں۔

مولانا! ان کو نماز کا بڑا شغف تھا، یہ حال تھا کہ سوتے میں نماز پڑھتی تھیں، ہمارے گھر میں سے بیان کررہی تھیں کہ میں نے ان کو سوتے میں سنا کہ اللہ اکبر کہہ کر تمام نماز بالترتیب پڑھ کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر جا کر ختم کی، آواز میرے کانوں میں صاف آرہی تھی، یہ عامیوں کا حال ہے، اور ہمارا حال یہ ہے کہ پہلے تو کچھ پڑھ بھی لیتے تھے، قدوری پڑھ کر نفل ترک کردی، بھلا تراویح تو کیسے مشکل نہ ہوں گی۔

توجس نے نفس سے جہاد کرلیا، اس کو ہی نمازِ تراویح آسان ہوں گی، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روزہ تو رکھتے ہیں مگر تراویح کے تارک ہیں اور جو شروع بھی کردی تو بس چار ہی کہ بعد جھومنا شروع کردیتے ہیں، اوائل لیالیٔ رمضان کے بعد صفوف میں کمی ہوجاتی ہے پھر جس دن مٹھائی کی رات آتی ہے تو دوگنے ہوجاتے ہیں تو اس دن تراویح احتساباً نہیں پڑھنے آتے، مٹھائی کے لیے آتے ہیں، تو بدونِ جہادِ نفس تطوعِ رمضان کی پابندی نہیں ہوتی، یہ ماقبل باب سے ربط ہوا۔

رکعاتِ تراویح کی بحث

اب رہی یہ بات کہ کتنی رکعت؟ اس کو بھی بیان کر دیا جائے: حنفیہ کے یہاں بیس رکعات ہیں اور ائمہ اربعہ کے یہاں بھی بیس سے کم نہیں بلکہ اہل حق میں سے کسی کے نزدیک بھی بیس سے کم نہیں، زائد اگرچہ ہوں، صرف غیر مقلد اہلِ حدیث نے آٹھ اختیار کی ہیں، مشہور ہے کہ امام مالکؒ کے یہاں چھتیس ہیں، وجہ اس کی یہ تھی کہ مکہ میں ہر ترویحہ کے بعد طواف اور ۲/رکعت پڑھتے تھے، اہل مدینہ نے خیال کیا کہ ہم طواف سے بھی محروم اور اس کے بعد ۲/رکعت سے بھی محروم ہیں تو انھوں نے ہر ترویحہ کے بعد چار رکعات کا اضافہ کیا(۱)، اب چالیس ہوئیں یا آخری ترویحہ کی چھوڑ کر چھتیس ہوئیں، ان کے دو قول ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تراویح جماعت کے ساتھ ہے یا بلا جماعت ہے، سو دونوں طرح مشروع ہے، اس بناء پر بعض نے خیال کیا ہے کہ یہ سب ان کے یہاں تراویح ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ تراویح تو ان کے یہاں بھی بیس ہی تھی، باقی رکعات نوافل تھیں۔

شیوع جماعت تراویح

آپ ﷺ اولاً انفراداً گھر میں پڑھتے تھے، بعد میں ایک مرتبہ مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرمائی پھر ناغہ پھر مسجد میں، اسی طرح چوتھی یا پانچویں مرتبہ لوگ بہت زیادہ جمع ہو گئے تو آپ نے مسجد میں پڑھنا ترک فرمادی اور ارشاد فرمایا کہ مسجد فرائض کے ساتھ ہے، بعدہ گھر ہی ادا فرماتے رہے اور فرمایا کہ مجھے

(۱) وإنما فعل أهل المدينة هذا لأنهم أرادوا مساواة أهل مكة فإنهم كانوا يطوفون سبعًا بين كل ترويحتين فجعل أهل المدينة مكان كل سبع أربع ركعات. (شرح القسطلانی: ۴۲۶/۳)

خوف ہے کہ یہ تمھارے اوپر فرض ہوجائے اور تم سے نہ نبھے؛ اس لیے میں جماعت سے نہیں پڑھتا(۱)۔

اسی طرح زمانۂ نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام وزمانۂ خلافت ابی بکرؓ میں عمل رہا اور کچھ دورِ عمری میں بھی ایسا ہی رہا مگر پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا ہونے پر اجماع ہوگیا۔

اور تراویح سنت مؤکدہ ہیں اور ختم فی التراویح بھی سنت ہے مگر پھر افضلیت اس کی بیان کی گئی کہ حافظ قرآن تراویح گھر پڑھے، پس ایک حافظ سامع ہو، نہ یہ کہ جیسا ہمارے زمانے میں حفاظ اپنا اپنا ختم کرکے بعض مسجدوں میں بھیڑ لگادیتے ہیں مگر فتوی اس زمانے میں مسجد میں جماعت کے ساتھ تراویح ادا کرنے پر ہے۔

تراویح کے علاوہ نوافل کی جماعت کا مسئلہ

پھر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ احیائے لیالیٔ رمضان جماعت نوافل کے ساتھ ہو یا نہیں؟ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جماعت نوافل رمضان میں بھی بلا کراہت جائز ہے اور غیر رمضان میں بھی اور جماعت میں نمازی زیادہ ہوں یا کم، دونوں برابر ہیں اور قیاس فرمایا فرائض وتراویح اور نوافل کسوف پر(۲)، علامہ ابن حجرؒ بھی ان ہی میں داخل ہیں۔

اور امام اعظمؒ مکروہِ تحریمی فرماتے ہیں، علامہ عینیؒ بڑے متصلب حنفی ہیں، فرماتے ہیں ہرگز نفل کی جماعت نہ کرنا چاہیے، مکروہِ تحریمی ہے، یہ عبادت ہے،

(۱) أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّهُ لَمْ يَخْفَ عَلِيَّ شَأْنُكُمُ اللَّيْلَةَ، وَلَكِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُفْرَضَ عَلَيْكُمْ فَتَعْجَزُوا عَنْهُ.الحديث(مصنف عبد الرزاق،عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ تعالی عنہا،بَابُ قِيَامِ رَمَضَانَ، رقم الحديث:۷۷۴۷)

(۲)فإن قلت:إنَّ صلاةَ الكسوفِ والاستسقاء والتراويح سُنَّة، فلزم أَن لا تكون جماعةً قلت:كأن تلك مستثناةٌ من ذلك. على أن صَرَّح في »الغاية« بوجوبِ صلاةِ الكُسوف.(فيض الباري:۲/۵۸۶)

یہاں قیاس کی گنجائش نہیں، صرف نقل پر مدار ہے، اور نقل حضور اقدس ﷺ اور صحابہؓ کے تعامل سے ثابت نہیں چناں چہ آپ ﷺ کے تہجد کے متعلق کہیں ثابت نہیں کہ آپ نے جماعت کے ساتھ ادا فرمائے، صرف ایک دفعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما بزمانۂ طفولیت آپ کے ساتھ تہجد میں شریک ہو گئے تھے، اسی طرح صحابہؓ نے بھی تہجد میں اور لیلۃ القدر میں جماعت کے ساتھ نوافل ادا نہیں فرمائے، حضرت امام اعظمؒ حافظ قرآن تھے، ایک کلام پاک تراویح میں اور ایک تنہا بغیر جماعت نوافل میں ختم فرماتے تھے اور اخیر شب رمضان میں ایک رات میں دو دو قرآن پاک ختم فرماتے تھے مگر جماعت کبھی نہیں کی۔

ہمارے اکابر نے بھی نوافل کی جماعت کبھی نہیں کی، فتاوی موجود ہیں، شامی وشرح ہدایہ، فتاوی مولانا عبدالحی صاحبؒ (لکھنوی) سب میں مکروہِ تحریمی لکھا ہے (۱)۔ ہمارے حضرت شیخ الہندؒ تمام رات جاگتے تھے، صرف ایک حافظ ساتھ ہوتے تھے، وہ آپ کا کلامِ پاک سنا کرتے، ایک مرتبہ مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ مع دو مقتدی نوافل میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے، ایک صاحب اور شریک ہو گئے، تیسرے سلام کے بعد ان کا کان پکڑ کر انھیں باہر نکال دیا، حضرت مجدد الف ثانیؒ کا زمانہ ہے، انھیں معلوم ہوا کہ ان

(۱) (وَلَا يُصَلِّي الْوِتْرَ وَ) لَا (التَّطَوُّعَ بِجَمَاعَةٍ خَارِجَ رَمَضَانَ) أَيْ يُكْرَهُ ذَلِكَ.(رد المحتار على الدر المختار: ۴۸/۲)وقال الكشميري رحمه الله:ولا جماعةَ فيه عندنا، وكُرِه له التداعي. وهو على اللغة عندي، فإنَّ اللهَ سبحانه لما جعلنا في مُكْنةٍ مِن تَرْكها وفِعْلها رأسًا، فأين ينبغي أن نتداعى له الناس. فالنِّداء مِن خصائص المكتوبة.....قال الفقهاء:إنَّ الجماعةَ في النوافل مكروهةٌ إلا في رمضانَ. ولم يَفْهمْ مُرادَهم بعضُ الأغبياء، فَحَمله على جوازِ الجماعةِ في النَّفْل المطلق في رمضان، مع أنَّ مرادَهم التراويحُ لا غيرُ فافهمه، فإنَّ العِلْمَ لا يتحصَّلَ إلا بعد السَّبْر.(فيض الباري: ۵۸۶/۲)

کے سلسلے میں ایک صاحب نوافل کی جماعت کرتے ہیں، آپ نے تحریر فرمایا کہ افسوس اور صد افسوس ہے کہ ہمارا سلسلہ جو اتباعِ سنت کا عادی ہے اس میں یہ بدعت جاری ہوگئی، جماعت سے نوافل ادا کرنا ہرگز ہرگز نہ چاہیے تو محققن کا فتوی وتعامل نوافل کی جماعت کا ثابت نہیں، بعض نے اس کی اجازت دی کہ امام اور تین مقتدی ہوں تو درست ہے مگر دوام نہ ہو۔ اس لیے بعض محققین نے زیادتیٔ شوق احیائے لیالی کے باعث عوام سے بچنے اور بعض خواص سے بھی بچنے کو جماعتِ تراویح ومسجد ترک کر کے گھر میں تراویح میں قرآن پاک پڑھا ہے۔

ہمارے زمانہ کے علماء کا عمل کیا قابل اتباع ہوسکتا ہے، جب کہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ پہلے زمانہ کے محققین کے تفردات بھی قابل اخذ نہیں، اس لیے مسئلہ یہی ہے کہ نوافل کی جماعت نہیں، تراویح کی بیس رکعات کی جماعت کے ساتھ ادا ہونے پر البتہ اجماع ہو چکا ہے، اسی طرح مسجد میں ہونے پر بھی اجماع ہے۔

مقصودِ باب ردِ مرجیہ ہے، بہ ایں طور کہ اس سے ثابت ہے کہ نوافل سے بھی ایمان میں رونق وجلاء آتی ہے، پس اعمالِ نافلہ مفید للایمان ہیں تو اعمالِ ضروریہ تو بطریق اولی مفید اور مکمل ایمان وباعث ازدیاد وترقی ہوں گے، پھر تمھارا کہنا کہ اعمال کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں، وہ ایمان کے لیے کسی حیثیت سے بھی مؤثر ودخیل نہیں، کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

بَابٌ :صَوْمُ رَمَضَانَ احْتِسَابًا مِنَ الإِيمَانِ

۳۷: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلاَمٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.

باب سابق کے ساتھ ربط کے سلسلے میں ایک اشکال اور اس کے جوابات

اس باب کا ماقبل کے ساتھ ربط ظاہر ہے، البتہ ایک اعتراض ہوتا ہے، وہ یہ کہ ماقبل باب میں تراویح تطوعِ رمضان کا بیان تھا اور اس باب میں صومِ رمضان کا بیان ہے، اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا کہ اول صوم رمضان کو لاتے پھر تطوعِ رمضان کو؛ اس لیے کہ صومِ رمضان فرض ہے اور تراویح تطوع ونفل ہے اور فرض درجۃً مقدم ہوتا ہے نفل پر؛ اس لیے ترتیب ذکر میں بھی اس کے درجہ کی رعایت کرنا موافق عقل تھا تو مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دینا یہ تو حضرت امام بخاریؒ کی شان سے بعید ہے۔

(۱) جواب ظاہر ہے کہ رویتِ ہلال کے بعد اولاً جو مطالبۂ شریعت ہوتا ہے اور جو عبادت کی جاتی ہے، وہ یہی تراویح ہے تو جب عملاً وہ مقدم ہے تو ذکراً بھی اس کو مقدم کر دیا، صوم کو عملاً وطبعاً تأخر حاصل ہے، بس ذکراً بھی اس کو مؤخر فرما دیا، پس مقتضائے حکمت کے خلاف نہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں پہلے رات آتی ہے پھر دن آتا ہے، اس لیے رات کا عمل پہلے ہوتا ہے اور دن کا عمل بعد میں ہوتا ہے تو جو چیز زماناً مقدم تھی، اس کو ذکراً بھی مقدم فرما دیا، پس اشکال کی بات نہیں۔

(۳) اور لطیفہ ونکتہ کے طور پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تراویح صیام کے لیے بہ طور تمہید ہے اور تمہید اصل مقصود پر ہمیشہ مقدم ہوتی ہے۔

(۴) یا یوں کہ جیسے بڑوں تک پہنچنا براہِ راست مشکل ہوتا ہے، اس لیے اس سے چھوٹوں کو واسطہ بنایا جاتا ہے، چنانچہ بادشاہ سے ملاقات بدونِ توسط وزیر وغیرہ ناممکن اور مشکل ہوتی ہے، اسی طرح یہاں فرائض وسنن ہیں، فرائض کو

شروع کر دینے اور ان میں داخل ہونے میں سنن کا توسط طریق مقبولیت ہے مگر ہر جگہ اس سے مسئلہ نکال لینا کہ ہر فرض سے پہلے سنت ہونا چاہیے، یہ صحیح نہیں۔

جیسے بعض نے فرمادیا کہ مدینہ میں پہلے حاضری ہو پھر حاجی بیت اللہ شریف جائے یعنی یہ اگر چہ ٹھیک ہے مگر دوام بہر حال بہتر نہیں، بڑے تو کہہ دیتے ہیں مگر میں کہتے ہوئے رکتا ہوں کہ بعض حنفیہ فرماتے ہیں کہ فرض حج میں پہلے بیت اللہ شریف جائے، بعد میں مدینہ منورہ اور حج نفل میں برعکس یعنی اول مدینہ جانا افضل ہے۔

(۵) ایک پانچویں توجیہ یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ دو قسم کی عبادات ہیں: ایک فعلی، ایک ترکی۔ یہاں تراویح فعلی عبادت ہے اور روزہ ترکی عبادت ہے اور فعلی ترکی پر راجح اور مقدم ہوتی ہے؛ اس لیے یہاں تراویح کا بیان بیانِ صوم پر مقدم فرمادیا، پس باب ہٰذا کے ماقبل کے ساتھ ربط ومناسبت پر جو اشکال ہوتا تھا، وہ دفع ہو گیا۔

غرض امام بخاریؒ کی یہ ہے کہ اب تک تو بتلایا تھا کہ اعمالِ حسّیہ جوارح جزوِ ایمان ہیں، ابھی تک یہ نہیں بتلایا گیا تھا کہ باطنی اعمالِ معنوی بھی جزوِ ایمان ہیں یا نہیں بلکہ ترکِ عمل کے متعلق معلوم نہ ہوسکا تھا، اس سے وہم نہ کیا جائے کہ ان کو دخل نہ ہوگا۔ اب ہم بتلاتے ہیں کہ ترکی اعمال اور غیر حسی بھی ایمان کا جزو ہیں، وہ بھی ایمان میں دخل رکھتے ہیں، دلیل یہ حدیث باب ہے۔

إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا: احتساب یہ ہے کہ عبادت بہ طور عادت نہ ہو اور نہ طبعاً، نہ ریاءً اَوشہرۃً ہو، نہ دفع طعن واعتراض کی غرض سے ہو بلکہ محض اخلاص سے حصولِ رضائے باری تعالیٰ اور حصول ثواب کے خاطر ہو۔

ایماناً ہو یعنی تقاضائے ایمان سے بہ حالت ایمان ہو کہ اس کے بغیر کوئی عمل آخرت صحیح نہیں، منتج ثوابِ آخرت نہیں، یوں کافر مشرک کو اس کی نیکی اور

بھلائی کا دنیا میں صلہ دے دیا جاتا ہے مگر معاملہ یہیں ختم ہوجاتا ہے، آخرت میں بالکل کوئی بدلہ نہ پائے گا تو نیت جو احتساب کا حاصل ہے، اس کے بغیر بھی عمل ثواب وعبادت نہیں بنتا۔

اور یہ اعمالِ غیر مقصودہ وحسیہ کا حکم ہے کہ وہ بلا نیت کے اگر چہ صحیح ہوجائیں گے مگر باعث ثواب نہیں ہوں گے، جیسا کہ کسی نے وضوء کی نیت نہ کی ہو اور بارش میں یا دریا میں بھیگ جاوے، وضوتو ہوجائے گا، اس سے نماز وغیرہ عبادات ادا کرسکتا ہے مگر اس وضوء کا ثواب نہ ملے گا، علی ہذا جنبی بلا نیت غسل اگر غوطہ زن ہوتو منھ ناک میں پانی گھس جانے اور تمام بدن کے تر ہوجانے سے پاک تو ہوجائے گا، سب عبادات کی ادائیگی صحیح ہوجائے گی لیکن اس غسل کا ثواب نہ ملے گا۔

اور اعمالِ مقصودہ وشرعیہ تو بلا نیت ادا بھی نہیں ہوئے جیسے کہ نماز، روزہ وغیرہ، تو ثواب تو بلا ایمان حاصل نہیں ہوتا اور ایمان ہوتے ہوئے عمل ثواب سے خالی ہوسکتا ہے، یہ چھوٹی سی بات احتساب سے متعلق اس باب میں بھی آ گئی ہے۔

مغفرتِ ذنوب کے متعلق ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اب مغفرتِ ذنوب کے متعلق کلام باقی رہا، یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ احادیث میں مغفرتِ ذنوب کے متعلق مختلف اعمال مذکور ہیں: نمازِ جمعہ کا جمعہ آیندہ تک کے لیے باعث مغفرت ہونا، عرفہ سے دو سال تک کے ذنوب کا معاف ہوجانا، ایک رمضان کا دوسرے رمضان تک کے لیے مغفرت کا سبب ہونا اور ایک فرض نماز سے دوسرے فرض نماز تک کے گناہ معاف ہونا تو پھر کوئی وقت ایسا کہاں رہا کہ ذنوب باقی رہ جائیں؟ حج سے سب پچھلے معاف (ہم نے بھی حج کیا تھا، اب پانچ سال کے بعد پھر ارادہ ہے، اللہ تعالی پورا فرمادیں اور گناہ بھی سب معاف فرمادیں۔آمین) تو پھر جب گناہ ختم ہی ہوتے

رہے، اب کیا معاف ہوگا؟۔

جواب یہ ہے کہ گناہ تو دم بہ دم ہوتے ہی رہتے ہیں اور کچھ نہیں تو ہماری تو ہر عبادت بھی بہتیرے گناہوں پر مشتمل ہوتی ہے، میں تو اپنی ہر عبادت ایسی ہی سمجھتا ہوں۔ زبان ہی کے گناہوں کو دیکھ لیجئے، ۴/ ۶/ ۸/ ۱۰/ رہی نہیں، کتاب اٹھا کر دیکھئے! بہت ملیں گے، یہ الگ رہے، پھر نہ معلوم صبح سے شام تک کتنوں کے بدنوں پر ہاتھ پہنچتا ہے اور کتنے تصورات کیے جاتے ہیں، کوئی عضو بھی حتی کہ کپڑے بھی گناہوں سے محفوظ نہیں تو اعمال مذکورہ حدیث باب جیسوں سے گناہ صغائر معاف ہوجاتے ہیں۔

اب رہا سوال یہ کہ پھر کبائر کیسے معاف ہوں گے؟ سو وہ توبہ سے معاف ہو جائیں گے، اب پھر سوال یہ ہوگا کہ اگر بڑے گناہ کسی کے نہ ہوں اور چھوٹے طاعات سے معاف ہوگئے تو اس کے بعد جو ایسے اعمال کا صدور ہو جن کے متعلق مغفرت ذنوب کا وعدہ آیا ہے، تب کیا ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال رفع درجات کا باعث ہوں گے، مثلاً کسی نے فجر سے ظہر تک نفس کی نگرانی اور احتساب رکھا کوئی گناہ نہ ہونے دیا تو اب صلوٰۃ ظہر سے کفارۂ ذنوب نہیں بلکہ درجات بلند ہوں گے(۱)۔

تو بھائیو! میں اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ یہی تو نہیں کہ جہاں ہیں، وہاں ہی رہیں؟ بلکہ ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ آگے بڑھتے رہیں، دنیاوی امور میں ہر شخص

---

(۱) فالجواب أن كل واحدة من هذه الخصال صالحة لتكفير الصغائر فإن صادفتها كفرتها وإن لم تصادفها فإن كان فاعلها سالماً من الصغائر لكونه غير مكلف كالصغير أو موفقاً لم يفعل صغيرة أو فعلها وتاب أو فعلها وعقبها بحسنة أذهبتها (إن الحسنات يذهبن السيئات) فهذا يرفع له بها درجات ويكتب له بها حسنات وقال بعض العلماء ويرجى أن يخفف عنه بعض الكبائر أن كان لفاعلها.(الكواكب الدراري: ۱/۱۵۸)

آگے پڑھنا چاہتا ہے : جس کے پاس سو روپے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ سو کے ہزار ہوجائیں یا کم سے کم سو کے دوسو۔ بہرحال! بڑھنا بڑھانا چاہتا ہے اور یہ تو کوئی نہیں چاہتا ہے کہ کم ہوجائیں، ایک کے سو ہوجانا چاہتا ہے تو پھر امورِ دین میں یہ بات کیوں نہیں؟ ان میں ترقی کی دُھن کیوں نہیں کی جاتی؟ ایک نماز کو سو نماز بنانے کی لگن کیوں نہیں ہوتی؟ اور وہ اس طرح کہ مثلاً فجر کے بعد کوئی گناہ نہیں کیا، حتی کہ ظہر کا وقت آ گیا، اب ظہر کی نماز پڑھی تو یہ سب بیچ کا وقت بہ جائے گناہوں کے، نیکیوں سے بھر گیا، پس جب یہ چاہتے ہیں کہ آگے بڑھیں تو گناہوں کو چھوڑ کر رہیں، رفع درجات اور ترقی ہوتی رہے گی۔

پس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد مرجیہ پر رد کرنا ثابت ہوگیا کہ اعمال کو ایمان میں بہت دخل ہے کہ مغفرت ذنوب ہوکر ایمان جگ گیا اور ضعف دور ہوکر قوت پکڑ لی، باب اور کتاب سے مناسبت ظاہر ہے، اللہ تعالی ہم سب کو اسبابِ مغفرت کے ساتھ وابستگی اور تقویت ایمان و تکمیل ایمان کی دُھن اور توفیق ارزانی فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❁ ❁ ❁

الدرس السادس والأربعون

بَابٌ :الدِّينُ يُسْرٌ وَ قَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ

اَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ الحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ

۳۸: حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الغِفَارِيِّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ المَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ.

امام بخاریؒ شروع کتاب الایمان سے یہاں تک فرقِ باطلہ مرجیہ، کرامیہ، معتزلہ اور خوارج پر رد کرنے اور ان کے باطل مذہب کے ابطال میں ترکیب ایمان کو بیان کرتے ہوئے آرہے ہیں اور اجزائے ایمان کو ثابت فرماتے رہے کہ یہ بھی ایمان سے ہے یعنی اس کا جزء ہے، یہ بھی ہے اور یہ اسلام سے ہے، یہ دین سے ہے یعنی اس کا جزء ہے، من جملہ ان کے اخیر میں قیام لیلہ القدر اور بعدہ الجہاد وتطوع رمضان تھا، اس طرح بیانِ اجزاء اور اثباتِ ترکیب ایمان سے معلوم ہو گیا کہ ایمان میں زیادتی بھی ہوتی ہے اور کمی بھی، پورے اجزاء سے ایمان کامل اور اکمل اور جتنے اجزاء کم ہوں گے، اتنا ہی وہ ناقص وانقص ہوگا پھر جتنے اجزاء بڑھتے رہیں گے، ایمان بھی بڑھتا اور زیادہ ہوتا رہے گا اور ترقی ہوتی رہے گی۔

بابِ ہٰذا کے اندازِ بیان پر اشکال اور اس کا جواب

اب اس عنوانِ باب پر اشکال ہوتا ہے، سوال کیا جا سکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے مثل وطیرہ اور طرزِ سابق کے یہاں من الایمان، من الاسلام، من الدین وغیرہ کا عنوان نہیں اختیار فرمایا تو اپنی عادت سابقہ اور وطیرہ کے خلاف کیوں فرمایا؟ یہاں ''الیسر من الدین'' یا اسی کے مثل دیگر عنوان کیوں ترک فرما دیا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مثل سابق یہاں کسی مذہب کا ابطال اور رد کرنا مقصود نہیں بلکہ جملہ معترضہ اور دفع دخل مقدر کے طور پر ہے، اشکال ہوسکتا ہے کہ بعض ابواب آپ نے ایسی چیزوں پر مشتمل بیان فرمائے ہیں جو ذی تعب اور ذی محنت ومشقت اجزائے ایمان ہیں، ان کا بجالانا ہر ایک کا کام نہیں تو دین میں عسر اور تنگی ہوگئی، مثلاً قیام لیلۃ القدر اور جہاد اور پھر رمضان کے روزوں کے ساتھ تراویح میں بہت محنت اور مشقت ہے، جیسا کہ تفصیلاً تقریر میں گذر چکا۔ یہ سب بیانات موجبِ عسر ہیں، ہر مؤمن سے کہاں ہوسکتا ہے؟ اور پھر تقاضائے ایمان سے فرماتے ہیں، یہ بھی مشکل ہے، چوں کہ ہر عمل میں ایمان کا استحضار بھی ہر ایک کو حاصل نہیں۔

گویا اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ"الدِّینُ یُسرٌ"عسر تنگی کچھ نہیں، دین تو سہل ہی سہل اور سراپا سہولت ہے، الدِّینُ میں الف لام عہد خارجی ہے، مراد دین اسلام ہے(۱)، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] تو یہاں دین سے مراد دین محمدی اسلام ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ آسان ہے، سراپا یسر وسہولت ہے یعنی اس میں بالکل تنگی وعسرو دشواری نہیں، چناں چہ فرمانِ ایزدی ہے:﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾[الحج: ۷۸] کہ دین اسلام میں کسی قسم کی تنگی ودشواری نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ ادیانِ سابقہ میں آسانیاں تھیں یا دشواریاں؟ سو اپنا خیال یہ ہے کہ حق تعالی نے تو آسان ہی بنایا تھا مگر لوگوں نے خود اس میں تنگی پیدا کرلی یا تحریف کرکے مشکل پیدا کرلی، ورنہ اس زمانے کے اعتبار سے ان کا دین سماوی بھی آسان تھا(۱)۔

(۱) فإن قلت:ما الألف واللام في الدين؟ قلت:للعهد وهو دين الإسلام.(عمدة القاري: ۱/۲۳۵)

(۲) ومعناه بعثت بالملة الإبراهيمية التي مبناها على السهولة والمسامحة المخالفة لأديان بني إسرائيل وما يتكلفه أحبارهم ورهبانهم من الشدائد.(الكواكب الدراري: ۱/۱۶۰)

دین کے سہل اور آسان ہونے کی دل کش تقریر

الحاصل امام بخاریؒ نے فرمایا کہ دین تو آسان ہی ہے اور وہ اس طرح کہ اول اپنے اور خالق کے تعلق ونسبت کو ملاحظہ کرو، اس سے معلوم ہوگا کہ تمھارے لیے ہمہ وقت سراپا عبادت رہنا تقاضائے عقل ہے، کوئی آن غافل نہ رہا جائے، زبان، قلب، جوارح سب طاعت وعبادت میں لگے رہیں؛ اس لیے کہ خالق برتر نے انسانوں کی پیدائش سے پہلے تمام ضروریات وراحات بقائے وجود کا سامان بلا درخواست وطلب پیدا فرمادیا پھر بعد وجود از ولادت تا بلوغ تغذی وتربیت کا عجیب انتظام فرمایا کہ پیدا ہونے کے بعد بہترین دودھ: نہ گرم، نہ ٹھنڈا، ڈبہ میں مہر بند بلا دخل والدین پیدا فرمادیا اور القائے طریقہ سے بلا تعلیم غیر پینے کا طریقہ سکھلا دیا، اس طرح بلا کسب وہنر تغذی پہنچتی رہی، اس انعام واحسان عظیم اور کثیر در کثیر نعمتوں کو نظر انداز نہ کرو پھر مزید برآں یہ کہ بلوغ تک کسی چیز کا مکلف نہیں بنایا، نماز وغیرہ تو کجا! سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ کے کہنے کا بھی مکلف نہیں بنایا! حتی کہ اسم ذات ایک مرتبہ کہنے کا بھی مکلف نہیں بنایا، بلا کسی پابندی اور غلامیت کے تربیت اور پرورش کرتے رہے، کوئی محنت اور فکر ذمہ نہیں رکھا، یہ کتنا بڑا احسان ہے، یہی احسان کافی تھا، اسی کا شکریہ اور بدلہ عمر بھر ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ دوسرے کثیر در کثیر احسانات الگ رہے، تو پھر دین میں کتنی سہولت، اور آسانی ہے، پھر بھی زبان پر یہ آوے کہ دین میں عسر اور تنگی ہے، نہایت بے حیائی اور بے غیرتی ہے، سوچ کر نہ دیکھا، فکر نہیں کیا، عقل سے کام نہیں لیا۔ گویا امام بخاریؒ یوں فرمارہے ہیں، اور ان کا دعوی ہے کہ دین سراپا سہولت ہے۔

چناں چہ بعد بلوغ جو مکلف فرمایا تو احکام تکلیفیہ میں سہولت اور آسانی رکھی، کچھ فرائض رکھے، کچھ مستحبات و نوافل جن میں سے اس باب سے متصل ابواب سابقہ میں بیان کردہ عبادات تطوع رمضان وقیام لیلہ القدر وغیرہ بھی ہیں، فرائض میں نماز کو دیکھا جائے، اس میں بہت سہولتیں اور آسانیاں رکھیں کہ دن رات کے تمام اوقات ۲۴ر گھنٹوں میں صرف پانچ وقت نمازیں مقرر فرمائیں، وہ بھی ایسے اوقات میں جو کہ نشاط وانبساط کے ہیں، نیز ان میں کسی کاروبار میں کوئی خلل نہیں آتا، پھر سفر کے احکامِ نماز حضر کے احکام سے جدا اور سہولت لیے ہوئے رکھے، قوت وصحت کے احکام الگ اور ضعف ومرض کے الگ، حضر میں فرضوں کے ساتھ جو سنن ہیں، وہ سفر میں معاف یعنی ضروری نہیں رکھیں بلکہ سفر میں نماز فرض میں بھی قصر کہ جو حضر میں چار فرض تھے، سفر میں دو ہی رکھے، پھر سفر میں سواری پر ہو تو خطرہ واندیشۂ ضرر کے وقت سواری ہی پر پڑھ لینے کی اجازت دی، نماز کے لیے طہارت فی نفسہ ضروری مگر عذر ہو، مرض ہو، تیمم کی اجازت ہے، خود تیمم نہ کیا جا سکا تو دوسرے سے کرالیا جائے، اسی طرح وضو میں بھی عذر کے وقت اجازت ہے۔ بدن میں پھوڑے پھنسی ہوں تو دھونا ضروری نہیں، مسح کرلیا جائے، مسجد میں نماز نہ پڑھ سکے کہ جنگل میں ہے تو جنگل ہی میں پڑھ لینے کی اجازت ہے، مسجد میں آنا ضروری نہیں۔

روزہ کا معاملہ دیکھئے کہ ایک سال میں ایک ماہ کے فرض ہوئے، گیارہ مہینے خوب کھاتے پیتے رہنے کی اجازت رکھی، پھر ایک ماہ کے روزوں میں بھی سفر حضر کا فرق رکھا، سفر میں نہ رکھنے کی رخصت فرمادی لیکن بالکل معاف نہیں، ملتوی فرمادیے، اختتامِ سفر تک، پھر موسموں کی تبدیلی کے ساتھ مقرر فرمائے، یہ نہیں کہ ایک ہی موسم میں رکھنے ہوں کہ ہمیشہ اس موسم کے غذاؤں اور آزادیوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس میں موسموں کی تبدیلی میں سہولت مضمر فرمادی اور سحری کے

لیے تاخیر کرنا، افطار میں جلد کرنا اجازت ہی نہیں، باعث فضیلت قرار دے دیا اور مسنون فرما دیا گیا(۱)، یہ تمام سہولتوں کی صورتیں اور اسباب ہیں۔

زکوٰۃ میں یہ آسانیاں رکھیں، مثلاً مال قرضہ جات وضروریات سے بچا ہوا ہو، فی نفسہ سہولت ہے اور ادیانِ سابقہ کے مقابلہ بھی کہ مقدارِ زکوۃ پہلے نصف مال تھا، ہماری شریعت اسلامیہ میں چالیسواں حصہ رکھا۔

حج میں یہ آسانیاں کہ تمام عمر میں ایک مرتبہ فرض، پھر مالِ مقدار میں نصابِ زکوٰۃ ہی کافی نہیں بلکہ اس قدر کثیر مال ہونا شرط قرار دیا کہ اپنا پورا سفر خرچ اور نفقاتِ واجبہ اہل وعیال وغیرہ سب اخراجات کو برداشت کر سکے، پھر علاوہ اس کے سوائے ایمان کے روزہ، زکوٰۃ حج کا سب کو مکلف نہیں بنایا۔

اور ان کے علاوہ جتنے بھی احکامات ارشادات ہیں، وہ سب انسان کی بشاشت کے تقاضوں کے ساتھ ہیں کہ انسان کو انسان ہو کر سب معاملات، معاشرات، اخلاق درست رکھنے چاہیے۔ پانچ ہی اجزاء ہیں پورے دین کے، یہی پانچ اجزاء ہیں، یہ سب انسانیت کے تقاضے ہیں، پھر بھی ان کو نہ بجالانا انسانیت کے خلاف ہے اور اس میں تنگی اور دشواری سمجھنا دلیل ہے اس بات کی کہ اس کی انسانیت ہی بگڑ گئی، ورنہ اس میں کچھ دشواری اور تنگی نہیں۔

رہے مستحبات ونوافل! ان کا مطالبہ نہیں، ان کا معاملہ پورا انسان کے اختیار میں دے دیا، کرے بہتر ہے، نہ کرے، مؤاخذہ نہیں، اور ان کی مشروعیت

(۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ وفی حدیث آخر: عَنْ أَبِي عَطِيَّةَ، قَالَ: دَخَلْتُ أَنَا وَمَسْرُوقٌ، عَلَى عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، فَقَالَ لَهَا مَسْرُوقٌ: رَجُلَانِ مِنْ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ كِلَاهُمَا لَا يَأْلُو عَنِ الْخَيْرِ، أَحَدُهُمَا يُعَجِّلُ الْمَغْرِبَ وَالْإِفْطَارَ، وَالْآخَرُ يُؤَخِّرُ الْمَغْرِبَ وَالْإِفْطَارَ، فَقَالَتْ: مَنْ يُعَجِّلُ الْمَغْرِبَ وَالْإِفْطَارَ؟ قَالَ: عَبْدُ اللهِ، فَقَالَتْ: هَكَذَا كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصْنَعُ (صحيح مسلم، بَابُ فَضْلِ السُّحُورِ وَتَأْكِيدِ اسْتِحْبَابِهِ.)

میں فائدہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت ترقی کی خواہش ہوتی ہے، تنزلی کو کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی ایک جگہ ٹھہرا رہنا پسند کرتا ہے۔

پس امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ ایمان کے لیے اجزاء ہیں، اب خواہ تقویمیہ ہوں یا تحسینیہ وتنزیہیہ ۔جس طرح مکان کہ بعض چیزیں ستون وغیرہ کی حیثیت مدار کار کی ہوتی ہے، بعض کی تحسین اور خوب صورتی کی ہوتی ہے، مثلاً قلعی اور نقش نگار ورنگینی۔اوپر باب کا ربط بیان ہوا۔

دوسرے ترجمۃ الباب کی وضاحت

یہ ترجمۂ باب دعوی ہے، جیسا کہ کہ امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ ترجمۂ باب بہ منزلہ دعوی ہوتا ہے پھر فرماتے ہیں: یہ میرا دعوی بلا دلیل نہیں بلکہ اس کی دلیل حضور ﷺ کا فرمان والا شان ہے: ''أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللهِ الحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ''، پھر یہ چوں کہ ترجمہ ثانی ہے، لہٰذا یہ بھی بہ منزلہ دعوی ہے، اس کی دلیل میں حدیث مسند پیش فرمائی۔ گویا فرمارہے ہیں کہ یوں تو آیت شریفہ بھی موجود ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ﴾ [البقرة:۲۸۶] کہ اللہ تعالی نے وسعت کے مطابق ہی مکلف فرمایا، وسعت اور طاقت سے زیادہ چیز کا مکلف نہیں بنایا، نماز وغیرہ تمام احکام فی نفسہ مشکل اور دشوار نہیں، حتی کہ شیخ فانی کو روزے کا مکلف فرمانا کہ اگر روزہ رکھنے سے مر بھی گیا، جان چلی گئی تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں، چوں کہ جان اللہ تعالی کی دی ہوئی ہے، اسی کی راہ اور اسی کے حکم میں صرف کردی، بالکل بجا اور درست ہوا، تاہم اس کے لیے سہولت دی گئی کہ روزوں کے بدلہ فدیہ دے دے یعنی روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو دونوں وقت کھانا کھلا دیا کرے۔

تو باوجود اس یسر دین کے آیت سے ثابت ہونے کے گویا امام بخاریؒ فرما رہے ہیں: ہم حدیث اس کی دلیل میں پیش کرتے ہیں: آپ ﷺ فرماتے ہیں

کہ اللہ تعالی کو وہ دین پسند ہے اور محبوب ہے جس میں حنفیت یعنی اخلاص وخلوص ہو، یکسوئی ہو یعنی تمام غلط کاریوں اور بواطیل سے دل پھیر کر اور منہ موڑ کر اللہ واحد کے لیے دین اختیار کیا جائے، یہ حنیف ہے۔

لفظ حنیف کا پس منظر اور صابی کی حقیقت

لفظ حنفیت حق تعالی نے فرقۂ صابی کے مقابلے میں حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے متعلق فرمایا تھا، یہ لوگ ستاروں کے پرستار تھے، حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کو اسی قوم کی طرف مبعوث فرمایا تھا، ان لوگوں کا خیال تھا کہ اعمال سے ستارے مسخر ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالی کو (نعوذ باللہ) اعمال سے مسخر کیا جا سکتا ہے، حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: یہ غلط ہے، یہ ستارے خواہ سورج و چاند ہوں یا ان سے چھوٹے بڑے، یہ اس لائق نہیں کہ ان کی عبادت و پرستش کی جائے، یہ تو ایک وقت خود بھی اندھیرے اور بے نور ہو جاتے ہیں، پھر یہ اپنے پرستاروں کو کیا نور دے سکتے ہیں؟ کیا نفع پہنچا سکتے ہیں؟ مشاہدہ ہے، جو خود ہی ڈوب جاتا ہے، وہ کسی کو کیا تیرا سکتا ہے، پس تم کہاں ان کی عبادت کر رہے ہو؟ سخت دھوکہ اور غلط فہمی اور گمراہی میں ہو، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ،لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔ ﴿ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴿۷۹﴾ ﴾ [الأنعام]، میں ان سے بے زار ہو کر اللہ تعالی کی طرف یکسو ہو جاتا اور اس کے حضور میں سر جھکاتا ہوں۔

حق تعالی فرماتے ہیں: مجھے یہی پسند ہے کہ اخلاص وللّٰہیت ہو اسی میں قلب کا اخلاق رذیلہ سے پاک صاف کرنا اور ان سب سے یکسو اور برطرف ہو جانا بھی داخل ہو گیا مگر ہمارا یہ دین حنیف سہولت اور آسانی بھی رکھتا ہے اور حق تعالی کو پسند اور محبوب بھی ہے، پس اگر دین تو حنیفیت لیے ہوئے ہو مگر وہ صعوبت رکھتا ہو

مجھے، وہ پسند نہیں تو یہ فرمانِ نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام دعوی ''الدِّینُ یُسرٌ'' کی دلیل ہوا۔

حدیث الباب کی شرح

پھر یہ بھی دعوی ہے، اس کی دلیل حدیث مسند ہے تو متعدد دعوے اور دلائل ہو گئے، حضور ﷺ بڑے شد و مد کے ساتھ بلا احتمال وتردد قطعیت کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں کہ دین میں آسانی ہی آسانی اور سہولت ہی سہولت ہے، حتی کہ دین سراپا سہولت اور آسانی بن گیا، تو ملاحظہ فرمائیے میں نے تو ''الدِّینُ یُسرٌ'' کہا تھا، آں حضرت ﷺ اس سے بھی بڑھ کر فرماتے ہیں: إِنَّ الدِّینُ یُسرٌ۔

پھر اسی پر بس نہیں فرمایا بلکہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دین سختی اور دشواری برداشت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں، پس اگر کسی نے مشقت اور دشواری کا راستہ اختیار کیا تو دین کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ تمھارا ہی بگڑے گا۔

آج سنتے رہیے! ''یہ زور دار الفاظ اس لیے کہہ رہا ہوں؛ تاکہ آپ پوری توجہ سے سنیں اور احضارِ ذہن اور زیادتیٔ اعتناء کے لیے کہہ رہا ہوں، چوں کہ جلدی جلدی اذہان اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں''۔

گویا آں حضرت ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو خیال کریں گے کہ آپ ﷺ نے فرما تو دیا مگر راہِ حق میں محنت تو جتنی کی جائے، اتنی ہی زیادہ پسند اور محبوب ہے؛ اس لیے اگر کوئی ہمت کر کے محن وشاق اٹھائے، مضائقہ نہ ہوگا اور کم ہمتوں کے لیے آپ ﷺ نے ''إِنَّ الدِّینُ یُسرٌ'' فرمادیا؛ تاکہ وہ گھبرائیں نہیں، دین کو بھاری اور گراں اور کوئی مصیبت نہ سمجھیں، اس کے دفعیہ کے لیے آپ ﷺ نے غایتِ شفقت سے فرمادیا کہ نہیں، ہرگز نہیں، دین میں سختی اختیار کرو گے تو نقصان میں پڑ جاؤ گے، کوئی یہ خیال کرے کہ ہم دین کو

تھکا دیں گے کہ لا! اور احکام لا، اور احکام سے دین تو تھکے گا نہیں، خود لوگ ہی تھک جائیں گے، جیسے بنی اسرائیل تھک بیٹھے تھے: انھوں نے گاڑی چلانا چاہی تھی کہ کیسی گائے؟ کس رنگ کی؟ بیاہی، بے بیاہی، ہل میں چلی، ہو یا نہ چلی ہو وغیرہ بہت سے سوالات کرتے رہے، حتی کہ ایسی صورت بیان کردی گئی کہ وہ مشقت میں پڑ گئے اور تھک بیٹھے، اسی طرح قیامِ قدر تھوڑی دیر کے لیے فرمایا تھا، انھوں نے کہا: اجی ہم تو پوری رات کریں گے، پس حضور ﷺ نے یہ نظیر پیش فرمائی کہ اسی طرح تم بھی تھک جاؤ گے، یہ حدیث یہاں مذکور نہیں، دیگر کتب حدیث میں موجود ہے(۱)، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس تم میانہ روی اختیار کیے رہو۔ ٹھیک ٹھیک اعتدال پر مستقیم رہو۔

آگے فرماتے ہیں: ''وَقَارِبُوا'': گویا یوں فرماتے ہیں کہ میں شدت سے ہٹا کر اعتدال پر لے آیا مگر میں جانتا ہوں کہ یہ بہت مشکل ہے۔ ؎

صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم	یارب تو کریمی ورسولِ تو کریم

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی، اگر تو کسی قابل ہوتا

فرماتے ہیں کہ پورا اعتدال و استقامت مشکل ہو تو قریب قریب رہو۔ اب سوال یہ ہو تا سکتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عدمِ اعتدال سے گو قریب قریب ہوں لیکن ثواب اور بشارت کے مستحق نہ ہوں یا کمی کے ساتھ مستحق ہوں، گویا اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ نہیں! میں ایسی تعلیم نہیں دیتا، پس اس صورت میں بھی

(۱) غالباً حضرت کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے: إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالتَّشْدِيدِ، شَدَّدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ فَشُدِّدَ عَلَيْهِمْ، هَؤُلَاءِ بَقَايَاهُمْ، يَعْنِي فِي الدِّيَارَاتِ وَالصَّوَامِعِ، اعْبُدُوا اللهَ، وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَآتُوا الزَّكَاةَ، وَحُجُّوا الْبَيْتَ، وَاعْتَمِرُوا، وَاسْتَقِيمُوا يُسْتَقَمْ بِكُمْ. (الزهد والرقائق لابن المبارك: ۱/۳۶۵، عَنْ أَبِي قِلَابَةَ رضی الله تعالی عنه، بَابُ فَضْلِ ذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، رقم الحديث: ۱۰۳۱)

بشارت پاتے رہو، قریب قریب والوں کو بھی بشارت ہے کہ قریب فعل بھی بہ حکم فعل ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر چہ فعل معتدل بعینہ پر فائز نہ ہوئے مگر قریب تو پہنچ گئے، یہ بھی حصولِ مقصد اور کامیابی ہے، اس لیے محروم نہیں، باریاب ہوا، البتہ کوشش ومحنت ومجاہدہ صحیح اعتدال پر پہنچنے کا جاری رہے، ورنہ عدم ترقی کی صورت میں تنزل ہوگا پس قریب قریب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ اور اندیشہ ہے، اس لیے محصول کی حفاظت اور غیر حاصل کی امید اور ترقی اسی پر منحصر ہے۔

اب صحابہ رضی اللہ عنہم میں گویا طلب اور تڑپ پیدا فرمادی اور حالی سوال پیدا ہوگیا کہ ان انمول ارشادات سے ہم کو دو باتیں تو معلوم ہوگئیں: ایک یہ کہ قریب قریب ہوجانا ایک مستقل عمل بھی ہے اور اعتدال کے حصول کا طریق بھی ہے، اب اے شیخ کامل! اے طبیب روحانی! اس کی تسہیل اور دفع عسر کا علاج اور مداوا بھی عنایت فرمادیجئے! گویا اسی کے جواب میں ارشاد ہورہا ہے کہ ہاں، ہاں! اس کے لیے فراغت اور راحت اور بشارت کے اوقات بتلاتا ہوں ان اوقات کی قدر کرلینا اس سے "قَارِبُوا" اور پھر "سَدِّدُوا" کے مصداق ہوجاؤ گے، اگر ان ہدایات پر عامل ہوجاؤ گے۔

اب گویا صحابہ رضی اللہ عنہم یوں عرض گزار ہورہے ہیں کہ یا رسول اللہ! وہ کون کون اوقات ہیں؟ فرماتے ہیں: وہ لیل ونہار کے ابتدائی اوقات ہیں اور یہ یوں ہی نہیں بتلارہا، ان میں کچھ حقیقت حاصل کرلینا کہ وہ اوقات نشاط اور بشاشت وانبساط کے ہیں، وہ خود اس کے حامل اور دواعی ومقتضیات ہیں، یہ اوقات حلوائے بے دودھ ہیں، یہ لکھنؤ کی بوڑھیا والا زردا نہیں، جو زردا لے کر سڑک پر بیٹھ گئی تھی، ندا لگانا شروع کیا کہ ہے کوئی اللہ کا سخی جو اس حلوے کو میرے حلق سے نیچے اتروادے۔ کسی نے کہا کہ یہ کون سی مشکل بات ہے؟ زردا منھ میں رکھا اور اترا، بوڑھیا نے سرد آہ کھینچی اور کہا: افسوس! اب لکھنؤ میں ایسے بھی ہونے لگے کہ زردا بِلا بالائی کے اترانا چاہتے ہیں، حالاں کہ زردے کے لیے بالائی ضروری ہے، یہی حال ہمارے

دین مصطفوی کا ہے کہ تمام احکام مثل زردے مع بالائی کے ہیں، چناں چہ حضور ﷺ گویا فرمارہے ہیں کہ لو بالائی بھی لے لو۔

وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ: اس پر جم کر عمل کرلیا تو "قَارِبُوا" اور پھر "سَدِّدُوا" کے مصداق ہوجاؤ گے اور یہی مطلوب اور منزلِ مقصود ہے، اور یہ شب وروز کے ابتدائی اور انتہائی حصص اور اوقات ہیں، ان میں ذکر کرکے اللہ تعالیٰ سے قَارِبُوا پر مدد چاہو اور اس کام پر گامزن ہونے میں مدد چاہو کہ سو کر سکون ہوتا ہے، سہانا وقت ہوتا ہے، تعب ہوگیا تھا تو اب تکان ختم ہوگیا: لہٰذا اٹھ کر دو فرض پڑھ لو، ذکر اللہ و یادِ خدا کرلو۔

پانچ نمازوں کے اوقات کے فراغت اور نشاط کے ہونے کی دل نشیں تقریر

یہی وجہ ہے کہ ہر نماز کے ساتھ حدیث میں تسبیح تعلیم فرمادی (۱)، دو رکعت پڑھ لی تو تسبیح بھی پڑھ لو، اس کے منافع عمل کرنے سے حاصل ہوں گے، کاروبار سے فارغ ہو، فرض کے بعد سنتیں نہیں ہیں؛ لہٰذا اس ذات عالی صفات کو مختلف اسماء سے پکارو، کر کے دیکھو، دل میں نور پیدا ہوگا، اس کے بعد دوپہر کا وقت آیا، کھانا کھا کر قیلولہ کرلیا، اب نشاط حاصل ہوگیا، اب مہربانی فرما کر چار رکعت ادا کرلو

(۱) اس مضمون کی متعدد احادیث کتب حدیث میں وارد ہیں، مثلاً: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی الله تعالى عنه، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَنْ سَبَّحَ اللهَ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَحَمِدَ اللهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَكَبَّرَ اللهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، فَتِلْكَ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ: تَمَامَ الْمِائَةِ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ غُفِرَتْ خَطَايَاهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ۔ (صحيح مسلم، كِتَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلَاةِ، بَابُ اسْتِحْبَابِ الذِّكْرِ بَعْدَ الصَّلَاةِ وَبَيَانِ صِفَتِهِ، رقم الحديث: ۵۹۷)

پھر کچھ دیر بعد عصر کا وقت آ گیا، وہ بھی تقریباً فراغت کا وقت ہوتا ہے، اب پھر چار رکعت پڑھ لو، اب انتہائی وقت ہے، کاشت کار، دوکان دار سب اپنے اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر آرام کرنے آ گئے، اب حکم ہے کہ ہمارے دربار میں سلام کرنے آجاؤ، اب تمھیں بھوک لگی ہوگی اور کچھ دوسرے بشری حوائج ہیں، لو تین ہی تو ہے، انھیں پڑھ لو، اس کے بعد، لو اب کام تو کچھ نہیں، سونا ہی ہے، چار رکعت عشاء کی پڑھ لو، یہ "شَيْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ" ہو گیا۔ تو نشاط وراحت وفراغت کے اوقات متعین فرمائے (۱)۔

جب میرا یہ فرمان یاد رکھو گے اور اس پر عمل کرتے رہو گے جو کہ ایک مختصر مجاہدہ اور ہلکی سی ریاضت ہے تو تم قَارِبُوا کے مصداق اور منزل سے قریب لگ جاؤ گے، جیسے جلال آباد کے اسٹیشن سے جلال آباد قریب ہے، اس کے بعد رات کے وقت تہجد ہے پڑھ لو تو سونے پر سہاگہ کے مثل ہوگا، نور علی نور، پس کیا اچھا ہو کہ پڑھ لیا کرو، اس سے ایمان میں رونق وصفائی اور کھکھلاہٹ خوب ہو گی۔

مذکورہ جملے سے نوافل مراد ہونے پر لطیف استدلال

اب یہاں شراح فرماتے ہیں، جو ان کی خانہ زاد بات نہیں بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین سے چلی آرہی ہے، ہم کو ہمارے اساتذہ کے واسطہ سے پہنچی ہے، وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں ان وقات سے فرض نمازیں مراد نہیں، وہ تو مقرر اور متعین بے کم وکاست ہیں، ان میں کمی وزیادتی نہیں ہو سکتی: لہٰذا مستحبات ونوافل مراد ہیں، یہ کہاں سے نکل رہا ہے؟ یہیں سے نکل رہا ہے میرے ذوق کے مطابق کہ میری

---

(۱) كأنه عليه السلام خاطب مسافراً يقطع طريقه إلى مقصده فنبهه على أوقات نشاطه التي ترك فيها عمله لأن هذه الأوقات أفضل أوقات المسافر بل على الحقيقة الدنيا دار نقلة وطريق إلى الآخرة فنبه أمته أن يغتنموا أوقات فرصتهم وفراغهم. (الكواكب الدراري: ۱/۱۶۲)

عادت ہی ہے، باہر جانے کی ضرورت نہیں سمجھا کرتا، الفاظِ حدیث وسیاقِ حدیث میں غور کرنے سے اس کی مراد سمجھنے اور جاننے کی سعی وکوشش کیا کرتا ہوں، یہ میرا بغیر سنا ہے، ممکن ہے کہیں شراح نے لکھا ہو۔ یہ "لَنْ يُشَادَّ" سے نکل رہا ہے (۱)، چوں کہ فرائض میں کمی بیشی کا اختیار نہیں، پس فرائض میں شدت اختیار کرنا بھی متصور نہیں ہوسکتا، ورنہ "لَا يُكَلِّفُ اللهُ" اور "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" کیوں ہوتا؟ یہ شدت تو صحابہؓ اور تابعینؒ کے حالاتِ زندگی اور کثرتِ عبادات پر نظر کر کے خیال اور شوق کثرت وزیادتی کا ہوسکتا ہے، جیسے حضراتِ صحابہؓ نے آپ ﷺ کی زندگی کے معمولات دیکھ کر یہ ہی کہا تھا کہ آپ کو تو ضرورت نہیں زیادہ عمل کی، کہاں آپ، کہاں ہم!، ہمیں عمل کی زیادہ ضرورت ہے، اس خیال سے اپنے معمولاتِ نافلہ میں زیادتی وشدت کا ارادہ فرمایا تو آپ نے منع فرمایا (۲)، معلوم ہوا کہ فرائض میں شدت نہیں ہوا کرتی، برخلاف نوافل ومستحبات کے۔

اسی طرح روزہ کی نیت نصف النہار سے قبل تک درست ہے، بہ شرطے کہ طلوعِ فجر سے اس وقت تک کچھ نہ کھایا ہو تو ایسی صورت میں اگر نفل روزہ رکھنا چاہیں

---

(۱) " ولن يشاد الدين أحد "، أي :ولن يقاومه أحد بشدة، والمعنى أن من شدد على نفسه وتعمق في أمر الدين بما لم يجب عليه.(مرقاة المفاتيح:۹۳۴/۳،باب القصد في العمل، الفصل الأول) وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أحد الا غلبه قَالَ بن التِّينِ فِي هَذَا الْحَدِيثِ عَلَمٌ مِنْ أَعْلَامِ النُّبُوَّةِ فَقَدْ رَأَيْنَا وَرَأَى النَّاسُ قَبْلَنَا أَنَّ كُلَّ مُتَنَطِّعٍ فِي الدِّينِ يَنْقَطِعُ وَلَيْسَ الْمُرَادُ مِنْهُ طَلَبَ الْأَكْمَلِ فِي الْعِبَادَةِ فَإِنَّهُ مِنَ الْأُمُورِ الْمَحْمُودَةِ بَلْ مَنَعَ مِنَ الْإِفْرَاطِ الْمُؤَدِّي إِلَى الْمَلَالِ وَالْمُبَالَغَةِ فِي التَّطَوُّعِ الْمُفْضِي إِلَى تَرْكِ الْأَفْضَلِ أَوْ إِخْرَاجِ الْفَرْضِ عَنْ وَقْتِهِ.(حاشية السيوطي على سنن النسائي:۱۲۲/۸، كتاب الْإِيمَان وشرائعه، رقم الحديث:۵۰۳۴)

(۲)عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ:جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا أُخْبِرُوا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوهَا، فَقَالُوا:وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ الحديث(صحيح البخارى، كِتَابُ النِّكَاحِ،بَابُ التَّرْغِيبِ فِي النِّكَاحِ،رقم الحديث:۵۰۶۳)

تو رکھ سکتے ہیں۔تو "لَنْ يُشَادَّ" کے ذریعہ ممانعت کا محل نوافل ہی بن سکتے ہیں، جب یہ مراد ہے تو اعتدال کیسے حاصل ہو؟ فرمایا: "قَارِبُوا" قریب قریب ہو جاؤ، تصوف وسلوک اس میں بیان ہو گیا یا نہیں؟ جی ہاں! کیوں کہ جو فرائض کے علاوہ طرق وتدابیر ہیں، وہ مقصوداً نہیں بلکہ معین ہونے کی حیثیت سے ہیں تو قریب قریب میں وہ داخل ہیں۔ الحاصل ثابت ہو گیا کہ یہاں حدیث شریف میں نوافل کا درجہ بیان فرمادیا جو کہ مقصودیت کا نہیں، اعانت کا ہے اور قریب کرنے کا ہے۔

پس بعضوں کا اسلام میں شدت اور سختی اور مشکل ودشواری سمجھنا صحیح نہیں، بات یہ ہے کہ اسلام کے احکام دو قسم پر ہیں :ایک وہ جن میں اعذار کا لحاظ کیا گیا ہے۔ دوسرے وہ جن میں اعذار کا لحاظ نہیں، اول کو رخصت، دوسرے کو عزیمت کہتے ہیں، مثال کے طور پر سمجھئے کہ نماز ایک سفر کی ہے ایک حضر کی ہے،حضر میں مثلا عبد المجید صاحب اگر مسجد میں نہ جائیں، حجرہ ہی میں پڑھ لیں تو بزدلی اور ضعف ایمان کی بات ہے، اس کی رخصت نہیں، برا نہ ماننا یہ تو ایک مثال ہے، خاص شخص مراد نہیں ہوتا(دوست، احباب کی بے تکلفی کی وجہ سے کہہ دیتا ہوں، یہ کہہ ہی دیا، ورنہ ان کی شان اس سے اونچی ہے کہ بزرگ ہیں، بزرگ کے بندہ ہیں، مجید کے معنی بزرگ کے ہیں تو معنی ہوئے بزرگ کا بندہ اور بزرگ کے بندے بھی بزرگ ہوتے ہیں)، اور ایک یہ کہ بیماری ہے، کمزوری ہے، لکڑی کے سہارے مسجد تشریف لے جاسکتے ہیں تو ایسی حالت میں مسجد تشریف لے جانا عزیمت ہے اور نہ جائیں، گھر ہی میں پڑھ لیں، یہ رخصت ہے کہ شریعت نے اتنا مکلف نہیں بنایا کہ ایسی حالت میں بھی مسجد ہی جانا ضروری ہو، نہ جائیں گے تو گنہگار ہوں۔

"لَا صَلَاةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ" (۱) کو اہل ظاہر نے نفیٔ

---

(۱) المستدرك على الصحيحين: ۱/۳۷۳،عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضى الله تعالى عنه،أما حديث عبد الرحمن بن مهدي،رقم الحديث:۸۹۸.

صحت کے لیے لیا ہے یعنی نفیٔ صحت پر اس کو محمول کیا ہے، ہمارے حضرات نے نفیٔ کمال کے لیے لیا ہے (۱)، سفر میں جا رہے ہیں، ہوٹل میں پہنچے، کہا: لاؤ! ایک پلیٹ قورمے کی، ایک پلاؤ کی وغیر وغیرہ، عمدہ عمدہ کھانے کھلا رہے ہیں، پھر بھی کرم فرمایا اور سفر میں نماز چار فرض کے بہ جائے دو ہی رکعت فرض رکھیں اور نوافل وسنن کی رخصت فرمادی، تاہم نوافل وسنن پڑھ لیں، اس خیال سے کہ فرصت تو ہے ہی، کچھ کام تو کرنا نہیں تو یہ عزیمت ہے لیکن اس خیال سے اتمام فرائض کرے تو یہ جائز نہیں، چوں کہ یہاں دو ہی فرض عزیمت ہے، یہ چند مثالیں تھیں۔

اب حدود قائم رکھنا ضروری ہے کہ محض عزیمتوں ہی کی تلاش میں لگا رہنا اور فقط انھیں ہی اختیار کرنا بد دینی ہے اور عزیمت ہی عزیمت پر جمے رہنا تجاوز عن الشرع ہے، لہٰذا اپنی اپنی جگہ دونوں قسموں پر عمل کرنا اسی میں عبدیت کا اظہار ہے ورنہ محض عزیمت لینا پہلوانی دکھانا ہے اور خلاف عبدیت ہے۔

اس لیے تو امام مالکؒ سے موطا لکھنے کے وقت ہارون رشید نے کہا تھا کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محض رخصتوں ہی کو جمع نہ کر دینا اور کہیں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محض عزیمتوں ہی کو جمع نہ کر دینا یعنی صرف ایک قسم کی احادیث جمع کرنے پر اکتفاء نہ کرنا بلکہ دونوں قسم کی چیزیں ہونا چاہیے (۲)۔

---

(۱) لَا صَلَاةَ إِلَّا بِطَهُورٍ وَعَلَى نَفْيِ كَمَالِهِ كَقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ لَا صَلَاةَ لِجَارِ المسجد إلا في المسجد وههنا مَحْمُولَةٌ عَلَى نَفْيِ الْكَمَالِ خِلَافًا لِأَهْلِ الظَّاهِرِ (تحفة الأحوذي: ۹۳/۱، باب فِي التَّسْمِيَةِ عِنْدَ الْوُضُوءِ)

(۲) میری حقیر معلومات کے مطابق یہ عباسی خلیفۃ ابوجعفر المنصور کا مقولہ ہے، علامہ ابن خلدونؒ نے اس کو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے: وقال غيره: حج أبو جعفر المنصور ولقيه مالك بالمدينة، فأكرمه وفاوضه. وكان فيما فاوضه: يا أبا عبد الله لم يبق على وجه الأرض أعلم مني ومنك، وقد شغلتني الخلافة، فضع أنت للناس كتاباً ينتفعون به، تجنب فيه رخص ابن عباس وشدائد ابن عمر ووطئه للناس توطئة. قال مالك: فلقد علمني التأليف. (۲۳۷/۱)

تو عبدیت یہی ہے کہ جب عزیمت کا حکم ہو، اس کو اختیار کریں اور جب رخصتوں کا حکم ہو ان کو لینا ان پر بھی عمل کرنا، ورنہ محض عزیمتوں پر قناعت کر لینا شدت و سختی میں مبتلا ہو کر درماندہ اور کمزور ہو کر کہ آخر انسان ہے، کہیں ترک فرائض کی نوبت آ جائے، بہ جائے دس سال کے ۲/سال ہی میں کمزور ہو کر عاجز اور ناامید ہو جائے گا اور یہ فساد و خرابی کی بات ہے، اسی طرح شدہ شدہ اہمالِ اعمال کی نوبت آ کر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ حدیث نوافل و اوراد و معمولات کے متعلق ہے؛ اسی لیے آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو التزامات تکثیر مستحبات سے منع فرما دیا تھا، **حینما أرادوھا بعد علمھم** معمولات النبی الکریم ﷺ (۱)۔

تو دین میں بہرحال آسانی ہی ہے، جو کچھ دشواری کسی کو نظر آتی ہے، وہ خارجی ہے، انہماک و اشتغال مفرط فی الدنیا کے سبب سے ہے، ورنہ دین کی ہر بات میں حتی کہ جہاد میں بھی آسانی سہولت ہی ہے، بہ شرطے کہ اس کے طرق دوامِ اعمال و ایمان کے ترک نہ کیے ہوں تو ذرہ برابر دشواری نہیں بلکہ خوش گواری و مزید داری ہی ہے۔

تو حدیث کو باب سے اور باب کو کتاب الایمان سے مناسبت ظاہر ہے کہ دین داری اور زیادتیٔ ایمان و تکمیل انسان میں رخصت و عزیمت دونوں کو دخل ہے، دونوں ہی سے ترقی ہوتی ہے، ایک عزیمت ہی کے ساتھ ترقی مخصوص نہیں؛ لہٰذا عزائم و رخص دونوں پر چلتے رہنا ہی کمالِ عبدیت ہے۔

اب ایک بات رہ گئی کہ اس ترتیب سے استقامت آسان ہے، تقاضات اور موانع بشریہ کے مقابلہ میں ہمت کے ساتھ، یقین و صبر سے کام لیتے رہیں، ان

(۱) اس سے اسی واقعے کی طرف اشارہ مقصود ہے جو کچھ سطور پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حاشیے میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

موانعات سے مغلوب نہ ہوجائیں، ان میں الجھ کر نہ رہ جائیں، اس طرح اگر بفرضِ محال حصولِ استقامت نہ بھی ہوتو بھی کامیابی ہی ہے۔

حضور ﷺ کی جیسی استقامت تو ممکن نہیں، جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ جب کسی نے پوچھا کہ آپ کی عمر ۸۰، ۹۰ رکی نہیں ۶۰ رسال کی ہے، پھر بال اس قدر جلد کیوں سفید ہوگئے؟ جواب ارشاد فرمایا: "شَيَّبَتْنِي هُودٌ، وَالوَاقِعَةُ، وَالمُرْسَلَاتُ، وَعَمَّ يَتَسَاءَلُونَ، وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ" (۱)۔ اور فرمایا: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ﴾ [ہود ۱۱۲:] (۲) کہ اس نے تو میری کمر ہی توڑ دی، ہر وقت فکر رہتا ہے کہ حکم کی مطابقت ہوئی یا نہیں۔

اور عزیزانِ من! نماز بھی پنج گانہ تعلیم ودعا ہے تحصیل وتسہیل صراط مستقیم کی، حق تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کے بندو! خود بھی تو کچھ اوقات ذکر فکر کے محفوظ کرلو، اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی ہوجائے گی اور سہولت سے راہِ مستقیم میں دین امم پر استقامت واعتدال نصیب ہوجائے گا، حدیث آپ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

بَابٌ: الصَّلاَةُ مِنَ الإِيمَانِ وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى: {وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ} [البقرة:۱۴۳] يَعْنِي صَلاَتَكُمْ عِنْدَ البَيْتِ

۳۹: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ، عَنِ البَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ المَدِينَةَ نَزَلَ

(۱) سنن الترمذی، عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ تعالی عنہما، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ الوَاقِعَةِ، رقم الحديث: ۳۲۹۷.

(۲) عَنْ أَبِي عَلِيٍّ السَّرِيِّ، يَقُولُ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ رُوِيَ عَنْكَ أَنَّكَ قُلْتَ: "شَيَّبَتْنِي هُودٌ" قَالَ: "نَعَمْ" فَقُلْتُ: مَا الَّذِي شَيَّبَكَ مِنْهُ قَصَصُ الْأَنْبِيَاءِ وَهَلَاكُ الْأُمَمِ؟ قَالَ: "لَا، وَلَكِنْ قَوْلُهُ {فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ} [هود: ۱۱۲]" (شعب الإيمان، ذِكْرُ سُورَةِ هُودٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ، رقم الحديث: ۲۲۱۵.)

عَلَى أَجْدَادِهِ، أَوْ قَالَ أَخْوَالِهِ مِنَ الأَنْصَارِ، وَأَنَّهُ صَلَّى قِبَلَ بَيْتِ المَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا، أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا، وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبْلَتُهُ قِبَلَ البَيْتِ، وَأَنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلاَةٍ صَلَّاهَا صَلاَةَ العَصْرِ، وَصَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ، فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُونَ، فَقَالَ: أَشْهَدُ بِاللَّهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قِبَلَ مَكَّةَ، فَدَارُوا كَمَا هُمْ قِبَلَ البَيْتِ، وَكَانَتِ اليَهُودُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّي قِبَلَ بَيْتِ المَقْدِسِ، وَأَهْلُ الكِتَابِ، فَلَمَّا وَلَّى وَجْهَهُ قِبَلَ البَيْتِ، أَنْكَرُوا ذَلِكَ. قَالَ زُهَيْرٌ: حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ، عَنِ البَرَاءِ فِي حَدِيثِهِ هَذَا: أَنَّهُ مَاتَ عَلَى القِبْلَةِ قَبْلَ أَنْ تُحَوَّلَ رِجَالٌ وَقُتِلُوا، فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُولُ فِيهِمْ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: {وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ} [البقرة: ۱۴۳]

بابِ سابق کے ساتھ بابِ ہٰذا کا ربط ومناسبت

قرآت وترجمہ کے بعد فرمایا: یہ باب ماقبل باب سے کیا ربط رکھتا ہے؟ ربط ظاہر اور لطیف ہے کہ پہلا باب ''الدِّينُ يُسْرٌ'' تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ دین میں اپنی طرف سے تشدد نہ کرنا چاہیے، فرائض وسنن وقتیہ اپنے اپنے اوقات میں متعین ہیں، ان کی رکعات میں زیادتی نہ کرنا چاہیے بلکہ بیانِ حدیث سے واضح ہو گیا تھا کہ نوافل اور مستحبات مراد ہیں، ان کی تکثیر جو دائم نہ رکھی جاسکے یا جوش میں اتنا کام شروع کردیا جائے جو تھکادے اور کمزور بنادے، بیمار بنادے اس کی ممانعت تھی، اسی سے ثابت ہو گیا تھا کہ میانہ روی اور اعتدال اختیار کرے تو اعتدالِ نوافل ومستحبات کا ایمان میں دخل ہونا ظاہر وثابت ہو گیا تھا کہ کمالِ ایمانی کے لیے یہ محافظ ہے، یاس وترک عمل وفساد دین سے محافظ ہے، نیز بایں طور کہ جو شخص نوافل

وسنن کا خوگر نہ ہوگا، اس کا ایمان ایسے شخص سے کم ہوگا کہ نوافل وسنن کا اہتمام اوران کی ادائیگی کا میانہ روی کے ساتھ دوام کرے گا۔

حضور ﷺ کے دوسرے ارشادات تشویقی ہوتے ہیں، آپ ﷺ جانتے تھے کہ امتی بعض ان ریاضات ومجاہدات ونوافل کو بھی اختیار کریں گے، اس میں احتمال تھا کہ اپنی جانوں پر تشدد کرنے لگیں گے، اس لیے اس کی روک تھام فرمادی، چوں کہ رخصتوں کی تلاش بد دینی ہے اور عزائم پر جمے رہنا تجاوز عن الحد ہے کہ باوجود تکان یا بیماری کے نوافل کھڑے ہوکر پڑھے جائیں اور سفر میں باوجود حصولِ رخص کے ان کو اختیار نہ کیا جائے، گاڑی چھوٹ جانے کی پروانہ کرے اور نماز گاڑی سے اتر کر ہی پڑھے، جیسا کہ احقر کا مشاہدہ ہے کہ پاکستان میں گاڑی سے اتر کر ایک شخص نماز پڑھنے لگے اور گاڑی چھوٹ گئی، تب بھی نماز ختم نہ کی، اس کی دو وجہ ہوسکتی ہیں یا تو علم نہیں ہوتا، یا غلط علم ہوتا ہے، پس اچھا اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ نہ تو عزائم ہی کا عازم ہو، نہ رخص ہی کو مقصود بنائے، گذشتہ باب کا یہ حاصل ہے، اس میں دین کی آسانی کو بیان کردیا۔

اب یہاں نماز کے واسطے سے (جو کہ ممیز بین الکفر والایمان ہے) تیسیر کو بیان فرمارہے ہیں کہ جو چیز ایمان کا اعلی اور افضل اور جامع الاعمال والفضائل عبادت اور عمل ہے اور جو ایمان کے لیے حاد اور فاصل بین الکفر والایمان ہے، اس میں بھی آسانی ہے۔ نماز کے فاصل اور فارق ہونے کی وجہ سے عہد نبوی میں تارکِ نماز کو کافر سمجھا جاتا تھا، مؤمن نماز نہیں چھوڑتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جو شخص جماعت سے رہ جاتا تھا، اس کی تعزیت کی جاتی تھی کہ مرگیا ہوگا، ورنہ زندہ ہوتا تو نماز میں ہوتا، جب باوجود نماز کی ایسی اہمیت کے اس میں یسر ثابت کردیں تو ضرور دین میں یسر کا ہونا آسانی کے ساتھ بلاتردد سمجھ میں آجائے گا۔

ردعلی المرجیہ

مقصوداس باب سے بھی مرجیہ پرردکرنا ہے مثل سابق ابواب کے(۱)،وہ اس طرح ہے کہ نماز ایک عمل ہے جس کوایمان میں خاص الخاص دخل ہے اور ایمان کی چیز ہے، اسی وجہ سے من الایمان کہتے ہیں اور گویا یوں فرماتے ہیں کہ یہ تو ایک رعایت سے کہہ دیا، ورنہ اگر نماز کو عین ایمان بھی کہہ دیا جاتا تو بجا ہوتا، یہ میرے الفاظ ہیں۔اور یہ بلادلیل نہیں بلکہ حق سبحانہ وتعالی کا فرمان والاشان ہے:﴿وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ﴾[البقرة:۱۴۳]،جیسا کہ مفسرین نے یہاں ایمان سے صلوۃ کا مراد ہونا بتلایا ہے(۲) اور وہ بھی اپنی طرف سے نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ تفسیر حضوراقدس ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔

توحق تعالی نے صلوٰۃ پرایمان کا اطلاق فرمایا ہے۔معلوم ہوا کہ صلوٰۃ ایمان ہے،اس سے نماز کی علومرتبت اور رفعت شان کس درجہ ظاہر ہے۔توایمان وعمل دونوں دوش بہ دوش ہیں، گویا ایک جان دو قالب ہیں، دونوں اس قدر گہرے دوست ہیں، ایسا شدید ربط وتعلق ہے ایک کو دوسرے کے ساتھ، پھراے مرجیہ! تمھارا یہ کہنا کہ اعمال کوایمان میں دخل نہیں، اعمال ترک کرنے سے ایمان میں کمزوری نہیں آتی، یہ کیوں کردرست ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں بالکل باطل ہے۔

---

(۱) وَقَالَ مَالِكٌ:إِنّي لَأَذْكُرُ بِهَذِهِ الْآيَةِ قَوْلَ الْمُرْجِئَةِ:إِنَّ الصَّلَاةَ لَيْسَتْ مِنَ الْإِيمَانِ.(تفسير القرطبى:۱۵۸/۲،فى تفسير قوله تعالى:وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ الآية.)

(۲) وَرَوَى ابْنُ وَهْبٍ وَابْنُ الْقَاسِمِ وَابْنُ عَبْدِ الْحَكَمِ وَأَشْهَبُ عَنْ مَالِكٍ" وما كانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمانَكُمْ"قَالَ:صَلَاتُكُمْ.(تفسير القرطبى:۱۵۸/۲،فى تفسير قوله تعالى : وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ الآية.)وَأخرج ابْن جرير عَن ابْن عَبَّاس فِي قَوْله {وَمَا كَانَ الله لِيُضيع إِيمَانكُمْ} يَقُول:صَلَاتكُمْ اليت صليتم من قبل أَن تكون الْقبْلَة وَكَانَ الْمُؤمنُونَ قد أشفقوا على من صلى مِنْهُم أَن لايقبل صَلَاتهم.(الدر المنثور:۱/ ۳۵۳،فى تفسير الآية المذكورة)

آیتِ مذکورہ کا شانِ نزول

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ مکہ معظّمہ تشریف فرما تھے، بیت المقدس قبلہ تھا، اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، پھر مدینہ میں ہجرت کے بعد سولہ، سترہ ماہ تک بھی قبلہ رہا، اس کے بعد تحویل قبلہ ہوتا ہے اور اس کا حکم نماز ہی کے اندر آتا ہے کہ بیت اللہ شریف قبلہ بنا دیا گیا، یہ چار رکعت والی نماز تھی (۱)، دو رکعت کے بعد جب یہ حکم نازل ہوا، نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے اور خانۂ کعبہ کی طرف منہ کرلیا۔

تو اس وقت صحابہؓ کو اشکال ہو گیا کہ بیت اللہ کا قبلہ ہونا معلوم ہو گیا تو مکی زندگی کی نمازیں صحیح ہوگئیں اور قبول ہوگئیں یا نہیں، اور قبول ہوئیں تو بیت اللہ کی طرف پڑھنے کی جو فضیلت ہے، اسی فضیلت کے ساتھ یا کمی بیشی سے؟ اور خیر جو زندہ ہیں، وہ تو تدارک بھی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے جو مسلمان بھائی مر چکے ہیں، ان کی اس کمی کا تدارک ممکن نہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط﴾ کہ پہلے والوں کی نماز ضائع نہیں ہوئی اور جو درجہ نماز کا بیت اللہ کی طرف منہ کر کے پڑھنے کا ہے، وہی درجہ بیت المقدس کی طرف پڑھنے کا ہے۔

(۱) بخاری شریف کی اس حدیث میں صراحت ہے کہ یہ عصر کی نماز تھی، بعض روایتوں میں فجر اور بعض میں ظہر کا ذکر آیا ہے: فَفِي هَذِهِ الرِّوَايَةِ صَلَاةُ الْعَصْرِ، وَفِي رِوَايَةِ مَالِكٍ صَلَاةُ الصُّبْحِ. وَقِيلَ: نَزَلَ ذَلِكَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فِي مَسْجِدِ بَنِي سَلِمَةَ وَهُوَ فِي صَلَاةِ الظُّهْرِ بَعْدَ رَكْعَتَيْنِ مِنْهَا فَتَحَوَّلَ فِي الصلاة، فسمي ذلك الْمَسْجِدُ مَسْجِدُ الْقِبْلَتَيْنِ إلخ۔ (تفسير القرطبي: ۱۴۹/۲، فی تفسير قوله تعالى: سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ الآية. [سورة البقرة: آية ۱۴۲])

ردعلی المرجیہ وربط بالباب السابق

وجہ یہ ہے کہ صلوٰۃ کا سوال تھا، جواب میں ایمان فرمایا تو معلوم ہوا کہ ایمان سے مراد نماز ہے کہ سوال کے مطابق جواب ہوتا ہے، لفظاً موافق نہ ہوتو جواب کا معنی مطابق ہونا تو ضروری ہے، پس صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم کو جواب دینے کا حاصل یہ ہوا کہ ہمارے یہاں یسر ہے عسر نہیں، تو ایک تو قبولیت صلواتِ سابقہ بقبلۃ بیت المقدس وتسویۃ فضیلۃ بین صلوات تلک القبلۃ وہذہ القبلۃ ۔ دوسرے اس طریقہ سے بھی یسر ثابت ہوا کہ نماز ہی میں جب تحویل قبلہ ہوا تو درمیانِ نماز میں ہوا تو نصف ادا کردہ کے اعادہ کی ضرورت نہیں، وہ بھی درست، یہ بھی درست، چوں کہ صلوٰۃِ مودات پر انکار وحی میں نہیں ہوا تو شرع کی سہولت ملاحظہ ہو، باوجود اختلافِ قبلہ ایک درجہ پر اتنی اہم عبادت کی چیز میں بھی جب یسر ہوا تو اسی سے پورے دین میں یسر کا ہونا ظاہر ہوگیا، تو مرجیہ پر رد اور ماقبل باب سے ربط، یہ دونوں بیان ہوچکے، مقصد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ختم۔

اب استاذ صاحب فرمادیتے کہ آگے چلو مگر نہیں، ابھی شراح رحمہم اللہ تعالی کے مقاصد باقی ہیں، نہ معلوم کہاں کہاں سے اور کن کن حضرات سے سن کر بیان فرماتے ہیں۔

مباحثِ تسعہ

عِنْدَ الْبَيْتِ: اس جگہ الف لام پر بحث ہے کہ بیت اللہ مراد ہے یا بیت المقدس؟ اور "عَلَى أَجْدَادِهِ" سے کیا مراد ہے؟ تیسرے ۱۶، ۱۷/ ماہ تشکیک کے ساتھ کیوں فرمایا؟ چوتھے یہ کہ حضورِ کریم ﷺ بیت اللہ کا قبلہ ہونا کیوں پسند فرماتے تھے؟ پانچویں یہ کہ تحویل قبلہ صلوٰۃ ظہر میں ہوا یا صلوۃ عصر میں؟ چھٹے یہ کہ ایک آدمی کی شہادت سے جو حضرات صحابہ گھوم گئے، یہ ایک کی شہادت کیسے قبول فرمائی، اگرچہ وہ قسم کھا گئے؟ ساتویں بیت المقدس کی طرف قبلہ ہونا یہودیوں کو کیوں

پسند آتا تھا؟ اور آٹھویں اہل کتاب سے کون مراد ہیں؟ پھر نصاری مراد ہیں تو ان کو کیوں پسند آتا تھا؟ ان کا تو بیت المقدس قبلہ نہ تھا، نویں ’’**وَ قُتِلُوا فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُولُ فِيهِمْ**‘‘ پر بحث ہے کہ سب سے پہلا جہاد تو غزوۂ بدر ہے جس کا وقوع ابھی نہیں ہوا پھر **قُتِلُوا** کہنا کیوں کر صحیح ہے؟۔

یہ اتنی بحثیں ہیں کہ اگر استاذ وشاگردوں کے حافظے اچھے ہوں تو تین دن لگ جائیں گے مگر حافظے اچھے نہیں، تین دن کیسے لگیں؟، پھر یہ تفاصیل ہمارے حضرت کا طریق نہیں، ملفوظات میں مطبوع ہے مگر اساتذہ نے بیان فرمائی ہیں۔

البحث الاول

(۱) البَيْتُ سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال اس لیے ہے کہ متبادر عند الاطلاق بیت اللہ ہے تو عِنْدَ کو إلیٰ کے معنی پر حمل کرتے ہوئے اب معنی یہ ہوں گے: ’’إلیٰ بَيْتِ اللہ‘‘ اس متبادر معنی کے پیش نظر خلجان ہوگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین کا سوال خانۂ کعبہ کی طرف پڑھی ہوئی نمازوں کے متعلق نہ تھا بلکہ بیت المقدس کے بارے میں تھا پھر بیت اللہ کیسے مراد ہوسکتا ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کاتب سے تغیر ہوگئی لفظ ’’غَيْرَ‘‘ تھا، اس کے بہ جائے ’’عِنْدَ‘‘ غلطی سے لکھ دیا، راء کا دال کر دیا اور نقطوں میں پہلے خاص اہتمام نہ تھا، محاورہ سے پڑھتے تھے(۱)۔

مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کاتب کی غلطی کیوں پکڑتے ہو، **عِنْدَ** ہی رہنے دو(۲)۔ حضرت شیخ الہندؒ حدیث دانی اور حدیث پرکھنے میں بڑے عجیب

(۱) قال بعض العلماء:إن المرادَ من البيت هو بيتُ المقدس، و ’’عند‘‘ بمعنى إلى، فصار الحاصل :يعني إلى بيت المقدس.(فيض الباري: ۱/۲۰۷)
(۲) وقد قيل إن فيه تصحيفا والصواب يعني صلاتكم لغير البيت وعندي أنه لا تصحيف فيه بل هو صواب ومقاصد البخاري في هذه الأمور دقيقة إلخ.(فتح الباري: ۱/۹٦)

شخص تھے۔ بڑی دور دور سے حدیث دانی کے لیےلوگ ان کے پاس آتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین کا سوال دونوں کے متعلق تھا، اس کا جواب یہ نازل ہوا کہ بیت اللہ کے پاس رہتے ہوئے بیت المقدس کی طرف جونماز پڑھتے تھے، اگر چہ بیت اللہ بھی پاس تھااور وہ سامنے ہوتا تھا مگر مقصودِ توجہ الی البیت المقدس توجہ اِلی اللہ تھی، جب ان نمازوں ہی کو ضائع نہیں کررہے تو مدینہ میں ۱۶، ۱۷/ماہ جب کہ بیت اللہ بھی پاس نہ تھا، وہ کیوں کر ضائع کریں گے؟ لہٰذا عندالبیت لفظ بعینہ صحیح ہے، تغیر وتحریف ماننے کی ضرورت نہیں (۱)۔

دوسرے یہ کہ مکہ کی تیرہ سالہ کثیر نمازیں قبول فرمالیں تو مدینہ کی ۱۶۔۱۷/ماہ قلیل کوبھلا کیوں ضائع کریں گے؟۔ یہ دوعنوان ہیں جس کو چاہو اختیار کرلو یا دونوں کو اختیار کرلو، تب بھی کچھ حرج نہیں، اب آگے چلئے! میں ترتیب سے چلا کرتا ہوں۔

البحث الثانی

(۲) دوسری بحث یہ تھی کہ مدینہ میں تشریف لے گئےتو **"عَلَى أَجْدَادِهِ"** فرمایا، سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا جدی وطن تو مکہ معظّمہ ہے، پھر مدینہ میں **"عَلَى أَجْدَادِهِ"** کیوں کر صادق و درست ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے جدامجد حضرت ہاشم ہیں جو تاجر پیشہ

(۱) وكأن البخاري أراد الإشارةَ إلى الجزم بالأصح، من أن صلاتهم عند البيت كانت إلى بيت المقدس، واقتصر على قوله» :عند البيت«، ولم يقلْ إلى بيت المقدس، اكتفاءً بالأولوية، لأن صلاتهم إلى غير جهة البيت، وهم عند البيت، إذا كانت لا تضيع، فأحرى أن لا تضيعَ إذا غابوا عنه، فتديرُ الكلامِ هكذا يعني : صلاتكم التي صليتُمُوها عند البيت إلى البيت المقدس. قلت :إن »عند« ههنا للزمان، والمراد منَ البيت هو بيت الله.(فيض الباري: ۱/۲۰۷)

تھے، سفر تجارت جب ملک شام کی طرف کرتے تو مدینہ راستہ میں واقع ہوتا تھا، ایک دفعہ مدینہ میں قیام فرمایا، اس وقت ایک خوب صورت حسینہ جمیلہ سلمی نامی لڑکی کا پیغامِ شادی کا سلسلہ تھا مگر وہ کچھ شرائط رکھتی تھیں، ان کو کوئی منظور نہ کرتا تھا، حضرت ہاشم کا خاندان مکہ میں بہت اونچا تھا اور خود نہایت حسین شخص تھے، انھوں نے بھی پیغام بھیجا، انھوں نے شرائط لگائیں، انھوں نے منظور کرلیا، من جملہ ان کے ایک یہ شرط تھی کہ سلمی نے کہا کہ طلاق میرے ہاتھ ہوگی، حضرت ہاشم نے کہا : بہت اچھا! منظور ہے، وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ایک دفعہ اپنے پاس آ تو جائے پھر میں جانوں، دیکھوں، بھلا کیسے جانا گوارا کرے گی۔

ہماری تین کمزوریاں

ہمارے اور آپ میں تین باتوں کی کمزوری ہے : ایک عدمِ حفظِ نسب ،عرب میں حفظِ نسب کا بہت بڑا اہتمام تھا، علونسب کا بڑا اثر ہوتا ہے، دوسرے وہ جانتے تھے کہ شجاعت وقوت میری ایسی ہے کہ وہ خود اس کو جانے نہ دے گی؛ اس لیے بے دھڑک یہ اطمینان منظور کرلیا، چوں کہ بات یہ ہے کہ میاں خواہ کالا ہو، غریب ہو مگر عورت کا خاص ولولہ ہے، فراغت میں دیر لگتی ہے تو مرد میں اگر اتنی قوتِ امساک ہو کہ خود تو پریشان نہ ہو اور عورت کو پریشان کردے تو عورت پھر پوری گرویدہ رہتی ہے، شوہر کو چھوڑنے کو کبھی تیار نہیں ہوتی، چناں چہ حضرت ہاشم سمجھتے تھے کہ میں جب تک چاہوں روک سکتا ہوں؛ اس لیے انھیں اطمینان تھا، شرطِ مختاریتِ طلاق منظور کرنے میں ذرا نہ ہچکچائے، بخلاف آج کل کے کہ کوئی نانوتہ جارہا ہے، کوئی لوہاری، ابھی سے قطرات کمزور، پٹھے کمزور، سر میں درد، ایسی صورت میں بیوی کا کیا حق ادا کیا جاسکتا ہے؟ ، کیا کروں! سمجھانا پڑتا ہے، جوانی سے پہلے جوان ہونے کا شوق اور فطری جوہر کا اخراج قبل از وقت

ہوتا ہے، اسی کو ایک پرانے بزرگ نے فرمایا تھا کہ عربی طلبہ میں ایک عیب حد درجہ نقصان دہ ہے، نیز حدیث شریف میں ہے کہ قیامت میں کچھ لوگوں کے ہاتھ حاملہ ہوں گے (۱)، وہ یہی ہاتھ ہوں گے جو اخراج مادہ (استمناء بالید) کرتے ہیں تو غلط خیالی اور غلط کاری سے پرہیز ضروری ہے، ورنہ مادہ رقیق ہونے کی صورت میں بیوی کا دل خوش نہیں ہوتا۔

الغرض! حضرت ہاشم بہت ضابط تھے، اس لیے خوشی سے منظور کرلیا کہ میں تو خلقی و خُلقی دونوں اعتبار سے انسانِ جامع ہوں بلند حوصلگی، اخلاق : حلم، تواضع کا وہ درجہ حاصل ہے کہ یہ میرے سے خوش رہے گی اور میری گرویدہ ہوجائے گی، ایسی کہ پھر جانے کا نام تک نہ لے گی۔

بہر حال! حضرت ہاشم کا نکاح سلمی سے ہوگیا اور مدینہ ہی میں قیام رہا، ان سے عبد المطلب پیدا ہوئے جن کا اصلی نام شیبۃ الحمد ہے اور عبد المطلب بعد کو مشہور ہو گیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ ہاشم نے بہ وقت انتقال اپنے بھائی مطلب کے نام وصیت فرمائی کہ میرے لڑکے کی تربیت اور کفالت فرمائیں، چناں چہ حسبِ وصیت مطلب اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے اور شیبۃ الحمد کو اپنی اونٹنی پر سوار کر کے روانہ ہوئے، راستہ میں ایک شخص نے یہ سمجھا کہ یہ لڑکا مطلب کا غلام ہے؛ اس لیے اس کو عبد المطلب کہہ کر پکارا پس اسی وقت سے عبد المطلب نام مشہور ہو گیا۔

(۱) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ:" يَجِيءُ النَّاكِحُ يَدَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَدُهُ حُبْلَى ".وفي حديث آخر:عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ :" سَبْعَةٌ لَا يَنْظُرُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَا يَجْمَعُهُمْ مَعَ الْعَالَمِينَ، يُدْخِلُهُمُ النَّارَ أَوَّلَ الدَّاخِلِينَ إِلَّا أَنْ يَتُوبُوا، إِلَّا أَنْ يَتُوبُوا، إِلَّا أَنْ يَتُوبُوا، فَمَنْ تَابَ تَابَ اللهُ عَلَيْهِ النَّاكِحُ يَدَهُ الحديث (شعب الإيمان، بَابُ فِي تَحْرِيمِ الْفُرُوجِ، وَمَا يَجِبُ مِنَ التَّعَفُّفِ عَنْهَا، رقم الحديث:۵۰۸۷)

تو اصل یہ ہے کہ مدینہ میں آپ کے ننھیال ہے اور اخوال ہیں؛ اس لیے اجداد کا لفظ حدیث میں مذکور ہوا(۱)۔

البحث الثالث

آپ ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میرے مکان پر تشریف لے چلیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہاں میری اونٹنی بیٹھ جائے گی، وہیں اتر جاؤں گا، چناں چہ جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالی عنہ کے مکان پر پہنچے، وہاں سے اونٹنی کچھ آگے بڑھی مگر پھر واپس لوٹ کر یہیں آ کر بیٹھ گئی، ایسی بیٹھی کہ وہیں گردن ڈال دی اٹھنے کو بالکل تیار نہیں، گویا دم توڑ گئی مرگئی، تو حضورِ اکرم ﷺ مدینہ ۱۲/ربیع الاول کو تشریف لائے اور ماہِ رجب میں تحویل قبلہ مسلم ہے؛ اس لیے سولہ مہینہ پورے ہوئے اور کسراً سترہ ہوئے، دونوں بات صحیح ہوئیں(۱)۔

البحث الرابع

اس زمانے میں وہاں حسبِ سابق بیت المقدس کی طرف منھ کر کے نماز پڑھتے تھے مگر تمنا تھی کہ بیت اللہ قبلہ ہو جائے اور گاہ بہ گاہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتے تھے، چناں چہ آپ ﷺ کا قبلہ بیت اللہ بنا دیا گیا، اب دو سوال پیدا ہوئے کہ آپ

(۱) والمراد بالأجداد هم من جهة الأمومة، وإطلاق الجد والخال هنا مجاز، لأن هاشما جد أب رسول الله ﷺ تزوج من الأنصار. (عمدة القاري: ۱/۲۴۴)

(۲) فان قلت :كيف الجمع بين الروايتين؟ قلت :وجه الجمع أن من جزم بستة عشر أخذ من شهر القدوم وشهر التحويل شهرا، والغى الأيام الزائدة فيه، ومن جزم بسبعة عشر عدهما معا، ومن شك تردد في ذلك، وذلك أن القدوم كان في شهر ربيع الأول بلا خلاف، وكان التحويل في نصف رجب في السنة الثانية على الصحيح، وبه جزم الجمهور. (عمدة القاري: ۱/۲۴۵)

ﷺ پیدا ہوئے مکہ میں اور قبلہ بیت المقدس بنایا گیا، یہ کیوں؟ دوسرا یہ کہ جب آپ ﷺ کا قبلہ بیت المقدس بنادیا گیا، پھر آپ کا جی بیت اللہ کے قبلہ ہونے کو کیوں چاہتا تھااور پھر ذاتِ باری تعالی نے بیت اللہ کو قبلہ کیوں بنادیا؟۔

اولاً بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی عجیب حکمت

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیت المقدس تمام انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ رہا ہے، حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے دوصاحب زادے حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام پیدا ہوئے، اول سے غیر عرب اور دوسرے سے عرب کی بنیاد پڑی، اہل عرب بنو اسماعیل کہلاتے ہیں اور غیر عرب بنو اسرائیل کہلاتے ہیں، سب انبیاء بنی اسرائیل تھے، ان سب کا قبلہ بیت المقدس رہا، اس لیے حضور ﷺ کی بعثت پر وہ قبلہ رکھا گیا۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ابتدء ہی سے کیوں بیت اللہ نہیں رکھا گیا، پہلے بیت المقدس پھر بیت اللہ کیوں ہوا؟ یہ بخاری شریف ہے، یہاں بڑا ذہین بنایا جاتا ہے، اگر صحیح طالب علمی کرے (مزاحاً وتنبیہاً فرمایا) ورنہ تیتروں (مقام کا نام) سے آگے بیٹھ گئے اور ذہن تیتروں رکھ آئے تو پھر کام سب تیتر بیتر۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ یہ عالم عالم اسباب ہے، عالم شہود ہے، یہاں ہر ایک کی ترقی اسباب سے وابستہ ہے، یوں تو آپ ﷺ کو اول درجہ عطا فرمایا ہے کہ تمام انسانوں بلکہ تمام موجودات میں آپ ﷺ کا درجہ سب سے اعلی واونچا ہے، حدیث شریف میں ہے: **أول ما خلق الله نوری** (۱)۔

(۱) کتب سیر میں یہ حدیث بلا سند نظر آتی ہے، جیسے سیرتِ حلبیہ میں ہے: وجاء أول ما خلق الله نوري. (۱/۲۱۴) البتہ کتب احادیث میں الفاظ کے فرق کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے: أول ما خلق الله نور نبيك يا جابر -الحديث. رواه عبد الرزاق بسنده عن جابر بن عبد الله، بلفظ: قال: قلت: يا رسول الله، بأبي أنت وأمي، أخبرني عن أول شيء خلقه الله قبل الأشياء. قال: يا جابر، إن الله تعالى خلق قبل الأشياء نور نبيك من نوره الحديث. (كشف الخفاء ومزيل الإلباس: ۱/۳۰۲، حرف الهمزة مع الهاء، رقم الحديث: ۸۲۷)

أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ (۱)، كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ (۲)۔ بہر حال! ترقی تدریجاً کرائی جارہی ہے بہ واسطۂ سلسلۂ اسباب: لہٰذا ضروری تھا کہ اولاً انبیائے سابقین علیہم الصلوۃ والسلام کی عبادت گاہوں کے انوار وبرکات اثراتِ موجودہ کے حاصل کرائے جائیں، اس لیے بیت المقدس قبلہ قرار دیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ مشائخ چلہ کشی کے لیے کسی بزرگ کی جگہ کو اختیار کرتے اور کراتے ہیں کہ وہاں ان سابق بزرگ نے نوافل، تسبیح، اذکار کیے ہیں، اس جگہ کی برکات وانوار سے تمتع اور فیض حاصل ہوگا؛ چناں چہ حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور ایک بزرگ کے حجرے میں چلہ کیا، چوں کہ بزرگ کی جگہ انوار وبرکات

(۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَدْرٍ وَمَعَهُ عَمُّهُ الْعَبَّاسُ قَالَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، لَوْ أَذِنْتَ لِي فَخَرَجْتُ إِلَى مَكَّةَ فَهَاجَرْتُ مِنْهَا أَوْ قَالَ: فَأُهَاجِرُ مِنْهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا عَمِّ اطْمَئِنَّ فَإِنَّك خَاتَمُ الْمُهَاجِرِينَ فِي الْهِجْرَةِ، كَمَا أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ فِي النُّبُوَّةِ. (فضائل الصحابة للإمام أحمد بن حنبل، فَضَائِلُ أَبِي الْفَضْلِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ عَمِّ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، رقم الحديث: ۱۸۱۲)

(۲) وأما الذي يجري على الألسنة بلفظ "كنت نبيًا وآدم بين الماء والطين"، فلم نقف عليه بهذا اللفظ فضلًا عن زيادة "وكنت نبيًا ولا آدم ولا ماء ولا طين". وقال الحافظ ابن حجر في بعض أجوبته عن الزيادة: إنها ضعيفة والذي قبلها أقوى وقال الزركشي: لا أصل له بهذا اللفظ. قال السيوطي في "الدرر": وزاد العوام "ولا آدم ولا ماء ولا طين"، لا أصل له أيضًا وقال القاري: يعني بحسب مبناه، وإلا فهو صحيح باعتبار معناه. وروى الترمذي أيضًا عن أبي هريرة: "أنهم قالوا: يا رسول الله متى وجبت لك النبوة؟ قال: وآدم بين الروح والجسد، وفي لفظ: متى كتبت نبيًا؟ قال: كتبت نبيا وآدم بين الروح والجسد. وعن الشعبي قال رجل: يا رسول الله، متى استنبئت؟ قال: وآدم بين الروح والجسد حين أخذ مني الميثاق إلخ. (كشف الخفاء ومزيل الإلباس: ۲/۱۵۳، حرف الكاف، رقم الحديث: ۲۰۰۷)

وتجلیاتِ الٰہی اور اثرات ہوتے ہیں، اس عابد کو لپک کر جا لگتے ہیں ، قلوب میں معنوی طور سے گھس جاتے ہیں، آنکھوں سے نظر نہیں آتے، اسی طرح آپ ﷺ کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو آپ ﷺ کا قبلہ بنایا؛ تا کہ انبیائے سابقین علیہم الصلوۃ والسلام میں جو فرداً فرداً کمالات تھے، وہ آپ ﷺ میں مجتمعاً آجائیں۔

نیز معراج جس میں اقصائے مراتب اور انتہائی کمالات تدریجاً عطا فرمائے جاتے ہیں، اس وقت بھی آپ کو بیت المقدس جانے کا حکم فرمایا، کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ براہِ راست آسمان پر پہنچا دئے جاتے مگر پھر بھی ایسا نہ کیا بلکہ پہلے بیت المقدس پہنچایا گیا، اس لیے کہ وہاں جملہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے ملاقات ہوگی، اس ملاقات میں جملہ انبیاء کے اثراتِ انوار و برکات اور ملکوتی کمالات انعکاسی طور پر آپ ﷺ کے اندر آجائیں گے پھر آپ ﷺ سب کے امام اور مقتدا ہوں گے اور سب پر فضیلت آپ ﷺ کی آشکارا ہوجائے گی پھر اس درجہ کمالات کے حصول کے بعد آسمانوں پر بلایا جائے گا؛ تا کہ منتہائے کمالات پر آپ ﷺ فائز ہوجائیں اور انسانی کمالات میں سے کوئی چیز بھی آپ ﷺ میں آنے سے باقی نہ رہے۔

یہاں سے (کہ آپ ﷺ سب کے مقتدا اور پیشوا ہوئے، سب نے آپ ﷺ کو امام بنایا اور سب انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام آپ ﷺ کے مقتدی اور تابع ہوئے) یہ بات واضح اور ثابت ہوگئی کہ اب کسی نبی کی امت اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو فلاں نبی مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کو نبی مان چکا، ان کو مقتدا مان چکا ہوں تو اب نبی عربی محمد ﷺ کو کیوں مقتدا بناؤں؟ اور ان کی اتباع میرے ذمہ ضروری نہیں رہی، اس بات کا اس کو حق نہیں، چوں کہ جواب ظاہر ہے کہ جب تمہارے نبی حضرت محمد ﷺ کو مقتدا اور امام بنا چکے تو تمہارا کیا منہ ہے جو اتباعِ محمدی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام سے انکار کرسکو؟، جملہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام نے

اتباع کر کے بتلادیا اور گویا حکم فرمادیا کہ سب کو پیغمبر آخر الزماں محمد ﷺ کی اتباع کرنا ضروری ہے، پس اب کسی کا اس سے انکار وانحراف کرنا اور اپنے مذہب پر جمے رہنا ہرگز کام نہ آئے گا، پس عیسائی وغیرہ کی دعوتِ عیسائیت محض غلط اور سراسر دھوکہ ہے، اور ہمارے پیغمبر محمد ﷺ قیامت تک کے جن اور انسانوں کے نبی ہیں، غرض بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کی وجہ وجیہ اور حکمت بالغہ آپ کے سامنے آگئی کہ حضور ﷺ کو ظاہری اور اسبابی طریقے سے ترقی دینا، مراتب علیا پر فائز کرنا، مجمع الکمالات بنانا منظور تھا، یہ جزوی فضیلت بیت المقدس کو حاصل تھی جس کی رعایت ایک وقت محدود تک فرماتے ہوئے اس کو قبلہ قرار دیا۔

کعبہ کو قبلہ بنانے کی حضور ﷺ کی خواہش اور اس کی عجیب حکمتیں

اور دراصل فضیلت اصلیہ وقدیمہ بیت اللہ شریف کو حاصل تھی اور ہے؛ اس لیے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر وہ بیت اللہ ہی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝٩٦﴾ [آل عمران]۔

جب زمین کی تخلیق ہوئی کہ پانی پر ایک بلبلا اٹھا اور بڑھتے بڑھتے بہت پھیل گیا، پانی کے ربع حصہ پر چھا گیا، اسی وجہ سے دنیا کو ربع سکون کہا جاتا ہے، یہی وہ زمین ہے کہ حق تعالی کی نظر ایجادی تخلیقی سے بلبلا زمین کی صورت اختیار کر گیا۔ جس جگہ بلبلا پیدا ہوا تھا، اس جگہ بیت اللہ ہی ہے، یہ جگہ تمام زمین کی ناف اور وسط ہے، بیت اللہ شریف بیچوں بیچ ہے، تو جس طرح عالم سفل میں اول وجود بیت اللہ کا ہے، عالم بالا میں آپ ﷺ کا وجود ہے، اولیت کے اعتبار سے آپ ﷺ اور خانہ کعبہ کے درمیان ایک بہترین اور اونچی مناسبت ہے، اس لیے آپ ﷺ کا

رجحان اور میلان خانۂ کعبہ کی طرف تھا اور آپ کی تمنا تھی، جی چاہتا تھا کہ خانۂ کعبہ ہی قبلہ بنا دیا جائے، چناں چہ آپ کی یہ تمنا آخر پوری فرما دی گئی۔

نیز بیت اللہ شریف مرکز عالم ہے اور آپ ﷺ بھی تمام مخلوق کے لیے مرکز ہیں، اول کو ظاہری مرکزیت حاصل ہے اور آپ ﷺ کو باطنی مرکزیت حاصل ہے، **فالجنس یمیل إلی الجنس**؛ اس لیے آپ ﷺ کا جی چاہتا تھا کہ بیت اللہ شریف قبلہ بن جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ادھر میلان ہو، ان متعدد وجوہ کے باعث آپ ﷺ کا جی چاہتا تھا کہ بیت اللہ شریف قبلہ قرار دے دیا جائے۔(۱)۔

بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی حکمتیں

نیز ایک وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاری سب بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا، اور ان کو آپ ﷺ دعوتِ توحید فرماتے تھے اور دعوت کا یہ بہترین طریق ہے کہ مخالفین کے ساتھ ملاطفت، مخالطت، موافقت ہو، اس نوعیت قبلتین میں یہ بات مضمر تھی، ورنہ اول وہلہ ہی میں بیت اللہ شریف قبلہ متعین ہو جاتا(۲)۔

(۲) دوسری وجہ یہ کہ کتب سابقہ میں پیشین گوئی تھی کہ ان کا قبلہ بیت المقدس ہوگا تو اگر اول ہی بیت اللہ شریف قبلہ مقرر ہو جاتا تو اس پیشین گوئی کے خلاف لازم آتا؛ اس لیے یہود کو خوشی ہو رہی تھی کہ ان کی کتاب کی اس میں تصدیق

(۱) وَكَانَتْ مَحَبَّتُهُ إِلَى الْكَعْبَةِ لِأَنَّهَا قِبْلَةُ إِبْرَاهِيمَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ. (تفسير القرطبی : ۲/ ۱۵۰،فی تفسير قوله تعالى:سَيَقُولُ السُّفَهاءُ مِنَ النَّاسِ الآية)

(۲) أَنَّهُ كَانَ مُخَيَّرًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكَعْبَةِ، فَاخْتَارَ الْقُدْسَ طَمَعًا فِي إِيمَانِ الْيَهُودِ وَاسْتِمَالَتِهِمْ، قَالَهُ الطَّبَرِيُّ. (تفسير القرطبی:۲/ ۱۵۰،فی تفسير قوله تعالى:سَيَقُولُ السُّفَهاءُ مِنَ النَّاسِ الآية)

تھی اور نصاریٰ کا قبلہ بھی اسی جانب تھا، اس لیے وہ بھی خوش تھے، پھر بعد تحویل کے بھی وہ خوش تھے، اس لیے کہ ان کی کتب سماویہ میں تحویل کی بھی پیشین گوئی تھی، اس کو موافقت ہونے کی وجہ سے اب بھی خوشی تھی، اس پر انکار اور نکیر کی کوئی وجہ نہ تھی، پھر بھی بعض ایمان نہیں لائے۔

حاصل یہ کہ ان وجوہ متعددہ سے قبلہ بیت المقدس بنایا گیا تھا، ورنہ اصل وضع کے اعتبار سے بیت اللہ اول تھا اور مرکزیت کے اعتبار سے، نیز قبلۂ ابراہیمی ہونے، نیز وطنی چیز سے طبعی محبت ہوتی ہے جو کہ وہ بھی نقص نہیں بلکہ ”حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الإِيمَانِ (۱)“ کے باعث وہ بھی محمود ہے، اس لیے آپ ﷺ کو

(۱) حب الوطن من الإيمان.قال الصغاني :موضوع، وقال في المقاصد :لم أقف عليه، ومعناه صحيح، ورد القاري قوله ومعناه صحيح بأنه عجيب، قال: إذ لا تلازم بين حب الوطن وبين الإيمان، قال:ورد أيضا بقوله تعالى:{وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ} الآية ,فإنها دلت على حبهم وطنهم، مع عدم تلبسهم بالإيمان؛ إذ ضمير عليهم للمنافقين، لكن انتصر له بعضهم بأنه ليس في كلامه أنه لا يحب الوطن إلا مؤمن، وإنما فيه أن حب الوطن لا ينافي الإيمان,انتهى .كذا نقله القاري ثم عقبه بقوله:ولا يخفى أن معنى الحديث حب الوطن من علامة الإيمان ,وهي لا تكون إلا إذا كان الحب مختصًا بالمؤمن، فإذا وجد فيه وفي غيره لا يصلح أن يكون علامة ,قوله:ومعناه صحيح نظرًا إلى قوله تعالى حكاية عن المؤمنين :{وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا} فصحت معارضته بقوله تعالى :{وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا} الآية. الأظهر في معنى الحديث إن صح مبناه أن يحمل على أن المراد بالوطن الجنة ,فإنها المسكن الأول لأبينا آدم على خلاف فيه أنه خلق فيها أو أدخل بعدما تكمل وأتم، أو المراد به مكة فإنها أم القرى وقبلة العالم، أو الرجوع إلى الله تعالى على طريقة الصوفية,فإنه المبدأ والمعاد كما يشير إليه قوله تعالى:{وَأَنَّ إِلَى رَبِّك الْمُنْتَهَى}أو المراد به الوطن المتعارف ولكن بشرط أن يكون سبب حبه صلة أرحامه، أو إحسانه إلى أهل بلده من فقرائه وأيتامه، ثم التحقيق أنه لا يلزم من كون الشيء علامة له اختصاصه به مطلقًا، بل يكفي غالبًا ألا ←

ہجرت کے وقت بھی جدائیٔ وطن کا رنج تھا، آپ ﷺ بار بار منہ پھیر کر دیکھتے تھے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ مکہ اور اس کے جبال اور گھاس کی یاد میں روتے تھے۔

آپ کے سامنے ابتداء بیت المقدس کے قبلہ ہونے اور پھر تحویل قبلہ ہوجانے دونوں کی وجوہ پیش کردی گئیں۔

البحث الخامس

اب یہ بحث ہے کہ تحویل قبلہ کس نماز میں ہوا؟ سو اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں، کسی میں اول نماز تحویل عصر مذکور ہے، کسی میں ظہر اور کسی میں فجر ہے تطبیق کچھ مشکل نہیں، صورت یہ تھی کہ آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ فلاں شخص کا انتقال ہو گیا، آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے، نماز مسجد بنوسلمہ میں (یہ مسجد ذو قبلتین کہلاتی ہے، آج تک اس کی دو محرابیں موجود ہیں) ادا فرمائی، یہ ظہر کی نماز ہے، اسی مسجد میں اسی وقت تحویل قبلہ کی وحی نازل ہوگئی، آپ ﷺ نماز میں تھے، دو رکعت ادا فرما چکے تھے، بس اسی وقت آپ ﷺ گھوم گئے، اس طرح نماز پوری فرمائی پھر واپس آکر اپنے مقام پر مسجد نبوی میں عصر کی نماز ادا فرمائی، بیت اللہ کی طرف اس مسجد میں یہ پہلی

← ترى إلى حديث :حسن العهد من الإيمان ,وحب العرب من الإيمان مع أنهما يوجدان في أهل الكفران انتهى. ومما يدل لكون المراد به مكة ما روى ابن أبي حاتم عن الضحاك قال :لما خرج النبي - ﷺ - من مكة فبلغ الجحفة اشتاق إلى مكة فأنزل الله :{إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَى مَعَادٍ}قال :إلى مكة انتهى. وللخطابي في غريب الحديث عن الزهري قال :قدم أُصَيْلٌ -بالتصغير- الغفاري على رسول الله - ﷺ - من مكة قبل أن يضرب الحجاب، فقالت له عائشة :كيف تركت مكة؟ قال : اخضرّت جنباتها، وابيضّت بطحاؤها، وأغدق إذخرها، وانتشر سلمها ... الحديث، وفيه فقال رسول الله ﷺ :"حسبك يا أصيل لا تحزني"، وفي رواية :فقال له النبي ﷺ : "ويهًا يا أصيل! تدع القلوب تقر" (كشف الخفاء: ۱/۳۹۸، رقم الحديث ۱۱۰۲)

نماز تھی، اس لیے بعض نے ظہر کا ذکر فرمادیا، بعض نے عصر کا، اپنے اپنے علم ومعلوم کے مطابق ذکر فرمایا، رہا فجر کا اول نماز تحویل ہونا، جیسا کہ یہ بھی بعض روایات میں مذکور ہے، سو اہل قبا کو اس تحویل کا علم نماز فجر میں ایک صحابی رضی اللہ تعالی عنہ کے خبر دینے سے ہوا، وہ لوگ نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے (۱)؛ اس لیے ان میں سے بیان کرنے والوں نے تحویل قبلہ اپنے علم کے مطابق فجر میں ہونا بیان کیا۔

البحث السادس

اب خبر واحد پر عمل درآمد کرنے پر اشکال ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص کی خبر پر کیسے عمل کرلیا؟۔

جواب یہ ہے کہ یہ خبر دیاناتِ محضہ ہے، پھر قرینۂ قویہ قریبہ بھی مؤید ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا بیت اللہ شریف کے قبلہ ہوجانے کو جی چاہتا تھا اور اللہ تعالی نے تحویل کا وعدہ فرمالیا تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص کسی بیمار کے انتقال کی خبر دیتا ہے، اس کو بلاتردد مان لیا جاتا ہے، چوں کہ آثارِ مرگ: سانس اکھڑ جانا، پیشانی اور آنکھوں کی خیرگی ناک کجی پہلے سے معلوم تھی تو جیسے قرائن قویہ کے ہونے سے ایک شخص کی خبر پر پورا یقین ووثوق ہوگیا، اسی طرح صحابہؓ نے قرائن قویہ کے اقتران کے ساتھ خبر واحد بلاتردد قبول فرما کر عمل درآمد فرمایا۔

یہیں سے ایک مسئلہ بھی صاف ہوگیا کہ قرآت میں نمازی غلطی کرے اور خارج نماز شخص اس آیت کو پڑھ دے، اس کو سن کر فوراً نماز پڑھنے والے کو

(۱) وجمع الحافظ رحمه الله تعالى بينهما بأن أول صلاةً صُليت إلى بيت الله هي صلاة الظهر، نزل النسخ فيها بعد الركعتين وكان النبي صلى الله عليه وسلّم إذ ذاك في مسجد ذي القِبْلتين، وأول صلاةً صلاها بتمامها إلى البيت هي صلاة العصر، وكانت في المسجد النبوي إلخ. (فيض البارى : ۱/۲۰۹) وأما أهل قباء فأتاهم الآتي في صلاة الصبح. (عمدة القاري: ۱/۲۴۶)

استحضار ہو گیا اور اپنی غلطی کی طرف التفات ہو گیا، اس سے نماز میں خلل نہیں آیا، اگر چہ بہ ظاہر خارجِ صلوٰۃ شخص کا لقمہ قبول ہوا مگر فی الحقیقت محض لقمہ پر عمل نہیں کیا گیا بلکہ لقمہ کے سبب سے اس کو خود یاد آ گیا پھر اپنی یاد سے پڑھا(۱)۔

البحث السابع

وَقُتِلُوا فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُولُ فِيهِم: پر شبہ عدم جہاد کا جواب یہ ہے کہ قتل کی صورت جہاد کے علاوہ بھی ہے، قتل سے جہاد لازم نہیں آتا، دوسری صورت قتل کی یہ ہے کہ کفار و مشرکین گھات میں رہتے تھے اور موقع پا کر مسلمانوں کو قتل کر دیتے تھے، اس لیے "وَقُتِلُوا" پر شبہ کرنا صحیح نہیں کہ جہاد نہیں ہوا تھا پھر "وَقُتِلُوا" فرمانا کیوں کر درست ہوا(۱)۔

(۱) وَفِي الْقُنْيَةِ اُرْتُجَ عَلَى الْإِمَامِ فَفَتَحَ عَلَيْهِ مَنْ لَيْسَ فِي صَلَاتِهِ وَتَذَكَّرَ فَإِذَا أَخَذَ فِي التِّلَاوَةِ قَبْلَ تَمَامِ الْفَتْحِ لَمْ تَفْسُدْ وَإِلَّا فَتَفْسُدُ لِأَنَّ تَذَكُّرَهُ يُضَافُ إِلَى الْفَتْحِ. قَالَ عليه الشامی رحمہ اللہ فی منحة الخالق: أَقُولُ: يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ الْمُرَادُ أَنَّهُ تَذَكَّرَ بِسَبَبِ الْفَتْحِ وَأَنْ يَكُونَ تَذَكَّرَ بِنَفْسِهِ وَلَكِنَّهُ صَادَفَ تَذَكُّرَهُ وَفَتْحَ مَنْ لَيْسَ فِي صَلَاتِهِ فِي وَقْتٍ وَاحِدٍ وَالظَّاهِرُ الْأَوَّلُ لِأَنَّهُ لَوْ كَانَ تَذَكُّرُهُ مِنْ نَفْسِهِ لَا يَظْهَرُ فَرْقٌ بَيْنَ أَخْذِهِ فِي التِّلَاوَةِ قَبْلَ تَمَامِ الْفَتْحِ أَوْ بَعْدَهُ وَلَا يَظْهَرُ وَجْهُ الْفَسَادِ لِأَنَّ الْفَسَادَ لَيْسَ بِمُجَرَّدِ الْفَتْحِ وَإِنَّمَا هُوَ بِالْأَخْذِ بِسَبَبِ الْفَتْحِ وَإِذَا كَانَ تَذَكُّرُهُ مِنْ نَفْسِهِ لَمْ يُوجَدْ الْأَخْذُ بِسَبَبِ الْفَتْحِ وَكَوْنُ الظَّاهِرِ أَنَّهُ أَخَذَ بِالْفَتْحِ فَيُضَافُ إِلَيْهِ لَا عِبْرَةَ لَهُ مَعَ مَا فِي نَفْسِ الْأَمْرِ لِأَنَّ ذَلِكَ مِنْ الدِّيَانَاتِ مِنْ الْأُمُورِ الرَّاجِعَةِ إِلَى الْقَضَاءِ حَتَّى يُعْتَبَرَ الظَّاهِرُ (البحر الرائق مع منحة الخالق: ۷/۲)

(۲) قال الكرماني: يحتمل أن يكون المقتولون نفس المائتين، وفائدة ذكر القتل بيان كيفية موتهم إشعارا بشرفهم، واستبعادا لضياع طاعتهم، وأن العقل قرينة لكون الواو بمعنى: أو قلت: كلامه يشعر بقتل رجال قبل تحويل القبلة، وهذا ليس بشيء، لأنه لم يعرف قط في الأخبار أن الواحد من المسلمين قتل قبل تحويل القبلة، على أن هذه اللفظة، اعني قوله: (وقتلوا) لا توجد غير رواية زهير بن معاوية، وفي باقي الروايات كلها ذكر الموت فقط، فيحتمل أن تكون هذه ←

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم أجمعین کو اشکال کیوں پیدا ہوا اور خدشہ ضیاع کیوں ہوا، حالاں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں وہ نمازیں ادا کی گئیں اور وحی کے مطابق ادا کیں پھر خدشہ کی کیا وجہ تھی؟ وجہ یہ تھی کہ یہاں مدینہ میں آکر شبہ اس لیے ہوا کہ مدینہ میں رخ بالکل بدلا ہوا تھا، بیت کی طرف پشت ہوتی تھی، برخلاف مکہ کے کہ وہاں شبہ نہ ہوا؛ اس لیے کہ وہاں بیت اللہ سامنے ہوتا تھا۔

پھر یہ اشکال ضیاعِ نماز کا حضرات صحابہؓ کو اس لیے ہوا کہ بعض احکام کا نزول تدریجی ہوا، مثلاً شراب کی ممانعت دفعۃً نازل نہیں ہوئی، گویا حق تعالی نے فرمایا کہ میں نے ہی طبیعتیں بنائی ہیں، میں ہی خوب جانتا ہوں کہ کس طور سے تعلیم ہونا چاہیے، چناں چہ حق تعالی نے اول فرمایا: خمر و میسر ٹھیک نہیں پھر فرمایا کہ گو ان میں منافع بھی ہیں مگر گناہ کے مضار زیادہ ہیں حضرت ابوبکر صدیق وعمر وغیرہ بعض صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم أجمعین نے اس وقت شراب پینا ترک کر دیا پھر فرمایا شراب پئے ہوئے نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، بعضوں نے یہ سن کر چھوڑ دی پھر اس کو عمل شیطان فرما کر حکم اجتناب نازل فرمایا، اس پر تو سب ہی صحابی نے بالکلیہ شراب ترک فرمادی، چناں چہ مشکوۃ شریف میں پڑھا ہوگا کہ شراب کے تمام ظروف: مشکیزے، گھڑے سب اوندھا دئے، گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی

← غير محفوظة. وقال بعضهم: فإن كانت هذه محفوظة، فتحمل على أن بعض المسلمين ممن لم يشتهر قتل في تلك المدة في غير الجهاد، ولم يضبط اسمه لقلة الاعتناء بالتاريخ إذ ذاك، ثم وجدت في المغازي ذكر رجل اختلف في إسلامه وهو: سويد بن الصامت إلخ (عمدة القاري: ۱/ ۲۴۹) أقول: إن نفي القتل مطلقًا مشكل، ويمكن أن يراد به القَتْلُ بمكة لا المدينة كما ذكره الحافظ رحمه الله تعالى آخرًا. (فيض الباري: ۱/ ۲۱۰)

طرح بہادی گئی (۱)۔

تو ٹھیک اسی طرح تحویل قبلہ کے سلسلے میں پہلے فرمایا کہ ہم تقلب وجہ دیکھ رہے ہیں پھر فرمایا کہ ہم ضرور آپ کی پسند کے موافق قبلہ مقرر فرمادیں گے، اس کے بعد پھر حکم نازل فرمادیا کہ بیت اللہ کی طرف منہ پھیر لیجئے، اس وجہ سے صحابہؓ کا ذہن اس طرف گیا کہ اب سے پہلے ہی حکم شراب کی طرح اشارۃً تحویل قبلہ کا حکم ہو چکا تھا یا کم از کم بیت اللہ کی طرف منہ کرنا افضل تو ہو ہی گیا تھا، (وہ حضرات افضل کے خوگر تھے) اس لیے اب خلجان ہو گیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ چلو! حضور ﷺ سے دریافت کرلیں، اگر کچھ تلافی کی صورت معلوم ہوگی تو ہم تو اس کی تلافی کرلیں گے لیکن ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو آج سے پہلے گذر گئے ہیں؟، حق تعالی نے ارشاد فرمایا کہ تمھارے اس شبہ وخلجان کا یہ حل ہے اور یہ جواب ہے کہ ہم ان گذشتہ نمازوں کو قبول کرتے ہیں یعنی مقبولیت میں بھی برابر اور درجہ میں بھی برابر ہے، چوں کہ وہ بھی حکم موافق تھیں (۱)۔

(۱) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: كُنْتُ سَاقِيَ الْقَوْمِ يَوْمَ حُرِّمَتِ الْخَمْرُ فِي بَيْتِ أَبِي طَلْحَةَ، وَمَا شَرَابُهُمْ إِلَّا الْفَضِيخُ: الْبُسْرُ وَالتَّمْرُ، فَإِذَا مُنَادٍ يُنَادِي، فَقَالَ: اخْرُجْ فَانْظُرْ، فَخَرَجْتُ، فَإِذَا مُنَادٍ يُنَادِي: أَلَا إِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِّمَتْ، قَالَ: فَجَرَتْ فِي سِكَكِ الْمَدِينَةِ، فَقَالَ لِي أَبُو طَلْحَةَ: اخْرُجْ فَاهْرِقْهَا، فَهَرَقْتُهَا. (صحيح مسلم، كتاب الْأَشْرِبَةِ، بَابُ تَحْرِيمِ الْخَمْرِ، وَبَيَانِ أَنَّهَا تَكُونُ مِنْ عَصِيرِ الْعِنَبِ، وَمِنَ التَّمْرِ وَالْبُسْرِ وَالزَّبِيبِ، وَغَيْرِهَا مِمَّا يُسْكِرُ، رقم الحديث: ۱۹۸۰)

(۲) یہ درحقیقت نویں بحث ہے اور ساتویں اور آٹھویں بحث مخطوطہ کاپی میں مذکور نہیں ہے، اللہ تعالی بہتر جانتے ہیں کہ کیسے رہ گئیں؟ ساتویں بحث یہ تھی کہ بیت المقدس کی طرف قبلہ ہونا یہودیوں کو کیوں پسند آتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیت المقدس یہودیوں کا قبلہ تھا، جب حضورِ اکرم ﷺ اور آپ کے متبعین اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو قبلے میں اس موافقت کی وجہ سے ان کی خوشی ظاہر تھی، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: لأنه كان قبلتهم، فإعجابهم لموافقة قبلة رسول الله ﷺ قبلتهم. (عمدة القاري: ۱/۲۴۴) آٹھویں بحث یہ تھی کہ اہل ←

ردعلی المرجیہ

اور امام بخاریؒ کا مقصود اس باب سے بھی مرجیہ پر رد کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ یہاں نماز کو عین ایمان فرمایا کہ مفسرین ایمان کی تفسیر صلوٰۃ سے کرتے ہیں تو جب ضیاعِ صلوٰۃ ضیاعِ ایمان ہے، معلوم ہوا کہ نماز جو کہ ایک عمل ہے، ایمان

→ کتاب سے کون مراد ہیں؟ پھر نصاری مراد ہیں تو ان کو کیوں پسند آتا تھا؟، اس کا جواب یہ ہے کہ نصاری کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا، اس لیے ان کے خوش ہونے کی وجہ وہی تھی جو وجہ یہودیوں کے خوش ہونے کی تھی؛ البتہ اس پر اشکال ہوسکتا ہے کہ نصاری کا قبلہ تو بیت لحم ہے جو حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کی جائے پیدائش ہے، اس لیے خوش ہونے کی مذکورہ وجہ نہیں ہوسکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ منورہ سے بیت المقدس کا رخ کرنے میں بیت لحم کا رخ بھی ہوجاتا ہے کہ دونوں مدینہ منورہ سے ایک ہی جہت میں واقع ہیں یا یہ کہ نصاری اہل کتاب کی طرح بیت المقدس کو بھی قبلہ مانتے تھے، حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں: (وأهل الكتاب) قيل: إن كان المرادُ منهم اليهود فقد مر ذكرهم، وإن كان النصارى فليست قِبلتهم بيت المقدس، بل هي بيت لحم جانب الشرق من بيت المقدس وهو مولد عيسى عليه الصَّلاة والسَّلام فكان الأمران عندهم سواء، فَلِمَ سخطوا على التحويل عنها؟ والجواب: أن المراد منهم النصارى، ووجه إنكارهم أن النبي صلى الله عليه وسلّم إذا كان يستقبلُ بيتَ المقدس وهو بالمدينة، كان يقع استقباله إلى بيت لحم أيضًا، فإنهما في سَمتٍ واحد من المدينة، فلما ولّى عنها لزمَ التحولُ عن قبلتهم أيضًا، فأنكروا لهذا. أو يقال: إنهم أيضًا كانوا يسمون بيت المقدس قِبلةً، فإنهم كانوا يدعون بتعبد الديانة الموسوية، والقبلة فيها بيتُ المقدس. والله تعالى أعلم. (فيض الباري: ۱/ ۲۱۰) دراصل بیت لحم بیت المقدس کے قریب ایک آبادی ہے جہاں حضرت عیسیؑ پیدا ہوئے تھے، علامہ حمویؒ فرماتے ہیں: بَيتُ لَحْم: بالفتح، وسكون الحاء المهملة: بليد قرب البيت المقدس عامر حفل، فيه سوق وبازارات، ومكان مهد عيسى بن مريم، عليه السلام. (معجم البلدان ۱: ۵۲۱/) دونوں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے، بس دو فرسخ تقریباً چھ میل کا فاصلہ ہے: وأما بيت لحم وهو الموضع الذي ولد فيه المسيح فبينه وبين القدس ستة أميال. (نزهة المشتاق في اختراق الآفاق: ۱/ ۳۶۲)

میں اس کو بڑادخل ہے، اس سے فی الجملہ اعمال کا ایمان میں دخیل ہونا ثابت ہوگیا، پس اے مرجیہ! تمھارا یہ کہنا کہ اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں، یہاں سے بھی باطل اور خلافِ آیات واحادیث ہونا ظاہر ہوگیا۔

مناسبت بین البابین

ماقبل باب سے اس باب کی مناسبت بھی معلوم ہوچکی کہ اوپر دین کے یسر اوراس کی سہولت اورآسانی کا بیان تھا، اس باب میں دین کی چیزنماز کے یسر اور سہولت کا بیان ہے کہ پہلے قبلہ کی طرف پڑھی جانے والی نمازیں بھی قبول اوراس قبلہ والی نماز کے درجہ کے برابر باعث فضیلت ہیں۔

اب جملہ تفاصیل بیانات شنیدہ اساتذہ آپ حضرات کومعلوم ہوگئیں، ضروری ہے کہ عمل کے موقعہ پر ان احادیث کے پیش نظرعمل کیا کرو، نیزسنن ونوافل فرصت نکال کر(بہانہ سازی سے احتراز کرتے ہوئے) بجالانے کی سعی وکوشش کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، ان کے ادا کرنے سے ایمان میں نوراورروشنی (اورقربِ الٰہی،تقربِ اعلیٰ مراتب میں شمار ہوتا ہے) میں زیادتی ہوتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

الدرس السابع والأربعون

بَابُ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ

قَالَ مَالِكٌ:أَخْبَرَنِي زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ، أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ:" إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ إِسْلَامُهُ، يُكَفِّرُ اللَّهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا، وَكَانَ بَعْدَ ذَلِكَ الْقِصَاصُ :الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا إِلَّا أَنْ يَتَجَاوَزَ اللَّهُ عَنْهَا "

۴۰:حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ، قَالَ:حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، قَالَ :أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ، عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:" إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ:فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِمِثْلِهَا "

ربط ومناسبت بین البابین

یہ فرما کر ترجمہ تا ختم حدیث پورا فرما دیا: پہلی بحث یہ ہے کہ اس باب کو بابِ سابق کے ساتھ کیا ربط ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بابِ سابق میں فرمایا تھا ”الصَّلاۃُمِنَ الإِیمَانِ“ کہ نماز ایمان سے ہے، اس پر سوال یہ ہوتا تھا کہ نماز ایمان سے مطلقاً ہے؟ یا کسی شرط اور قید کے ساتھ ہے؟ اس سوال کا جواب اس باب کو بنا رہے ہیں اور حاصل جواب یہ ہے کہ ہر نماز ایمان سے نہیں، ایمان کی چیز نہیں بلکہ وہ نماز ایمان کا کام اور ایمان کی چیز ہے جو حُسنِ اسلام کے ساتھ یعنی اخلاص کے ساتھ ہو، احسان کے ساتھ ہو، قبح کے ساتھ نہ ہو یعنی نمائش اور دکھاوے کے طور پر نہ ہو کہ نمائشی نماز کا اعتبار نہیں، جیسے اسلام ایک حسن لیے ہوئے ہوتا ہے، وہ وہ ہے جو انقیادِ قلب کے ساتھ ہو اور ایک اسلام رسمی اور اسمی ہوتا ہے جو اپنے اندر قبح واثم لیے

ہوئے ہوتا ہے اور وہ نمائشی اسلام ہے اور فی الحقیقت یہ اسلام نہیں ہوتا بلکہ استسلام ہوتا ہے، برخلاف اس کے جو قلبی و حقیقی و معنوی اسلام ہوتا ہے، وہی حقیقی اور اصلی معنی میں اسلام ہوتا ہے تو جیسے ظاہری رسمی اسلام یعنی استسلام کو ایمان میں کوئی دخل نہیں ہوتا، اسی طرح نمائشی و رسمی نماز کو بھی ایمان میں دخل نہیں، پس وہ نماز جس کو جان بچانے کے لیے ریاءً پڑھا گیا ہو، وہ اللہ تعالی کے یہاں لائق اعتبار و لائق قبول نہیں، یہ ربط علامہ عینیؒ کے بیان کے موافق ہے(۱)۔

رد علی المرجیہ

اور مقصد امام بخاریؒ کا تردید مرجیہ ہے، اس لیے اس ترجمۂ باب سے ان پر رد ہے کہ دیکھو اسلام کا حسن ایمان میں داخل ہے اور حسن کلی مشکک ہے، اس کے انواع مختلف قسم کے حسن لیے ہوئے ہیں اور جب یہ کلی مشکک ہے جس کے افراد میں تفاوت ہوتا ہے؛ لہٰذا اسلام بھی سب کا برابر نہیں تو جیسا کسی کا حسن ہوگا، ویسا ہی اسلام اور ایمان ہوگا، اعلیٰ حسن والا اعلیٰ درجہ کا ایمان والا ہوگا، اوسط اور ادنی والا ویسا اسلام و ایمان رکھتا ہوگا، اس تفاوتِ مراتب سے اسلام وایمان کا قابل زیادت ونقصان ہونا واضح اور ثابت ہو گیا، پس اے مرجیہ! تمھارا یہ کہنا کہ ایمان بسیط ہے، یہ قول بساطت باطل ہے، لہٰذا ترکِ اعمالِ حسنہ وارتکابِ سیئات سے ایمان لامحالہ پہلی حالت پر نہ رہے گا، حسبِ اعمال اس میں تنزلی وترقی ہوتی رہے گی۔

رد علی المعتزلہ والخوارج

اور اے معتزلہ تم پر بھی اس سے رد ہو گیا اور اسی طرح خوارج پر بھی رد ہو گیا،

(۱) وجه المناسبة بين البابين من حيث إن المذكور في الباب الأول أن الصلاة من الإيمان وهذا الباب فيه حسن إسلام المرء، ولا يحسن إسلام المرء إلا بإقامة الصلاة.(عمدة القاري: ۱/۲۴۹)

اس طرح کہ بابِ ہذا سے ثابت ہو گیا کہ بدعملی سے اسلام میں حسن نہ رہے گا بلکہ ضد حسن یعنی قبح آجائے گا، جس سے یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام باقی ہے، پس نہ عدمِ ایمان آیا، نہ کفر آیا۔

لہٰذا معتزلہ اور خوارج! تمھارا یہ کہنا غلط ہے کہ گناہِ کبیرہ سے ایمان سے نکل جاتا ہے (۱)، کفر میں داخل ہو جاتا ہے، حدیث باب مسند ہماری دلیل ہے، اس میں ارشادِ نبوی ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے بہ قدر سوء اور گناہ لکھ لیا جاتا ہے اور نیکی کرتا ہے تو دس سے سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ گناہ لکھا جاتا ہے، ایمان نہیں جاتا اور کفر نہیں لکھا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دو قسم کا ہوتا ہے: (۱) اسلام حسن (۲) اسلام سوء، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ساتھ حسن کی قید لگا کر ارشاد فرمایا کہ "یُکَفِّرُ": سیئاتِ سابقہ، خطیاتِ ماضیہ سب مٹا دی جائیں گی، لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام حسن کے ساتھ کفارہ ہے، ورنہ سوء سے یہ کفارہ نہیں ہوتا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر ایک اشکال اور اس کا جواب

اس پر امام احمد بن حنبلؒ نے امام اعظمؒ سے کہا (یہ صیغہ غائبانہ ہے) کہ کیسے کہہ دیا کہ قبولِ اسلام سے معاصئ سابقہ بدونِ صحیح توبہ معاف ہو جاتے ہیں، حالاں کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ مسئ اسلام سے ماقبل اسلام اور مابعد اسلام دونوں قسم کے سیئات کے بارے میں باز پرس ہوگی، البتہ اگر صحیح

(۱) فيه الحجة على الخوارج وغيرهم من الذين يكفرون بالذنوب ويوجبون خلود المذنبين في النار. (عمدة القاري: ۱/۲۵۳)

توبہ کرلے تو ماقبل کے معاف ہوجائیں گے (۱) ۔ یہ امام احمد بن حنبل کی طرف التزام ہوا۔

لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام کو قبول جب ہی تو کررہا ہے کہ تمام مذاہب کو باطل سمجھتا اور ان سے نفرت رکھتا ہے، ورنہ کفر اور شرک کیوں چھوڑتا؟، ظاہر ہے کہ ان کو برا سمجھا اور ان سے بیزاری ہوئی اور اسلام کی خوبی وعظمت اس کے دل میں بیٹھی اور کفر سے بیزاری اور اسلام کی اچھائی یہ توبہ ہی ہے، ورنہ ہم پوچھتے ہیں کہ اصل ایمان ہے یا اعمال؟ ظاہر ہے کہ اصل ایمان ہے اور اعمالِ شریعت اس کی فرع ہیں، اسی طرح اس کی ضد کفر اصل اور جڑ ہے اور کفریات اس کی شاخ اور فرع ہیں، پس جب اسلام آیا تو چوں کہ اسلام وایمان لازم ملزوم ہیں، اسلام کے ساتھ ایمان بھی آ گیا اور جب ایمان آ گیا تو اس کی ضد کفر ختم ہوگئی اور قاعدہ ہے کہ جڑ کے ختم ہونے سے شاخیں بھی ختم ہوجاتی ہیں تو جوں ہی اسلام کی جڑ آئی، مع فروع کے آئی تو کفر مع اپنی فروع یعنی کفریات کے ساتھ ختم ہوگیا (۲) ، اور آپ کے کہنے سے مقصود غیر مقصود اور غیر مقصود کا مقصود ہونا لازم آتا ہے جو کہ صحیح نہیں چونکہ ایمان اصل ہے پس امام احمدؒ کی بات جی کو نہیں لگتی۔

---

(۱) عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ :قَالَ رَجُلٌ :يَا رَسُولَ اللهِ، أَنُؤَاخَذُ بِمَا عَمِلْنَا فِي الجَاهِلِيَّةِ؟ قَالَ:مَنْ أَحْسَنَ فِي الإِسْلاَمِ لَمْ يُؤَاخَذْ بِمَا عَمِلَ فِي الجَاهِلِيَّةِ، وَمَنْ أَسَاءَ فِي الإِسْلاَمِ أُخِذَ بِالأَوَّلِ وَالآخِرِ (صحيح البخارى، كِتَابُ اسْتِتَابَةِ المُرْتَدِّينَ وَالمُعَانِدِينَ وَقِتَالِهِمْ، بَابُ إِثْمِ مَنْ أَشْرَكَ بِاللهِ، وَعُقُوبَتِهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، رقم الحديث: ۶۹۲۱)

(۲) قلت:والمراد من إحسانِ الإسلامِ عندي أن يُسلم قلبُهُ، ويتضمن إسلامهُ التوبة عما فعل في الكفر، فلم يعد بعد الإسلام إليها، فهذا الذي غُفر له ذنبه.ومن إساءة الإسلام أن يُسلم ولم يتضمن إسلامُهُ التوبة عن معاصيه التي زلفها في الكفر، واستمر على ما كان، فهذا وإن صار مسلمًا إلا أنه يُؤخذُ بالأول والآخر. (فيض الباري ۱/۲۱۱)

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کا مکالمہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوا تھا کہ آپ نے فرمایا تھا: ترک صلوٰۃ سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب اس کے مؤمن ہونے کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نماز شروع کردے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کفر کی حالت میں نماز کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟ قبول تو درکنار! چوں کہ عبادت بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتی اور نیت حالت کفر کی معتبر نہیں، پھر کیسے کہتے ہو کہ نماز شروع کردے تو مؤمن ہو جائے گا؟ بس اس پر آپ خاموش ہو گئے (۱)۔

اس لیے آپ کا یہ کہنا کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں، اس لیے اس کو مستقل توبہ کرنا ضروری ہے، بلا توبہ سیئاتِ سابقہ معاف نہ ہوں گے، اس کی ضرورت نہیں، مسلم شریف کی حدیث شریف میں وارد ہے: **الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ** (۲)، اس میں توبہ کی کوئی قید نہیں بلکہ اسلام ہی کو سیئاتِ ماقبل کا ہادم قرار دیا، اب ان دونوں حدیثوں کو: حدیث ابن مسعودؓ وحدیث مسلم کو سامنے رکھتے ہوئے تطبیق دینا ضروری ہے، ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی حدیث کو چھوڑتے نہیں، سب کو جمع فرماتے ہیں۔

چناں چہ تطبیق بین الحدیثین یہ ہے کہ اسلام کی دو قسمیں ہیں: ایک اسلام حسن اور ایک اسلام سوء، اسلام حسن کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ آتا ہے تو سب برائیاں جڑ سے اکھڑ جاتی ہیں اور تمام ماقبل کو کالعدم کر دیتا ہے اور اسلام سوء کا یہ اثر اور خاصہ نہیں، بس امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا اپنی جگہ پر صحیح ہے، اس پر کوئی

(۱) طبقات الشافعية الكبرى لتاج الدين السبكي: ۲/۶۱، مناظرة بَين الشَّافِعِي وأَحْمَد ابْن حَنْبَل.

(۲) صحيح مسلم، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی الله تعالى عنه، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ كَوْنِ الْإِسْلَامِ يَهْدِمُ مَا قَبْلَهُ وَكَذَا الْهِجْرَةِ وَالْحَجِّ، رقم الحديث: ۱۹۲.

اشکال اور خلجان وخلافِ حدیث وقولِ صحابی کا التزام نہیں آتا؛ اس لیے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث کا یہ محمل ہے اور یہ مراد ہے کہ جب اسلام حسن نہ ہوتو ماقبل ومابعد سب کے متعلق باز پرس ہوگی، سو یہ صحیح ہے لیکن ایسے اسلام کو اسلام کہنا محض رسمی واسمی ولفظی ہے، حقیقی اسلام اس کونہیں کہتے، حقیقی اسلام وہ ہے جوخلوص اور نیک نیتی سے ہو، کسی غرض ومصلحت دینیہ ودنیویہ کی بناء پر نہ ہو، جب یہ اسلام ہوگا تو بلاتوبہ جملہ سیئاتِ ماضیہ کا قلع قمع کردے گا، اس لیے کہ اسلام حسن اپنے فروعات کے ساتھ آیا، جن میں توبہ بھی داخل ہے تو اسلام حسن اختیار کرنا توبہ پر مشتمل اور توبہ کو متضمن ہے(۱)۔

"سَبْعُ مِائَةِ ضِعْفٍ" پر کلام

اس کے بعد حدیث "سَبْعُ مِائَةِ ضِعْفٍ" ہے کہ ہر نیکی دس نیکیوں سے سات سوتک لکھی جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک نیکی کا کم ازکم اجر دس گنا ہوتا ہے اور حسبِ زیادتئ حسن واخلاص اجر میں زیادتی ہوتی رہتی ہے، حتی کہ سات سو گنا ہوجاتا ہے بلکہ اس پر بھی بس نہیں اور یہ ۷۰۰/تحدیداً نہیں تکثیراً ہے(۲) یعنی مطلقاً زیادتی مراد ہے، زیادتی مقید ومحدود نہیں بلکہ زیادتی بہ قدرِ اخلاص لامحدود ہوتی رہے گی۔ ثابت ہوگیا کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور کمی اس کولازم ہے یہ

(۱) وعلى هذا فحديث الهدم محمولٌ على ما تضمن إسلامُهُ التوبة، وحديث ابن مسعود رضي الله تعالى عنه على ما لم يكن كذلك. (فيض الباري ۱/۱۱۲)

(۲) (بعشر أمثالها) فضلا من الله ونعمة (إلى سبعمائة ضعف) " إلى " لانتهاء الغاية، فيكون ما بين العشرة إلى سبعمائة درجات بحسب الأعمال، والأشخاص، والأحوال، أو لمجرد الإفضال، والله يضاعف لمن يشاء. حكى الماوردي أن الضعف لا يتجاوز عن سبعمائة. قال النووي :هذا غلط، لما في مسلم إلى سبعمائة ضعف إلى أضعاف كثيرة اهـ. فالمراد بسبعمائة الكثرة إلخ (مرقاة المفاتيح: ۱/۱۱۸، كتاب الإيمان، الفصل الثالث)

کتاب الایمان کے ساتھ مناسبت ہوئی۔

الحاصل حدیث میں حسنہ سے تضاعف اور سیئہ سے بقدر سیئہ معصیہ لکھا جانا مذکور ہے، یہ دین میں آسانی وسہولت ہوئی، اس سے ماقبل "بَابٌ: الدِّينُ يُسْرٌ" کے ساتھ ربط ہوگیا مگر یہ تضاعف حسنہ جب ہے کہ اسلام میں حسن ہو، اخلاص ہو اور جس کا اسلام اخلاص کے حسن سے خالی ہوگا، اس کے لیے یہ حکم نہیں۔

حسنہ کی دو قسمیں اور ان کا حکم

بلکہ مسیٔ الاسلام کے متعلق شراح اس طرح سمجھاتے ہیں کہ حسنہ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک من حیث العبادۃ، ایک من حیث القربۃ، سو من حیث العبادۃ نیکی موقوف ہے نیت پر اور کافر کفر کی وجہ سے نیت کا محل نہیں، اس لیے اس کی نیکی آخرت میں کالعدم ہے، البتہ دنیا میں اس کو اس کے بدلہ میں دنیوی سہولتیں مل جائیں گی۔

دوسری قسم نیکی کی من حیث القربۃ ہے، سو اس میں حسن ہی حسن ہے، قبح نہیں، جیسے رحم دلی، عدل وانصاف وغیرہ، سو ایسے کافر کو جس میں یہ اچھائی ہو، رحم دلی، عدل وغیرہ بہ مقابلہ اس کافر کے جو قاسی القلب اور ظالم ہو، آخرت میں بھی عذاب ہلکا ہوگا اور دنیا میں دنیوی فراخی بھی کثرتِ مال واقتدار واعزاز وغیرہ حاصل ہوگی (۱)۔

(۱) إلا أن حسناتِ الكافر على نحوين منها كالحِلْم، وصلة الرَّحم، والإعتاق، والصدقة، فهذه كلُّها نافعةٌ له في الآخرة، وإن لم تكنُ منجية، فإن المنجيَ من النار هو الإيمان لا غير، إلا أنها تصير سببًا لتخفيف العذاب شيئًا، ولذا أجمعوا على أن الكافرَ العادل أخفُّ عذابًا من الكافر الظالم وكذا عُلم من الشريعة تفاوت دركات العذاب وليس هذا إلا لنفع الطاعات يسيرًا. -إلى أن قال- فالحاصل: أن الطاعاتِ والقُرُباتِ، كلُّها نافعةٌ للكافر، أما العبادات فغيرُ معتبرةٍ أصلًا بلا تأويل والله أعلم بحقيقة الحال. (فيض الباري ۱/۲۱۲، ۲۱۱)

چناں چہ حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابو طالب کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے میرے ساتھ رحم دلی اور حسنِ سلوک کیا، اس لیے بہ جائے وسطِ جہنم کے کنارۂ جہنم میں ہوں گے اور ان کو صرف آگ کی جوتی پہنا دی گئی لیکن ان جوتیوں کا یہ اثر ہے کہ سر کھولتا اور پکتا ہے(۱)۔ (اللھم أجرنا من النار)، اس سے معلوم ہوا کہ کافر کے حسنہ دنیا میں ضائع نہیں ہو جاتے اور آخرت میں بھی کچھ تخفیف ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حسن ہونا چاہیے، جس درجہ حسن ہوگا، اسی درجہ کا اسلام ہوگا اور حسن سے اخلاص مراد ہے، آیت شریفہ ﴿وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [العنکبوت]"أی المخلصين" تو تفاوتِ حسن و اخلاص سے تفاوتِ ایمان ہوا، ایمان میں کمی زیادتی ثابت ہوگئی تو بابِ ہٰذا کو کتاب الایمان اور باب ماقبل سے ربط و مناسبت ظاہر ہوگئی، مقصد امام بخاریؒ ثابت ہو گیا کہ مراتب حسن مختلف ہوا کرنے سے ایمان و اسلام کے مراتب و درجات نکل آئے۔

بَابٌ :أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ أَدْوَمُهُ

۴۱ :حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ هِشَامٍ قَالَ:أَخْبَرَنِي أَبِي، عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ، قَالَ :مَنْ هَذِهِ؟ قَالَتْ:فُلَانَةُ، تَذْكُرُ مِنْ صَلَاتِهَا، قَالَ:مَهْ، عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ، فَوَاللهِ لَا يَمَلُّ اللهُ حَتَّى تَمَلُّوا وَكَانَ أَحَبَّ الدِّينِ إِلَيْهِ مَادَامَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ.

(۱) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ وَذُكِرَ عِنْدَهُ عَمُّهُ، فَقَالَ: لَعَلَّهُ تَنْفَعُهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ القِيَامَةِ، فَيُجْعَلُ فِي ضَحْضَاحٍ مِنَ النَّارِ يَبْلُغُ كَعْبَيْهِ، يَغْلِي مِنْهُ دِمَاغُهُ«(صحیح البخاری، کتاب مناقب الأنصار، بَابُ قِصَّةِ أَبِي طَالِبٍ، رقم الحديث:۳۸۸۵)عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ،أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ:إِنَّ أَدْنَى أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَنْتَعِلُ بِنَعْلَيْنِ مِنْ نَارٍ، يَغْلِي دِمَاغُهُ مِنْ حَرَارَةِ . (صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ أَهْوَنِ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا، رقم الحديث: ۳۶۱)

بابِ ہٰذا کو بابِ سابق کے ساتھ مناسبت وربط

ترجمۂ باب وحدیث کے بعد فرمایا کہ اس باب کو سابق کے ساتھ نہایت عمدہ وعجیب ربط ہے، وہ اس طرح کہ وہاں عمل حسن وعمل سوء کا ذکر فرمایا تھا اور اس طرح اعمال کا حسن اسلام میں دخیل ہونا ثابت فرمایا تھا، یہاں ترقئ حسنِ اسلام کو بتلارہے ہیں کہ جب ہوتی ہے، جب کہ اعمال میں مداومت بھی ہو اور مداومت تب ممکن ہے کہ طاقت کے موافق اعمال اختیار کیے جائیں، ورنہ یا تو ترقی نہ ہوگی یا ترقی کو بقاء نہ ہوگی (۱)۔

باب میں دوامِ اعمال ہی کیوں مراد ہے، دوامِ عقائد کیوں نہیں؟

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہاں دوامِ اعمال کیوں مراد ہے، دوامِ عقائد کیوں مراد نہیں؟۔

جواب یہ ہے کہ عقائد میں ترقی کا احتمال درست نہیں، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عقائد میں تردد سے دین أَحَبّ تو نہ رہے گا مگر مطلق دین ہوگا، حالاں کہ تردد سے نفس ایمان ہی ختم ہوجاتا ہے، کفر آجاتا ہے، پہلے تردِدِ عقائد تھا اور تردِدِ عقائد مستلزم ہے کفر کو؛ اس لیے کہ عقائد تو چند چیزوں کے تسلیم کر لینے کا نام ہے، پس اس میں کمی بیشی پر انعدامِ ایمان وثبوتِ کفر لازم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے قرین اور ماقبل میں حسن اسلام کے تحت

(۱) ومناسبته لما قبله من قوله عليكم بما تطيقون لأنه لما قدم أن الإسلام يحسن بالأعمال الصالحة أراد أن ينبه على أن جهاد النفس في ذلك إلى حد المغالبة غير مطلوب. (فتح الباري: ۱/۱۰۱)

اعمال ہی مراد تھے اور یہاں ''أَحَبُّ الدِّين'' فرمایااورحسن اسلام اور اَحَبُّ الدِّ ینِ متقارب ہیں، اس لیے یہاں بھی اعمال ہی مراد ہوں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث باب میں جوتذکرہ وچرچا وشہرت مذکور ہے، وہ کسی عقیدۂ توحید یا عقیدۂ آخرت یا ایمانِ مجمل یا ایمانِ مفصل کا نہیں ہے، وہ صحابیہ رضی اللہ تعالی عنہا نوافل ومستحبات کی بہت پابند تھیں، اشراق، چاشت، اوابین، تہجد سب کی پابندی فرماتی تھیں تونماز کا چرچا تھا اورنماز عقیدہ نہیں بلکہ عمل ہے؛ لہٰذا ''أَدْوَمُهُ'' کے ساتھ اگرچہ اعمال مذکو نہیں مگر مراد اعمال ہی ہیں۔

مستحبات ونوافل پر مداومت سے ایمان میں نور آتا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حسن اسلام اور دینی خوب صورتی اعمالِ صالحہ سے پیدا ہوتی ہے اور ان ہی سے ترقی ہوتی ہے، یہ کوئی خاص بات نہیں کہ فرائض پر قناعت اور بس کر لی یہ توسبھی کرلیا کرتے ہیں، اس میں کیا سرخاب کا پر لگ گیا! کمال یہ ہے کہ فرائض کے علاوہ نوافل اور مستحبات کی بھی پابندی ہو، چناں چہ وہ صحابیہ رضی اللہ تعالی عنہا فرائض کے علاوہ دیگر نوافل مستحبات کی بڑی پابند تھیں، جن میں سے اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد بھی ہیں اور سننِ غیر مؤکدہ ونوافل کا التزام فرما رکھا تھا، تو مراد یہاں اعمال خیر اور اعمالِ مستحبہ ونوافل ہیں، اس سے احبیت آتی ہے، اسی وجہ سے اہل التزامِ مستحبات کو اولیاء اللہ کہتے ہیں، نہ کہ محض فرائض پر قناعت کرنے والوں کو، چناں چہ عرف میں فرض روزوں اور زکوۃ وغیر ادا کرنے والوں کو اولیاء اللہ نہیں کہا جاتا۔

ولایتِ خاصہ پر فائز خوش نصیب لوگوں کی علامات

اور یوں تو نفس اسلام قبول کرنے والا اور کفر سے بری ہو جانے والا بھی ایک قسم کا ولی اللہ ہے، اس کو آیت میں فرمایا گیا:﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ ﴾ [البقرة:۲۵۷] اللہ تعالی اہل ایمان کے ولی ہیں مگر یہ ولایت عامہ ہے، ولایت خاصہ کو خاص مقام اور نمایاں رفعت حاصل ہے، جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے :﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝۶۲ۚۖ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۝۶۳ۭ ﴾ [یونس]۔﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ [الأنفال:۳۴] کہ کان کھول کر سن لو! ہوش میں آ کر دماغ درست کر کے دھیان سے سنو! اولیاء اللہ وہ ہیں جن پر کسی قسم کا خوف اور غم نہیں، ان کو حق تعالی سے وہ دلی تعلق ہے، جو کسی کو معلوم نہیں، اچھا! پہچان سن لو! وہ ایمان والے ہیں، ابھی اور بھی پہچان ہے، وہ کیا ہے؟ وہ بڑی بھاری چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ تقوی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے، گناہ کبیرہ سے دور بھاگتے ہیں اور صغیرہ سے نجات لیے ہوئے ہیں، الا بہ تقاضائے بشری کچھ کبھی ہو گیا تو راتوں میں بڑے روتے دھوتے ہیں، حتی کہ اپنا معاملہ صاف کر لیتے ہیں، جب تقوی حاصل ہے تو عبادت کی بجا آوری میں چست اور طاعات پر کمر بستہ ہیں، یہ ہیں اولیاء اللہ۔

اور یہ تقوی ایسا نہیں کہ دو چار دن کے بعد ختم ہو جائے بلکہ دائمی ہو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو، یہ نہیں کہ دو شب نفلیں پڑھ لیں، بس وحی کا انتظار کرنے لگے کہ اب وحی نازل ہوا کرے گی۔

تو حدیث میں صحابیہ رضی اللہ تعالی عنہا کا جو ذکر ہے، وہ عباداتِ نافلہ کی وجہ سے ہے؛ کیوں کہ چرچا اس کا ہوا کرتا ہے اور نگاہیں اس پر پڑا کرتی ہیں کہ جو عام سطح سے اونچا اور نمایاں عمل کرے، معلوم ہوا کہ صاحب نوافل و مستحبات قانع

فرائض سے بڑھ کر قوی الایمان ہوگا مگر یہ دوامِ عمل پر مبنی ہے اور دوامِ عمل حسبِ طاقت اختیارِ اعمال پر ہے۔

"مَهْ" پر کلام

حدیث شریف میں "مَهْ" کا لفظ ہے، اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ خطاب کس کو ہے آیا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کو یا حضرت خولہ رضی اللہ تعالی عنہا جن کا چرچا تھا، ان کے لیے ہے؟ حضراتِ شراح فرماتے ہیں کہ دونوں کو یہ فرمان درست ہوسکتا ہے، حضرت عائشہؓ کو خطاب ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عائشہؓ کو منع فرمارہے ہیں کہ زیادہ تعریف مت کرو؛ کیوں کہ یہ سامنے موجود ہیں اور منھ پر تعریف کرنے سے عجب پیدا ہو کر بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے (۱)۔

اب اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ تو بڑی محدثہ اور فقیہ ہیں، کیا ان کو منھ پر تعریف کرنے کے متعلق یہ بات معلوم نہ تھی، اگر معلوم تھی تو پھر یہ ارتکاب کیسا؟۔

اس کے شراح رحمہم اللہ تعالی نے دو جواب فرمائے ہیں ایک یہ کہ اس کے منکر اور سیئہ ہونے کا علم نہ تھا، بعض نے فرمایا کہ وہ سامنے موجود نہ تھیں بلکہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں تھیں، ان کے چلے جانے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یہ بات یعنی تعریف فرمائی تو آپ ﷺ نے منھ پر تعریف کرنے سے منع فرمایا، یا چرچا کرنے سے منع فرمایا (۱)۔

---

(۱) قوله :(مه) زجر كما ذكرنا، ولكن يحتمل أن يكون لعائشة، والمراد نهيها عن مدح المرأة. (عمدة القاري: ۱/۲۵۷)

(۲) وقال ابن التين:لعل عائشة أمنت عليها الفتنة، فلذلك مدحتها في وجهها. قلت :جاءفي رواية حماد بن سلمة عن هشام في هذا الحديث مايدل على أنها إنما ذكرت ذلك بعد أن خرجت المرأة، أخرجها الحسن بن سفيان في مسنده من طريقه، ولفظه : (كانت عندي امرأة، فلما قامت قال رسول الله ﷺ :من هذه يا عائشة؟قلت :يا رسول الله هذه فلانة، وهي أعبد أهل المدينة) (عمدة القاري: ۱/۲۵۷)

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ نے بعد کو فرمایا تو بعد میں ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اس تک پہنچا دے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ "مَهْ" کا خطاب ان صحابیہؓ عورت ہی کو ہے تو اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ ٹھہرو، جانے بھی دو، رہنے بھی دو، یہ تم نے کیا طریق اختیار کیا ہے؟، لوگوں میں چرچا ہو گیا، اندیشہ یہ نظر آرہا ہے کہ تم آخر انسان ہو، زیادہ کام سے ضعف اور کمزوری ہوگی، اس کا یہ اثر ہوگا کہ جلدی عبادت سے بیٹھ جاوے گی، اگر کیا بھی تو خوش دلی کے ساتھ نہ ہوگا، تنگ دلی ہوگی کہ جسم، اعضاء تھک جانے، کمزور ہو جانے کے سبب ساتھ نہیں دے رہے مگر عادت کی وجہ سے چھوڑنے کو جی نہ چاہے گا(۱)۔

اعمالِ صالحہ پر مدامت کی احبیت

اس لیے فرمایا کہ صرف اتنی تعداد رکھو، اتنے اوقات مقرر رکھو کہ آخر تک نشاط اور خوش دلی کے ساتھ نباہ سکو۔ یہ اپنا جزئی اور شخصی خیال ہے، اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دوامِ عمل محبوب ہے، بلا دوام محبوب نہیں، اس لیے کہ آدابِ شاہی میں سے ہے کہ دربارِ شاہی میں جانا شروع کر کے جانا چھوڑ دیا تو بادشاہ کو بجائے محبت بڑھ جانے کے ایسے آنے والے سے تعلق نہ ہوگا، ایسے آنے سے تو نہ آنا اچھا تھا، یہ برا ہوا کہ گرانی کا باعث ہو گیا، اظہارِ تعلق کے بعد بے تعلق!۔ معلوم ہوا کہ دوام سے تعلق اور محبت میں اضافہ اور ترقی ہوتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھیں گے، چوں کہ حالاتِ دنیا آخرت کے نمونے اور اس

(۱) ويحتمل أن يكون المراد النهي عن تكلف عمل لا يطاق به، ولهذا قال بعده: (عليكم من العمل ما تطيقون). (عمدة القاري: ۱/۲۵۷)

کے لیے مثالیں ہیں۔ نفل نماز کے تارک سے شکایت نہیں؛ اس لیے کہ آپ نہیں چاہتے کہ تعلق وقرب بڑھے تو کوئی شکایت نہیں مگر جب نفل شروع کر دیے تو گویا دعوی کیا تعلق بڑھانے کا اور ”أنا جلیس“ کہا، چوں کہ نماز ذکر ہے۔ بس اس کا ترک ایسا ہی ہوا کہ ہم نشینی اختیار کر کے ترک کر دی، فرائض پر قناعت کرنا ضابطہ ہے، رابطہ نہیں، یہ آئینی چیز ہے، گو فی الجملہ رابطہ ہے اور مقصود جملہ ہے اور مرکب غیر مفید جملہ نہیں، اسی طرح ضابطہ رابطۂ ناقصہ ہے۔

ایک صرفی کی عجیب حکایت:

ایک فن کی ایک کتاب بھی سمجھ کر پڑھ لینا کافی ہے

میں تو کہا کرتا ہوں کہ کسی فن کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لی جائے کافی ہے، چناں چہ ایک اہل صرف کی حکایت ہے کہ ان کو ایک فقیہ نے کہا کہ آپ نے بہت کسر کی کہ فقہ حاصل نہیں کیا، اس نے جواب دیا کہ بس یہ کافی ہے، چوں کہ میں صرف میں کامل ہوں، اگر کچھ چاہو تو پوچھ لو بتلا دوں گا، انھوں نے سوال کیا کہ ایک شخص نے کسی غلطی پر سجدۂ سہو کیا اور اس کے بعد پھر کوئی واجب ترک کر دیا جو موجب سجدہ ہے، اب کیا کرے؟۔ صرفی نے کچھ سوچا پھر جواب دیا کہ اب سجدۂ سہو نہ کرے۔ فقیہ نے کہا صحیح ہے مگر کیسے سمجھے؟ انھوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ ایک نوع کی تعلیل کے بعد دوسرے اسی نوع کی تعلیل کا تقاضا ہو تو اس کلمہ میں پھر دوبارہ اسی نوع کی تعلیل نہیں کی جاتی، یہاں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔

اب سمجھے؟ ایک فن بھی سمجھے تو باقی فنون آسان ہو جاتے ہیں، اشارات کافی ہوں گے، یہ بات کیوں کہی؟ ضابطہ فی الجملہ رابطہ ہے: لہٰذا مستحسنات، مستحبات، مندوبات، سنن کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور ایسا کرنے سے احتراز اور پرہیز لازم

ہے کہ شروع کر دے پھر چھوڑ دے، جیسا کہ بادشاہ کے پاس آنا اور رابطہ کرنا شروع کر کے پھر ختم کر دینا، اس سے ذاتِ باری تعالی کو غصہ آتا ہے کہ تقرب اختیار کر کے تباعد! اس میں ایک قسم کی بوئے توہین و بے قدری ہے، اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اعمال اس قدر اختیار کرو جن پر دوام اور نبھاؤ ہو سکے۔

اسی لیے میں اپنے دوستوں کو کہا کرتا ہوں کہ اگر تہجد میں نہ اٹھ سکو تو بعد العشاء قبل وتر چار رکعت تہجد کی نیت سے پڑھ لیا کرو؛ کیوں کہ دوام کی یہ سہل صورت اور تدبیر ہے، شیخ ایسی تدابیر بتلاتا ہے کہ دوسروں کو اس کی ہوا بھی نصیب نہیں ہوتی، اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ شیخ بنانا ضروری ہے، عادۃ اللہ یہی ہے کہ بلا شیخ کامل تربیت نہیں ہوتی، اگر چہ کوئی علامہ ہو جائے۔

میں نے ایک وعظ میں کہا تھا جس میں مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم سابق مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (۱) اور مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۱) مولانا حافظ عبد اللطیف صاحبؒ: آپ کے والد ماجد کا نام مولانا جمعیت علی صاحبؒ ہے اور آپ کی ولادت غالباً ۱۲۹۹ھ کو قصبہ پور قاضی ضلع مظفر نگر میں ہوئی اور وہیں پر ابتدائی تعلیم اور حفظ کی تکمیل کی، آپ کے والد محترم گورنمنٹ کالج بھاول پور میں شعبہ عربی و فارسی کے مدرس اول تھے تو بھاول پور میں رہ کر اپنے والد صاحب سے فارسی کی کتابیں پڑھیں پھر آپ کے والد صاحبؒ نے آپ کو حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کے حوالے کر دیا، اس طرح آپ مظاہر علوم پہنچے اور وہیں سے ۱۳۲۳ھ میں فراغت حاصل کی اور آپ کی استعداد اور قابلیت کو سامنے رکھ کر اہل مظاہر نے پہلے معین مدرس پھر ۱۵/روپے مشاہرہ پر مستقل مدرس بنا دیا، آپ نے بخاری اور ترمذی شریف کا بھی درس دیا، ۱۳۴۴ھ میں آپؒ کو مظاہر کا ناظم مقرر کیا گیا اور ۱۳۴۷ھ میں مہتمم بھی بنائے گئے اور آخری دم تک تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ مہتمم و ناظم بھی رہے، آپؒ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے بیعت تھے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی تشریف سے خلافت عطا ہوئی تھی، آپ بڑی ذی استعداد اور حسن تدبیر کے مالک تھے اور حلقۂ درس خوب مقبول تھا ۲/ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ بروز دوشنبہ ۱۰/بجے صبح وصال ہو گیا۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔ (حیاتِ مظفر ۱/: ۹۱ تا ۹۵)

مظاہر علوم سہارنپور (۱) موجود تھے، میں نے کہا تھا کہ یوں کہتے ہیں کہ آج مشائخ ہیں کہاں؟ میں کہتا ہوں: آج علماء کہاں؟ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے جیسے مشائخ نہیں تو میں کہوں گا کہ پہلے جیسے علماء بھی نہیں اور اگر فی الجملہ علماء ہیں تو مشائخ بھی ہیں، یہ سن کر دونوں حضرات ناظم صاحب اور مفتی صاحبؒ بڑے خوش ہوئے اور وعظ ختم ہونے پر میری کمر تھپکی اور فرمایا ماشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ خوب حل کیا، خوب جواب دیا۔

تو آج کل کے علماء خواہ کیسے ہی ہوں لیکن حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جیسے تو بہر حال نہیں، ان حضرات کو تو امامِ وقت، مجتہد زماں بھی کہہ دیا جائے تو بجا ہوگا، جب بایں ہمہ ان کو بھی مشائخ کی ضرورت ہوئی تو آج کس کا منہ ہے کہ یوں کہے کہ ہمیں مشائخ کی ضرورت نہیں، بس قرآن وحدیث کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف ملال کی نسبت پر اشکال اور جواب

اب حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کے طرف ملال کی نسبت فرمائی گئی، اس

(۱) مفتی سعید احمد صاحبؒ: آپ کے والد محترم کا نام نور محمد خاں تھا ۱۰/ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ میں اجراڑہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے، بارہ، تیرہ سال کی عمر میں اپنی بستی ہی میں حفظ قرآن کی تکمیل کی اور وہیں پر رہ کر اردو حساب اور عربی، فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۳۴۱ھ میں مظاہر علوم سہارنپور سے فراغت حاصل کی اور مظاہر میں تدریسی خدمات میں مشغول ہوئے، ۱۳۵۲ھ میں مظاہر کے مفتیٔ اعظم اور قائم مقام صدر مدرس بنائے گئے، مظاہر کی مسجد مدرسہ قدیم میں تیس سال تک بلا معاوضہ امامت کے فرائض بھی انجام دیے، بیعت وارشاد کا تعلق حضرت اقدس سہارنپوریؒ کے ساتھ تھا، ۲/صفر ۱۳۷۷ھ بروز پنج شنبہ صبح کی نماز کے وقت انتقال ہوا اور قبرستان حاجی شاہ میں تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ (مسافرانِ بہشت، ص ۱۳۲، ۱۳۳)

پر اشکال ہوتا ہے کہ ملول ہوجانا تو تھک جانا ہوتا ہے، اکتا جانا ہوتا ہے، یہ اللہ تعالی کے متعلق کہنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟۔

جواب یہ ہے کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ ثواب دینا ختم نہ فرماتے، برابر عطا فرماتے رہتے لیکن تم نے ہی لینا چھوڑ دیا، تم ہی چھوڑ کر بیٹھ گئے (۱)، اللہ تعالی بھی ناراض ہو گئے، اب اندیشہ اور خطرہ یہ ہے کہ کہیں اس ناراضگیٔ حق تعالی کا یہ اثر نہ ہوجائے کہ ترکِ فرائض کی نوبت آجائے اور پھر مایوسی تک اور شدہ شدہ شیطان اپنی کوشش میں کامیاب ہوجائے کہ گھات میں ہر وقت لگا ہوا ہے، کسی آن وہ اپنے مقصد گمراہی سے غافل نہیں، برابر انسان کو بہکانے اور پھسلانے، ایمان سے ہٹا دینے کی فکر اور کوشش میں پورے اہتمام سے لگا رہتا ہے اور اس کو یہ موقع اپنی غفلت و سستی وکاہلی کی وجہ دے دیا تو وہ کفر میں داخل کردے۔

بہ قدر تحمل وطاقت اعمالِ صالحہ اختیار کرنے کے فوائد

اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں "عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ"، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے میرے شیخ نے جو معمولات ارشاد فرمائے تھے، اب تک میں نے ان کو ترک نہیں کیا اور آخر تک ان شاء اللہ تعالی ترک نہ کروں گا، اس لیے

(۱) والحاصل أن الملال لا يجوز على الله تعالى، ولا يدخل تحت صفاته لأنه ترك الشيء استثقالا وكراهية له بعد حرص ومحبة فيه، وهو من صفات المخلوق، فلا بد من تأويل. واختلف العلماء فيه، فقال الخطابي: معناه أنه لا يترك الثواب على العمل ما لم يذكر العمل، وذلك أن من مل شيئا تركه، فكنى عن الترك بالملال الذي هو سبب الترك. (عمدة القاري: ۱/۲۵۷)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پہلے تنگ دلی سے کرنے لگو گے، اگر زیادہ اعمال شروع کرو گے تو آخر اس کا نتیجہ یہی ہوگا اور پھر ترکِ اعمال اور عجز کی نوبت آجائے گی اور نوافل کے ترک سے سنن پھر واجبات پھر فرائض پھر عقائد پر ہاتھ صاف ہونا شروع ہوجائے گا، اس لئے حضور ﷺ نے حفظ ما تقدم اور پیش بندی فرمادی، ایسی تدبیر ارشاد فرمادی جس سے تمام شیطانی راہیں مسدود ہوگئیں، اعمالِ نافلہ طاقت کے موافق کیے جائیں گے تو دوام نصیب رہے گا، سہولت رہے گی، ضعف اور عجز کی نوبت نہ آئے گی، نہ پھر نوافل ترک ہوں گے اور نہ آگے ترک کی راہیں کھلیں گی کہ اہمالِ سنن اور ترکِ واجبات وترکِ فرائض اور ضعف عقائد پھر فسادِ عقائد پھر دخول فی الکفر یہ کچھ بھی نہ ہوگا۔

تو دوامِ اعمال میں حفاظت ایمان اور تقویت ایمان کا راز مضمر ہے، پس اچھی طرح وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ثابت ہوگیا کہ یہاں "أَحَبُّ الدِّينِ" سے اعمال ہی مراد ہیں، اگرچہ عنوان میں شمول عقائد کو بھی ہے مگر قرائن اور دلائل سے معلوم ہوگیا کہ اس جگہ مراد اعمال ہی ہیں تو عنوان عام معنون خاص ہے، پس حسنِ دین کی ضرورت ہے اور وہ دوامِ اعمال کے اختیار کرنے پر موقوف ہے اس سے دین میں کمال آئے گا، ورنہ نقص وزوال قبول کرے گا، پھر جیسا حسنِ دین ہوگا، ویسا ہی کمال ہوگا۔ پس زیادت ونقصانِ دین کے ثبوت سے ایمان کا مرکب ہونا ثابت ہوگیا، معلوم ہوا کہ ایمان بسیط نہیں، جیسا کہ بعض فرق باطلہ کا خیال ہے، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوگیا کہ سیئات سے کفر نہیں آتا۔ گویا یہ بات فرما کر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے جارہے ہیں اور اب ختم مجلس پر آخری بات فرماتے ہیں کہ دین وایمان میں حسن پیدا کرو اس طریقہ سے کہ اعمال اختیار کرو اور ان میں دوام رکھو، اللہ تعالی دوامِ عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❁ ❁ ❁

الدرس الثامن والأربعون

بَابُ زِيَادَةِ الإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى {وَزِدْنَاهُمْ هُدًى} [الكهف :١٣] {وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا} [المدثر:٣١] وَقَالَ: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ.

قرآت فرما کر ترجمہ شروع فرمایا دوسری وتیسری آیت کا اس طرح ترجمہ فرمایا کہ زیادہ ہوتے رہے ایمان والے یہاں تک کہ زیادہ کرتے کرتے یہ ہوا کہ ہم نے دین کامل کر دیا، جب یہ ہے تو جب کمالِ دین سے کسی چیز کو کوئی چھوڑ دے گا ،اس کا دین ناقص ہوگا ، اب اس کے ثبوت میں حدیث مسند پیش فرماتے ہیں؛

۴۲:حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ:حَدَّثَنَا هِشَامٌ، قَالَ:حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ شَعِيرَةٍ مِنْ خَيْرٍ، وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ، وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ :قَالَ أَبَانُ، حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، حَدَّثَنَا أَنَسٌ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ إِيمَانٍ مَكَانَ مِنْ خَيْرٍ.

بعدہ پوری حدیث کا مع سند ترجمہ فرمایا، اس سے فراغت کے بعد اس طرح شروع فرمایا:

ربط ومناسبت بین البابین

اس سے پہلے "أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ أَدْوَمُهُ " تھا،جس میں اشارہ تھا دوامِ اسلام واعمال کی طرف، جومستلزمِ زیادۃ ونقصان فی الایمان ہے تو

اس طرح ماقبل باب میں بہ واسطۂ دوام اعمال زیادۃ ونقصانِ ایمان کا بیان تھا، اب اس باب سے مقصود بلا واسطہ دوامِ اعمال ایمان میں زیادۃ ونقصان کو بیان فرماتے ہیں، گویا یوں فرماتے ہیں کہ شاید تم نے ماقبل سے یہ خیال کیا ہو کہ اعمال کے واسطہ ہی سے ایمان میں زیادہ ونقصان ہوتا ہے، نہیں ایسا نہیں ہیں، بتلاتا ہوں کہ ایمان میں بلا واسطہ بھی زیادتی ونقصان ہوتا ہے۔

تکرارِ باب کا اشکال اور اس کے جوابات

اب جب ترجمۂ باب کو دیکھتے ہیں تو فوراً ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس باب کی ضرورت نہ تھی، چوں کہ اس میں زیادہ ونقصان کا ذکر ہے اور یہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ شروع کتاب الایمان میں **یزید وینقص** فرماچکے اور مدلل بیان اور ثابت کرچکے، چنانچہ بہ سلسلہ دلائل یہ آیات وہاں ذکر کی جاچکیں۔ تو اب یہاں "**زِيَادَةِ الإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ**" کہنا سوائے تکرار کے اور کیا ہے؟ اور کلام میں تکرار ہونا، ایک ہی بات کو بار بار کہنا کوئی سمجھ داری کی بات نہیں؛ اس لیے اس کو کوئی عاقل بھی اپنے کلام میں پسند واختیار نہیں کرتا۔

ع : جو یکبار گفتی مگو باز پس کہ حلوا چوں یکبار خورند وبس (۱)۔

پھر امام بخاریؒ بایں جلالت قدر، بایں عالی مرتبت ان کا تکرار کلام نہایت اعجب ہے۔

اس اشکال کا جواب حسبِ بیانِ اساتذہ وشراح رحمہم اللہ تعالی یہ دیا کہ کتاب الایمان شروع کے موقع پر جہاں "**یزید وینقص**" کا ذکر ہے، اس سے قبل ترجمہ اصل "**بنی الإسلام علی خمس**" ہے اور "**یزید وینقص**" اس کا تابع اور اس کے تحت ہے، بس وہاں زیادت ونقصان ضمناً وتبعاً مذکور ہوا اور یہاں زیادت ونقصان کو بالاصل اور بالاستقلال بیان کرنا ہے، پس حیثیت بدل گئی تو بعینہ ذکر

(۱) ایک بار آپ نے جو کہا دوبارہ مت کہنا، کہ مٹھائی ایک بار کھاتے ہیں اور بس۔

کہاں ہوا، اور جب ایک شئے کا بعینہ ذکر نہیں ہوا تو اعادہ وتکرار بھی لازم نہیں آیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ وہاں اسلام کے ذکر کے بعد "**یزید و ینقص**" تھا جس سے بہ ظاہر اسلام میں زیادت ونقصان کا ثبوت ہوا تھا، مرجیہ کو گنجائش اور موقع تھا کہ وہ کہہ دیں کہ اس سے ایمان میں زیادتی ونقصان کا ہونا ثابت نہیں ہوا، اسلام میں کمی زیادتی ثابت ہوئی، اس کے ہم بھی مخالف نہیں، ہم بھی اس کے قائل ہیں تو گویا یہاں امام بخاریؒ ردو استدراک فرماتے ہیں اور ان پر رد کو محکم فرماتے ہیں، دفع دخل مقدر کے طور پر ان کے اشکال کو اور شبہ کو ساقط اور زائل فرماتے ہیں اور گویا یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ اچھا! جب حقیقت سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتے، محض لفظوں کے چکر میں الجھ کر رہ جاتے اور لفظ کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے تو میں ان الفاظ اور اس عنوان کو ترک کرتا ہوں اور پہلو بدل کر دوسرے طور پر سمجھاتا ہوں۔

جیسے حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کا نمرود سے مناظرہ ہوا اور دعوت الی الحق کے سلسلے میں انھوں نے نمرود کو ارشاد فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو موت اور زندگی کا مالک وخالق ہے، وہی موت دیتا ہے، وہی زندگی بخشتا ہے، نمرود اس کو نہ سمجھا اور کہنے لگا کہ میں بھی موت اور زندگی دیتا ہوں اور اس کو یوں ثابت کرنا چاہا کہ دو شخص بلائے، ایک کو قتل کر دیا ایک کو چھوڑ دیا اور کہنے لگا: رب ہونے کی یہی بات ہے تو اس میں مَیں بھی برابر ہوں پھر تیرے رب کا تابع کیوں بنوں؟ میں بھی تیرے رب سے کم نہیں، تیرے رب میں امتیازی اور خصوصی بات کیا ہوئی؟، اس سب کو حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے دیکھ کر یقین سے جان لیا کہ مخاطب ناسمجھ ہے، بے وقوف ہے، اس کو دوسرے عنوان سے سمجھانا چاہیے، یہ احیاء اور اماتت کی حقیقت نہیں سمجھ سکا، ایسے کندہ ناتراش کو سمجھانا مشکل ہے؛ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام

نے پہلو بدل کر دوسرے نہج سے سمجھانا شروع کیا، پہلی دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل اختیار فرمائی۔

ٹھیک اسی طرح حضرت امام بخاریؒ نے پہلو بدلا اور گویا یوں فرمایا کہ اے مرجیہ! تم یوں اشکال کرتے ہو اور ہماری تقریر میں نقض ونقص بتلاتے ہو کہ اسلام یعنی اعمال کے واسطہ سے ایمان میں کم وکاست ثابت ہوئی، براہ راست بلا واسطہ نفس ایمان میں تو کمی زیادتی ثابت نہیں ہوئی، اچھا! اب ہم کہتے ہیں کہ نفس ایمان بھی کم وزیادہ ہوتا ہے، عنوان کی یہ تبدیلی ایسی ہے، جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ تقریر کے وقت ایک ہی لفظ کے بار بار کہنے سے تقریر سے اکتاہٹ پیدا ہوجاتی ہے، الفاظ وعنوان بدل کر کہتا ہے تو بیان میں خوبی اور سامعین کی دل چسپی باقی رہتی ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ایمان کی تین حیثیت یا تین درجے ہیں، پہلے ایک اعتبار سے کمی زیادتی ثابت فرمائی تھی، اب دوسرے درجہ اور دوسری حیثیت سے ایمان میں کمی زیادتی کا ہونا ثابت فرمارہے ہیں، تکرار جب ہوتا، جب دونوں جگہ ایک ہی حیثیت سے زیادت ونقصان ایمان کا بیان ہوتا، یہاں ایسا نہیں، پس تکرار بھی لازم نہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک تو انشراحِ قلب اور کسی شئے کے قبول کرنے میں انبساط ونشاط ہوتا ہے، یہ ایک کیفیت قلبیہ ہے، اسی کا نام تصدیق ہے اور ایک ہے اعمال کا درجہ اور ایک ہے مؤمن بہ (بہ عنوانِ دیگر ایک نفس تصدیق، دوسرے متعلق تصدیق تیسرے ثمرۂ تصدیق) وہاں پہلے امام نے من حیث الاعمال یعنی من حیث الجمال ایمان کی کمی زیادتی ثابت فرمائی تھی، اب یہاں من حیث المؤمن بہ (یعنی متعلق تصدیق) کی زیادتی بیان فرمارہے ہیں۔ پس تکرار کا شبہ ساقط ہوگیا۔

مؤمن بہ کے اعتبار سے کمی زیادتی کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک حکم صلوٰۃ نازل ہوا، اس کا من جانب اللہ ہونا سمجھ لیا، اس کو مان لیا، اس کے من اللہ ہونے پر ایمان لے آئے پھر صوم کا حکم نازل ہوا، اس پر ایمان لے آئے، ایک بہ اعتبار کیف ہے، ایک باعتبار کم ہے یا یہ کہا جائے کہ یہاں بہ اعتبارِ نسبت واضافت ہے، بہ اعتبارِ واقع کمی بیشی بیان کرنا نہیں، چوں کہ واقعی ایمان تو جمیع ماجاء بہ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق ہے، وہ بہر صورت حاصل ہے، مؤمن بہ ایک ہو یا ہزار؛ اس لیے کہ **ماجاء به الرسول** کی تصدیق کا حاصل ہے یہ ہے کہ رسول کی باتیں سب برحق اور سچی ہیں، خواہ بیان کی جا چکی ہوں یا آیندہ بیان ہوں، اس لیے اب یہ اشکال وشبہ نہیں ہوسکتا کہ جن صحابہؓ کا وصال فرضیت صلوٰۃ کے بعد ہی قبل نزول احکامِ اُخر ہو گیا، ان سے بعد تک رہنے والے صحابہؓ جن کے سامنے دیگر احکام نازل ہوئے، تکمیل واکمال دین کا اعلان ہوا، یہ کامل ایمان والے ہوں گے اور تکمیل سے پہلے انتقال پا جانے والے صحابہؓ کامل الایمان نہ ہوں گے، چوں کہ مؤمن بہ کی کمی بیشی واقعی کمالِ ایمان پر اثر انداز نہیں بلکہ اس میں سب برابر ہیں اور سب کامل الایمان ہیں، یہ زیادتی وکمی صرف اعتباری واضافی ہے۔ غرض مؤمن بہ کی کمی زیادتی سے صحابہؓ میں ایمان کے کامل وناقص کا فرق نہیں ہو سکتا، وہ سب کے سب کامل الایمان تھے، اگر فرق ہوسکتا ہے تو کامل واکمل کا ہوسکتا ہے۔

اس کو ایک مثال خارجی سے سمجھتے ہیں کہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے، جس کے جسم میں اعضاء تو سب ہیں لیکن بعض اعضاء کمزور ہیں یا عیب دار ہیں، ٹھیک سے نہیں تو ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ بچہ پیدا نہیں ہوا، اسقاط ہو گیا، یہ مثال ہے کامل کی، دوسری مثال یہ ہے کہ بچہ پیدا ہوا لیکن بعض اعضاء مخلوق نہیں، ان کے صرف اشارات وعلامات سے ہیں تو کہا جائے گا کہ بچہ ناقص الاعضاء پیدا

ہوا۔تیسری مثال یہ کہ بچہ کے سب اعضاء بھی ہیں اور کمزور وباعیب بھی نہیں تو یہ بچہ اکمل کہا جائے گا۔

یا کامل اور اکمل کی یہ مثال لیجئے کہ بچپن کے اعضاء پورے تو ہیں مگر بلوغ کے وقت جواُن میں قوت اور مضبوطی ہوتی ہے، ظاہر ہے، وہ طفولیت میں نہیں ہوتی تو اب اکمل ہے اور ولادت کے وقت کامل تھا۔

اسی طرح حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کامل الایمان، کامل الدین، کامل الاسلام تھے، پہلے بھی دین کامل تھا، اب بھی کامل ہے مگر اب زمانِ محمدؐ میں اکمل ہو گیا، اسی طرح صحابہ ؓ بھی سب کامل الایمان تھے، کوئی ناقص الایمان نہ تھا اور صحابہ کرام ؓ کے بعد اب بھی کامل الایمان موجود ہیں، بس فرق اکمل وکامل کا ہوگا۔

ترجمۃ الباب میں مذکور آیات کی تفسیر

یہ تو بابِ ہذا کا بابِ سابق کے ساتھ ربط کے سلسلے میں کلام ہوا، اس کے بعد ترجمۂ باب میں تین آیات ہیں، ان تینوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے: ارشاد ہے کہ ہم نے ان کو ہدایت میں زیادہ کیا اور ہدایت کے معنی ہیں: **إراءة الطريق، إيصال إلى المطلوب**، اور مطلوب ذاتِ حق اور ذاتِ الٰہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ مطلوب تک پہنچنے کا راستہ چلایا اور چلاتے رہے اور وہ راستہ ایمان ہے تو حاصل یہ ہوا کہ ایمان میں زیادتی عطا فرماتے رہے، اسی کو دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ایمان والوں کے ایمان کو زیادہ فرماتے رہے یعنی جوں جوں مؤمن بہ کا نزول ہوتا رہا، ان پر ایمان ویقین ہوتا رہا، ایک حکم نازل ہوا، اس کو مان لیا پھر دوسرا حکم نازل ہوا، اس کو مان لیا، اسی طرح مانتے رہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کے زمانے میں تسلسل رہا، حتی کہ مؤمن بہ کی تعداد

وکمیت پوری ہوگئی اور مؤمن بہ کا آنا ختم ہوگیااور نزولِ وحی کا سلسلہ موقوف ہوگیا اورنزول ہوتا تھارسول کی طرف تو رسول منتہائے وحی ہوا۔ جب وحی کی انتہا ہوگئی تو لامحالہ منتہائے وحی، مرسل الیہ انبیائی سلسہ ختم اور رسالت ختم کردی گئی اور آں حضرت ﷺ پر رسالت کا خاتمہ ہوگیا اور آپ خاتم الانبیاء والرسل قرار دئے گئے، تیسری آیت میں اسی اتمام واختتام کو بیان فرمایا تو اس طرح یہ تیسری آیت گویا صریح ہے اس بارے میں کہ مؤمن بہ کے اعتبار سے زیادتی کا بیان یہاں مقصود ہے۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر مؤمن بہ کی تعداد میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ دے گا تو ناقص الایمان ہوگا۔ پس مرجیہ کا یہ کہنا کہ ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی، جوں کا توں رہتا ہے، یہ محض باطل اور سراسر غلط ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا، اس پوری تفصیل سے ظاہر اور واضح ہوگیا کہ امام بخاریؒ کا بہ طور تفریع ''فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ'' فرمانا بالکل صحیح اور درست ہے، نیز وضاحت سے ثابت ہوگیا کہ تینوں آیات باہم مرتبط ہیں، ہر آیت ایک ترجمہ ودعوی ہے اور سابق کے لیے دلیل بھی اور اصل ترجمہ ودعوی: ''بَابُ زِيَادَةِ الإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ'' ہے۔

اب اس کے بعد حدیث مسند کے ذریعہ ایمان کی زیادتی وکمی کا اثبات فرما رہے ہیں جس سے بالکل صاف اور صریح طور سے کمی وزیادتی ایمان کی معلوم ہو رہی ہے۔

حدیث الباب کی شرح

ترجمہ حدیث : جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ کہا اور دل میں ایک جَو کے برابر خیر یعنی ایمان ہے، وہ جہنم سے نکل جائے گا، یا نکالا جائے گا اور جس کے دل میں

گیہوں کے برابر ایمان ہے، وہ بھی۔

بس معلوم ہو گیا کہ تصدیق وایمان میں فرق وکمی زیادتی ہوتی ہے، چوں کہ گیہوں جَو سے کم اور چھوٹا ہوتا ہے باعتبار مساحت اور جسامت کے مگر جَو سے وزنی ہوتا ہے اور یہ وزن کی کمی بیشی کانٹے سے معلوم ہو سکتی ہے، ایسا نہیں کہ کوئی ترازو سے تولنے لگے، ہر شئے کے مناسب حال ترازو الگ ہوتی ہے، سونا تولنے لگے لکڑی تولنے کی ترازو سے، بس تل لیا۔ خیر! تو گیہوں کے دانے کے برابر ایمان فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا کہ وہ بھی جہنم سے نکال لیا جائے گا جس کے قلب میں ایک ذرہ برابر ایمان ہو، ذرہ یعنی جزء لایتجزی۔

جملہ معترضہ: دیکھا فلسفہ کو بے کار کہتے ہیں، حالاں کہ فلسفہ کتنی کارآمد چیز ہے ،فلسفہ جاننے والے کو ایک بات سمجھنے کے لیے اشارہ کافی ہو جاتا ہے اور جو فلسفہ سے مناسبت نہیں رکھتا، اس سے نابلد وناواقف ہوتا ہے، اس کو لمبی تقریر بھی ناکافی ہوتی ہے۔

ذَرہ: کے دوسرے معنی سرخ چیونٹی جو کالی چیونٹی سے چھوٹی ہوتی ہے، تیسرے معنی ہیں وہ معمولی اور نہایت معمولی ریزہ جو فضاء میں ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے (۱)، نہیں معلوم وہ سانس کے بل کتنے پیٹ میں چلے جاتے ہیں، شعاعوں سے نظر آتے ہیں، اس قدر بے مقدار ہوتے ہیں، بس جزء لایتجزی ہیں، محسوس بھی ہیں، غیر محسوس بھی۔

تو حدیث شریف میں ایمان کے تین حال بیان فرمائے، تعبیرات حدیثیہ سے ایمان کا تفاوت درجات اور باہمی تزاید وتناقص ظاہر وباہر ہے، شعیرہ، بُرہ،

(۱) والذرة بفتح الذال المعجمة وتشديد الراء واحدة الذر وهي اصغر النمل وقال القاضي عياض الذر النمل الصغير وعن بعض نقلة الاخبار أن الذر الهباء الذي يظهر في شعاع الشمس مثل رؤس الابر. (عمدة القاري: ۱/ ۲۶۰)

ذَرہ واضح الدلالات ہیں (۱) ،جس ترتیب سے اہل ایمان کا ذکر حدیث شریف میں فرمایا ہے، اسی ترتیب سے دخول وخروج ہوگا جیسا کہ مقتضائے عدل ہے۔

اب ایک اشکال ہوتا تھا کہ امام بخاریؒ نے باب منعقد فرمایا ہے زیادت ایمان ونقصان ایمان کا۔حدیث باب اس سے مطابق نہیں ؛اس لیے کہ حدیث شریف میں لفظ خیر ہے، ایمان کا ذکر نہیں، لفظ خیر سے اعمال مراد ہیں ؛اس لیے کہ لفظ خیر کا اطلاق اعمال پر ہوتا ہے ، پس امام بخاریؒ کا مقصد اس حدیث سے جو ایمان کی زیادت اور نقصان کا اثبات تھا، وہ حاصل نہیں ہوا، اس سے تو صرف اعمال کی کمی بیشی ثابت ہوئی تو یہ تو پہلے ہی ثابت کر چکے تھے پھر اس سے کیا حاصل ہوا؟ لہٰذا ترجمۂ باب اور حدیث میں مطابقت نہیں ہوئی۔

اس کا جواب دینے کے لیے امام بخاریؒ نے متابعت پیش فرمائی (۲) ، گویا یوں فرمایا کہ اچھا آپ کو اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے اعتراض کا موقعہ مل گیا، لیجئے! حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت موجود ہے جس میں اسی مضمون کو صراحۃً لفظ ایمان کے ساتھ بیان فرمایا ہے :

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ قَالَ أَبَانُ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ حَدَّثَنَا أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ إِيمَانٍ . مَكَانَ مِنْ خَيْرٍ .

پس معلوم ہوا کہ یہاں حدیث میں لفظ خیر سے ایمان مراد ہے بہ مطابق

(۱) استدل البخاري بهذا الحديث على نقصان الإيمان لأنه يكون لواحدوزن شعيرة وهي أكثر من البرة والبرة أكثر من الذرة فدل على أنه يكون للشخص القائل لا إله إلا الله قدر من الإيمان لا يكون ذلك القدر لقائل آخر.(عمدة القاري: ۱/۲٦۱)

(۲) وفائدة إيراد المصنف له من جهتين إحداهما تصريح قتادة فيه بالتحديث عن أنس ثانيتهما تعبيره في المتن بقوله من إيمان بدل قوله من خير فبين أن المراد بالخير هنا الإيمان.(فتح البارى : ۱/۱۰۵)

قاعدہ الْحَدِيثُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا (۱)، پس عدمِ مطابقت بین الترجمۃ والحدیث کے اعتراض کی گنجائش نہیں۔

اس پر اعتراض ہوا کہ جب یہ بات ہے تو چاہیے تھا کہ حضرت انسؓ کی روایت کو اصل اور اول رکھتے، چوں کہ یہاں اصل مقصود تزاید وتناقص ایمان کا بیان ہے، پھر امام بخاریؒ نے اس اصلی ترتیب کو چھوڑ کر برعکس کیوں اختیار کی؟ یہ تو اصل کو غیر اصل اور غیر اصل کو اصل بنا دینا ہوا، جو قلب موضوع اور نامناسب چیز ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے مگر بات یہ ہے کہ ہشامؒ کی روایت میں گو ایمان کی تصریح نہیں اور ابانؒ والی روایت اس بارے میں تصریح موجود ہے، اس اعتبار سے اولیت اس کو حاصل ہوتی لیکن ہشامؒ چوں کہ ثقاہت میں ابانؒ سے بہت اونچے ہیں؛ اس لیے امام بخاریؒ نے ان کو مقدم کیا ہے، اثقہ اقدم ہوتا ہے بہ نسبت ثقہ کے (۲)۔

رہا اس میں لفظ ایمان کے بہ جائے خیر ہونا جو محتمل ہے دوسرے معنی کو، اس کا تدارک اس طرح ہو گیا کہ متابعۃً دوسری روایت تصریح والی پیش فرما دی۔

دوسری وجہ متابعت کی یہ بھی ہے کہ پہلی روایت قتادہؒ سے عنعنہ کے ساتھ ہے اور قتادہؒ مدلس ہیں اور مدلس کا عنعنہ قابل قبول نہیں ہوتا، تاوقتے کہ سماع کی تصریح ثابت نہ ہو؛ اس لیے امام بخاریؒ نے متابع نقل فرما کر ضعف کو رفع فرما دیا

---

(۱) قَالَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ، يَقُولُ :الْحَدِيثُ إِذَا لَمْ تَجْمَعْ طُرُقَهُ لَمْ تَفْهَمْهُ وَالْحَدِيثُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا.(الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي : ۲/۲۱۲)

(۲) فإن قيل على الأولى لم لم يكتف بطريق أبان السالمة من التدليس ويسوقها موصولة فالجواب أن أبان وإن كان مقبولا لكن هشام أتقن منه وأضبط فجمع المصنف بين المصلحتين والله الموفق.(فتح البارى : ۱/۱۰۵)

اور روایت باب کی تقویت فرمادی تو متابعت کے فوائد ہوئے: تعیین مراد، تصریح سماع، تقویت روایت (١)۔

اب ایک بات اور رہ گئی، وہ یہ کہ پہلے "بَابُ تَفَاضُلِ أَهْلِ الإِيمَانِ فِي الأَعْمَالِ" کے تحت اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت سے آچکی ہے، چناں چہ ابھی جو ورق پلٹ کر اسی کو دیکھا تھا، وہاں تقریر اس کی مفصل، مطول ہو چکی، اب بات اس کے متعلق یہ ہے کہ اس میں صاف طور سے صراحت کے ساتھ "مِنْ إِيمَانٍ" موجود ہے، اعمال کا ذکر نہیں، اسی واسطے عمل کے ذکر کے لیے وہاں امام بخاریؒ کو متابع پیش کرنا پڑا تھا، اور یہاں "بَابُ زِيَادَةِ الإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ" کے تحت حضرت انسؓ کی روایت سے حدیث پیش فرماتے ہیں، اس میں لفظ خیر مذکور ہے اور خیر عمل کو کہتے ہیں اور عمل کے اعتبار سے یہاں کمی زیادتی کا بیان مقصود نہیں بلکہ نفس ایمان کی کمی بیشی کا اثبات مقصود ہے، جس کی مساعدت حدیث مذکور سے نہیں ہوتی، اسی وجہ سے تاویل کی خاطر یہاں بھی متابعت کی ضرورت پیش آئی، سوال یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس ترتیب پر تکلف کیوں اختیار فرمایا؟ حالاں کہ سیدھی اور بلا تکلف صورت یہ تھی کہ پہلے باب "بَابُ تَفَاضُلِ أَهْلِ الإِيمَانِ فِي الأَعْمَالِ" کے تحت اس حدیث انسؓ کو لے آتے کہ لفظ خیر شائع الاطلاق علی العمل اس میں موجود ہے اور یہاں "بَابُ زِيَادَةِ الإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ" کے تحت بہ جائے حضرت انسؓ والی روایت وہ روایت پہلے والی یعنی حضرت ابوسعید خدریؓ کی لے آتے، چوں کہ اس میں "مِنْ إِيمَانٍ" صاف مذکور ہے اور نفس ایمان ہی کی کمی زیادتی کا یہاں

---

(١) وفي ذكره ثلاث فوائد (الأولى) وهي أهمها التنبيه على تصريح قتادة فيه بالتحديث عن أنس وذلك أن قتادة مدلس لا يحتج بعنعته إلخ.(عمدة القاري: ١/١/٢٦١)

اثبات مقصود ہے تو اس ترتیب سے بلا تکلف بلا متابعت دونوں جگہ ترجمہ ابواب اور حدیثوں میں موافقت ومساعدت ہو جاتی پھر اس موجب خلجان ترتیب کو امام بخاریؒ نے کیوں اختیار فرمایا؟۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث کو لے کر اشکال اور اس کا جواب

جواب یہ ہے کہ ظاہری نظر سے تو معترض صاحب کی بات بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن عمق نظری سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امام بخاریؒ کی اختیار کردہ ترتیب میں گو ظاہری خلفشار ہے لیکن جو اس کی اندرونی خوبیاں ہیں، وہ کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں، اصل میں یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی نظر نہایت وسیع اور عمیق ہے، وہ تراجم کے انعقاد میں ذکر کیے جانے والے الفاظ ہی پر نظر محدود نہیں فرماتے بلکہ وہ حدیث کے تمام طرق پر نظر رکھتے ہیں، تب انعقادِ تراجم فرماتے ہیں، چناں چہ انھوں نے دیکھا کہ اگر چہ اس روایت حدیث حضرت ابوسعیدؓ میں ''مِنْ إِيمَانٍ'' فرما رہے ہیں مگر دوسری تفصیلی روایت میں وہی اعمال کا ذکر بھی کرتے ہیں تو یہاں امام کی نظر حضرت ابوسعیدؓ کی اس روایت پر ہے جس کو امام مسلمؒ نے ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے: ''يَقُولُون رَبَّنَا كَانُوا يَصُومُونَ مَعَنَا وَيُصَلُّونَ وَيَحُجُّونَ، فَيُقَالُ لَهُمْ: أَخْرِجُوا مَنْ عَرَفْتُمْ'' کہ اہل جنت داخل جنت ہو کر حق تعالی سے عرض کریں گے کہ ہم اپنے بھائیوں کو یہاں نہیں دیکھ رہے ہیں، اے پروردگار! وہ لوگ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور نماز پڑھتے تھے الخ اس کے بعد علی الترتیب مراتب خیر کا ذکر ہے اور پھر آخر میں ارشاد ہے: ''فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ، فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُوا خَيْرًا قَطُّ قَدْ عَادُوا حُمَمًا'' تو وہ فی الحقیقت اعمال والی ہی روایت ہے، گو ''مِنْ إِيمَانٍ'' کا لفظ ہے، اس لیے

اگراس کو آپ کے خیال کے مطابق یہاں لائے تو مطابقت نہ رہتی، اس لیے جو ترتیب امام بخاریؒ نے اختیار فرمائی ہے، وہی انسب وافق ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں زیر بحث باب میں نفس ایمان کی کمی زیادتی بیان کرنا ہے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ایمان کے الگ الگ درجات ذکر کیے جائیں اور یہ اسی حضرت انسؓ والی حدیث میں بیان فرمائے ہوئے ہیں، برخلاف گذشتہ حدیث ابوسعید خدریؓ کے کہ اس میں صرف ایک جگہ "مِثْقَالُ حَبَّةٍ" ہے، اس کو اگر یہاں لاتے تو مقصود درجاتِ متفاوتہ نفس ایمان ثابت نہ ہوتا، لہٰذا یہی حدیث انسؓ یہاں کے باب "بَابُ زِيَادَةِ الإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ" کے مناسب اور موزوں تھی؛ اس لیے بس لفظ خیر سے نہ گھبرائیے اور اس کی رغبت نہ فرمائیے کہ یہ حدیث وہاں اور وہ حدیث یہاں ہوتی، حضرت امام بخاریؒ کا ذہن وسعت وجامعیت رکھتا ہے، ہمارے اذہان میں وہ وسعت وجامعیت نہیں؛ اس لیے کہ ان کے جیسا تحصیل علم اور ترقی علم کا ذوق وشوق نہیں، اس لیے تحقیق وتفتیش جس سے وسعت وجامعیت آتی ہے، مفقود ہے، پس ایسی صورت میں ہماری رائے اور ہمارا فہم اور فیصلہ وزنی نہ ہوگا، پس ہمارا امام بخاریؒ کی ترتیب مذکور کو نامناسب سمجھنا صحیح نہیں۔

نیز موجودہ ترتیب میں متابعت ہے جس سے لطف اندوزی ہوتی ہے، قندمکرر کے مثل بار بار تلذذ ہوتا ہے، پرلطف اور مزے دار بات بار بار کہنے اور سننے کو جی چاہا کرتا ہے، جیسا کہ محبوب شئے کا بار بار ذکر کیا اور سنا جاتا ہے، خوب کہا ہے: ؎

أَعِدْ ذِكْرَ نَعمانٍ لَنا إنَّ ذِكرَهُ	هُوَ المِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ (۱)

یا یوں کہیے کہ بات چوں کہ اہم ہے، اس لیے تکرار سے اس کی اہمیت اور تاکید مقصود ہے، یا یوں خیال کرنا چاہیے کہ اول مرتبہ اگر کچھ توجہ تام میں خلل رہ کر ضعف فہم کے باعث نہ سمجھا گیا ہو تو اب اچھی طرح سن لو اور ذہن کو حاضر اور توجہ تام کرلو، گویا امام بخاریؒ کو طلبہ پر بہت شفقت اور عنایت ہے کہ چاہتے ہیں

کہ ان کے ذہنوں میں بات اتر جائے۔

بابِ سابق کے ساتھ بابِ ہٰذا کا ربط اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہوگا، نیز مقصد باب بھی نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آ گیا کہ مرجیہ کی تردید اور ان کے باطل مذہب کا ابطال کرتے ہوئے مذہب حق کا احقاق واثبات منظور ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی زیادتی بالکل نہیں ہوتی اور اس کی آڑ لے کر اعمال میں آزادی اور مطلق العنانی اور اتباعِ ھوی کا بازار گرم کرتے ہیں، یہاں ثابت فرمادیا کہ تمھارا یہ کہنا کہ ایمان میں کمی زیادتی کی گنجائش نہیں، محض باطل ہے، ایمان میں کمی زیادتی کا ہونا خود حدیث شریف میں مصرح ہے۔

باب میں دین وایمان کی تکمیل کا بھی ذکر فرمایا ہے، پس جب ایمان مکمل ہو چکا تو ہم کو چاہیے کہ دین کی باتوں میں سے کسی چیز کو کم نہ کریں، سب باتوں کو اختیار کر کے اپنے دین کو کامل کریں۔

اب غور یہ کرنا ہے کہ کیا دین وایمان بدون پڑھے لکھے اور بدون پوچھے گچھے کامل ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ دین وایمان کی تکمیل تحصیل دین پر ہی موقوف ہے، تعلیم وتعلم کے بغیر کام نہیں چل سکتا ہے تو ضروری ہے کہ پڑھے اور سنے۔

خطاب بہ طلبہ

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ باہر رہنے سے یہاں رہنا اچھا ہی ہے، اگرچہ شرارت بھی کرے مگر یہاں سے بھاگے نہیں، کسی طرح چہار دیواری میں پڑا رہے، اگرچہ خود شرارت بری چیز ہے، میں اس کے خلاف ہی ہوں مگر پھر بھی پڑا رہے، کھانا تو یہاں بند نہیں ہوتا تو پڑا رہنا ضروری ہے، ایک نہ ایک دن ان شاء اللہ تعالی یہ پڑا رہنا رنگ لا کر رہے گا، بہر حال! میں یہ کہہ رہا تھا کہ پڑے رہیں اور ایک بات اور ذمہ کرلیں، خاص کر دورہ والے کہ دست درازی نہ کریں، لڑیں

نہیں۔ اس کا میں دشمن ہوں؛ اس لیے کہ یہ دست درازی اور لڑائی حماقت ہے، جہل ہی نہیں بلکہ شیطانیت ہے، نام کی تو کم سے کم لاج رکھنی چاہیے کہ طالب علموں میں نام ہے، لوگ کہیں گے کہ یہ بخاری شریف پڑھنے والے اور دورہ کے طالب علم ہیں، ان کو کیا ہوگیا، کیا دماغ کا دورہ پڑ گیا، چور، فتین، شریر بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ، میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور کہاں کہاں سے جمع ہو گئے۔ ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ مدرسہ میں دور سے پڑھنے آتے ہیں، طالب علم ہیں (اگر چہ طالب علمی برائے نام ہے) تو ایسی بات کرنا کہ باہر پہنچے اور عوام میں پھیلے، یہ بات نام کے طالب علم کے بھی خلاف ہے۔ نام کی لاج رکھو، زبان درازی مجھے منظور، اور چاہے حقیقت میں طالب علم نہ ہو، صورۃً ہی ہو، اگر چہ کبھی چوری کرنے کی غلطی بھی ہوگئی کہ چوری تو گھر میں بھی ہو جاتی ہے مگر توبہ کر کے باز رہے۔

حضرت مسیح الامتؒ کے بچپن کا ایک واقعہ

اس پر اپنا ایک بچپن کا واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ تیرنے اور ندی و نہر پر جا کر نہانے کا شوق ہوا، چناں چہ پانی میں گھس گئے اور پائجامہ ہاتھ میں لے لیا کہ دھل جائے گا مگر تیرنے میں خیال نہ رہا، وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گم ہو گیا۔ اب بڑا ڈر ہوا کہ والد صاحب غصہ ہوں گے، پہلے باپوں کا غصہ بڑا سخت اور نہایت زیادہ ہوتا تھا، اس وقت چھوٹے برداشت کر لیتے تھے، آج کل بڑوں نے غصہ کم کر دیا، پھر بھی افسوس کہ چھوٹے ذرا سی تیزی بھی برداشت نہیں کرتے، ہاں تو بہت ڈر رہا اور چپکے چپکے گھر آئے اور موقعہ پا کر نظر بچا کر ایک عورت کی آڑ لے کر گھر میں داخل ہو کر اور اپنے بکس سے پائجامہ نکال کر پہن لیا اور ظاہر نہیں ہونے

(۱) یہ مہیار بن مردویہ نامی شاعر کے قصیدے کا ایک شعر ہے: فهذا البيت من قصيدة لمهيار بن مردويه أبي الحسن الديلمي، مطلعها: يقولون يوم البين عينك تدمع، دعوا مقلة تدري غدا من تودع. (فتاوى الشبكة الإسلامية: ۱۳۲۹/۷)

دیا۔ یہ ڈر بڑی اچھی چیز ہے، بہت سے بے باکیوں اور اس پر متفرع ہونے والی خرابیوں اور تباہیوں سے بچت ہو جاتی ہے۔

بات چوری پر چل رہی تھی تو یوں سمجھ لیا کرو کہ چوری تو گھر بھی ہو جاتی ہے اور یوں خیال کرلیا کرو، جیسے وہ چیز خود گم ہوگئی یا یہ کہ کپڑا دھوبی کے یہاں رہ گیا، جیسے بندہ نے پانچ نوٹ سوسو کے تڑانے کے لیے بھیجے لیکن وہ واپس آگئے کہ چلتے نہیں ،بس بندہ نے دل کو سمجھالیا، دل کو سمجھانا ہی کیا؟ خیال کرلیا کہ چوہے کھا گئے۔

یہ کیا ذرا سی بات ہو جانے پر اچھل پڑے، آپے سے باہر ہو گئے، سنبھالے نہیں سنبھلتے، کچھ بھی صبر و ہمت سے کام نہیں لیتے، وسعت قلب نہیں، تنگ دلی اور بخل ہے، بڑے کنجوس مکھی چوس ہو، بز دل ہو، سخاوت نہیں، میرا تو عقیدہ ہے کہ جو چیز چوری ہوگئی، وہ گم نہیں ہوئی، ضائع نہیں گئی بلکہ محفوظ اور جمع ہے، پھر چوری سے تمہارا کیا نقصان ہے، آخر تم بھی کھاتے پیتے اور استعمال کر کے اس چیز کو ختم کر دیتے یا رکھے رہتے تو صندوق وغیرہ میں جمع رہنے سے اللہ پاک کے یہاں جمع رہنا بہتر اور افضل ہے۔ پھر مسیح اللہ کا دم چاہیے، تمھارا جو جائے، اس سے لے لو، دل کی بھڑاس نکالنا ہو، نکال لو! کہہ سن لو! مگر ایسی صورت نہ کرو کہ بات باہر جائے بلکہ مہتمم تک بھی بات نہ جائے، دینی اداروں میں رہتے ہو، اس کا خیال رکھو، پڑھو بھی نہیں تو سنتے رہو، جب مؤمن بہ معلوم ومسموع کروگے، کبھی نہ کبھی اکمل درجہ حاصل کرلوگے۔ اگر چہ بعض وہ ہیں کہ طالب ہی نہیں، خدا نہ کرے۔ خیر تب بھی فائدہ سے خالی نہیں، باہر رہنے سے بہر حال یہاں فائدہ ہی ہے، بس بھاگو مت، دست درازی نہ کرو اور نہ دست درازی دوسروں میں ہونے دو، بس کامیاب ہو، پاس ہو ہی جاؤ گے، فیل یہاں کوئی ہوتا نہیں۔ جو بیان ہو گیا، اس کو عمل میں لانے کی سعی و کوشش ہو۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

❁ ❁ ❁

الدرس التاسع والأربعون

۴۳: حَدَّثَنَا الحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ حَدَّثَنَا أَبُو العُمَيْسِ، أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ أَنَّ رَجُلًا، مِنَ اليَهُودِ قَالَ لَهُ:يَا أَمِيرَ المُؤْمِنِينَ، آيَةٌ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرَءُونَهَا، لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ اليَهُودِ نَزَلَتْ، لاَتَّخَذْنَا ذَلِكَ اليَوْمَ عِيدًا. قَالَ:أَيُّ آيَةٍ؟ قَالَ:{اليَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِينًا} [المائدة:۳] قَالَ عُمَرُ: قَدْ عَرَفْنَا ذَلِكَ اليَوْمَ، وَالمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ

اس حدیث شریف کی تلاوت فرما کر اس طرح شروع فرمایا کہ یہ اسی باب کی دوسری حدیث ہے جس کے تحت تین آیتیں ہیں کہ جن میں سے ہر ایک اپنے ماقبل کے لیے علت اور دلیل ہے اور ایک حدیث ہے، جس کی تقریر کل ہو چکی۔ آج اسی باب کی یہ دوسری حدیث آپ کے سامنے ہے۔

حدیث کا ترجمہ مع مفہوم

اس کے بعد ترجمہ فرمایا: ایک یہودی نے حضرت عمر امیر المؤمنین رضی اللہ تعالی عنہ سے کہا کہ آپ جس کتاب کو تلاوت کرتے ہیں، اس میں ایک آیت بڑی عجیب وغریب ہے مگر آپ لوگوں کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عظمت وحقیقت سے واقف نہیں، اگر ہم پر وہ نازل ہوتی تو ہم (نزول آیت پر اتنی خوشی مناتے، اتنی قدر کرتے) اس دن کو عید بنا لیتے (اور آپ کو اس سے کوئی خوشی نہیں، اس سے غافل ہیں) آپ نے فرمایا کہ وہ کون سی آیت ہے جو پڑوسی کو

معلوم ہے اور گھر والا اس سے محروم ہے؟ (اور پھر ہم جیسا غافل ہو، نہایت بعید اور ابعد ترین ہے) اس نے کہا کہ یہ آیت ہے کہ فرماتے ہیں کہ آج ہم نے دین شرائع، احکام کو کامل کر دیا اور کامل ہی پر بس نہیں بلکہ تام کر دیا اور یہی نہیں بلکہ جو منتہائے اکمال واتمام ہے، وہ بھی ہو گیا کہ میں راضی ہو گیا، میں نے تمھارے دین کو اسلام بنا کر پسند کر لیا،... آگے تک ترجمہ فرما کر ختم فرمایا۔

مذکور فی الحدیث آیتِ کریمہ پر یہودیوں کا غبطہ یا حسد؟

یہ تو بعد کو عرض ہوگا کہ حدیث ہذا کو باب وترجمہ سے کیا مناسبت ہے، اس سے قبل ضروری کچھ اور ہے، اس کو بیان کرنا ہے، اس آیت میں جو کچھ ارشادِ باری تعالی ہے، وہ تین چیزوں کا مجموعہ ہے، اس سے بھی قبل یہ بات سمجھ لیجیے کہ حدیث میں یہودی کی بات کا جو جواب مذکور ہے، وہ مطابق ہے تو کیسے ہے؟ اس کی مطابقت میں غور کرنا ہے، سو وہ کہہ رہا ہے کہ آپ کی کتاب میں ایک آیت عجیب وغریب ہے، ایسی جامعیت کی اور کوئی آیت نہیں، ایسی آیت ہماری کتاب توریت میں نہیں، نہ اتنی خوشی کی، نہ جامعیت کی، نہ منتہائے مقصودِ انسان کو بتلانے والی۔ جیسی کہ تمھاری کتاب میں ہے کہ نہایت پسندیدہ، خوش کن، منتہائے زندگی، منتہائے جنت، منتہائے مقاصد دنیا وآخرت، سب اس میں مذکور ہیں اور وہ آیت یہ ہے، اس پر ہمیں غبطہ ہے، حسد تو کیا کریں، میں الفاظ بچے بچے کہہ رہا ہوں، ورنہ حسد بھی ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کامل اور تام کر دیا، جس سے دلالۃً معلوم ہوتا ہے کہ تمام ادیانِ سابقہ (غور کے ساتھ سنیں) کے لیے یہ دین ناسخ ہے؛ اس لیے کہ اس دین میں نہایت جامعیت ہے، تمام خوبیاں اور کمالات اسی میں منحصر ہیں کہ جملہ ادیانِ سابقہ بھی اس میں مندرج ہیں مع شئے زائد کہ اب تک جو دین آتا تھا، وہ کمال کے ساتھ تو ہوتا تھا مگر ان تمام

ادیان کے کمالات میں تمامیت نہ تھی تو یہاں آیت میں اتمام کے عنوان کے اضافہ سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل اتمامیت کا پہلو باقی تھا، اس کو کامل کر دیا، اب یہ دین ایسی حیثیت ونوعیت کے ساتھ ہے کہ قیامت تک کے تمام زمانوں اور تمام مکانوں اور انقلابات وحوادثات والے انسانوں کے لیے زندگی کے تمامی شعبہ جات کے بہترین انداز اور اعلی انسانیت پر رہ کر زندگی گذارنے کے تمام دستور وہدایات وتعلیمات اس میں موجود ہیں، اجمالاً یا تفصیلاً، اصولاً یا فروعاً کلیاً یا جزئیاً اور اس نوعیت وانداز کے ساتھ اور ایسے جمال وکمال کے ساتھ ادیانِ سابقہ میں کوئی نہیں۔ اس لیے اب کسی پہلے دین پر جمے رہنا بالکل غلط ہے، کوئی حق نہیں، معلوم ہوا کہ یہ آیت نہایت جامع اور جملہ ادیانِ سابقہ کے لیے ناسخ ہے۔

کامل اور تام میں فرق

اب کامل اور تام میں فرق سمجھیے۔کل عرض کیا تھا کہ نومولود کے اعضاء سب ہوں: ہاتھ، پیر، پیٹ، پیٹھ، سر، دھڑ، کہنی، پسلی، ناخن وناک، منہ وغیرہ تو یہ کامل الاعضاء تو ہے مگر تام الاعضاء نہیں؛ ہاں آیندہ ایک زمانہ میں جا کر تدریجاً اس حال پر پہنچ جائے کہ نمو کی استعداد اپنی انتہا کو پہنچ کر ختم ہو جائے، نشو کی گنجائش ختم ہو جائے تو اب نشو ونما، اضافہ، ترقی تمامیت کو پہنچ گئی، اب کہا جائے گا کہ یہ تام الاعضاء ہے۔ مثلاً زندگی بخیر رہی تو چار سال بعد میرا ناپ شدہ میرا ہاتھ ایک بالشت تو کیا، دو اُنگل بھی نہ بڑھے گا تو کمال تو پہلے بھی تھا، اب تمامیت بھی ہو چکی تو اکمال الگ ہے، اتمام اور چیز ہے۔

ایک اور بات خیال میں آئی: جب جس جسم عنصری میں اکمال واتمام دکھا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر جسمی، غیر عنصری میں اکمال واتمام نہ ہو، ضروری ہے کہ اس میں بھی یہ درجات ہوں، پس جیسے جسم میں نشو ونما ہوتا ہے، اسی طرح

روح میں بھی ہوتا ہے اور جیسے جسم کا نشو ونما اتمام تک پہنچتا ہے، اسی طرح روح میں بھی تسلیم ''قالوا بلی'' ہو کر ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' رکھا تھا، یہ اس کی ابتداء اور آغاز ہوا اور جیسے دنیا میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ روح اور اس کی غذا میں کمال آیا تو اس کا اتمام اور تمامیت بھی ضروری ہوا کہ جو شرائع ہیں، ان کے لیے اتمامیت اور انتہاء ہو کر پھر کوئی درجہ آگے بڑھنے کا باقی نہ رہے تو اسلام میں (جو کہ دین الٰہی اور روح کی تربیت کا اب ایک واحد ذریعہ ہے) جیسے اکمال کا درجہ ہوا، تمام کا بھی ہوا، حاصل یہ کہ اب دین حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوتے ہوئے اکمال کو بھی پہنچ گیا اور اتمام کو بھی، اب فروعی، جزئیاتی، و تفصیلی کوئی چیز اسلام میں اضافہ کرنے کے قابل نہیں اور اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں، ہر اعتبار سے تمامیت کو پہنچ چکا، جیسے کتاب لکھتے لکھتے پوری ہو کر کمال کو پہنچ گئی، حتی کہ مثلاً میراث بعد الموت کا بھی بیان آچکا، اب کیا رہ گیا؟ کچھ نہیں، بس تمت بالخیر کی مہر سے ختم کر دی گئی۔

بات یہودی کے اس کہنے پر چلی تھی کہ یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے کہا تھا کہ ایسی آیات آپ کی کتاب میں ہے کہ اگر ہمارے اوپر نازل ہوتی تو اتنی قدر کرتے، اس قدر خوشی مناتے کہ اس یومِ نزول کو عید ہی منا لیتے، گویا یہودی غبطہ کر رہا ہے اور بہ زبانِ حال کہہ رہا ہے کہ مجھے رشک کیوں نہ آئے؟ یہ چیز ہی ایسی ہے، دوسرے یہ کہ یہ آیت سب کا میزانیہ بھی ہے یعنی تمام قرآن پاک کی سور و آیات کا، اب تمھیں اپنی پوری زندگی کے کسی شعبہ کے واسطے کسی بھی دوسری کتاب سے مدد لینے کی ضرورت مطلق باقی نہیں رہی، تیسری بات یہ کہ جو منتہائے اکمال و اتمام ہے، وہ بھی تم کو حاصل ہو گیا، چنانچہ اس کو مقدر کر دیا گیا جو کہ وہ رضائے الٰہی ہے، فرما دیا کہ میں راضی ہو گیا۔

حضرت سلیمانؑ کی بے مثال حکومت بہ طور معجزہ تھی

یہ رضائے اِلٰہی وہ چیز ہے کہ جس کے مقابلہ کھانا، پینا جو مدارِ حیاتِ جسد عنصری ہے، سب ہیچ ہے اور دنیا کی اعلی سے اعلی نعمت اورترقی وعزت، حتی کہ بادشاہت اور باشاہت بھی حضرت سلیمانؑ کی حکومت ہی کیوں نہ ہو، سب ہیچ در ہیچ ہے، چناں چہ حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی حکومت باوجود یہ کہ اتنی عظیم الشان تھی کہ تمام مابین السماء والارض ہواؤں، فضاؤں جانوروں پر بلکہ تحت الارض، فوق السماء تونہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ ان کی حکومت ملائکہ اور جنت پر نہ تھی، ہاں! تحت الارض ضرور تھی کہ تمام حشرات الارض اور پرندوں پرحتی کہ پانی اوراس کے جانوروں پر، چیونٹیوں پرتھی، خیال فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا حکومت ہوسکتی ہے، وجہ یہ تھی کہ یہ ملک گیری نہ تھی بلکہ معجزۃً تھی۔ ان کے زمانہ میں اہل زمانہ کے لیے نبوت کی دلیل تھی، یہ بزبان حال کہہ رہی تھی کہ اے انسانو! تم اپنی حکمت اور عقلمندی، تدبیر وہنر، یونانی اور سائنسی پوری ایڑی سے چوٹی تک زور لگالو، ایسی حکومت حاصل نہیں کرسکتے، جب یہ بات ہےتو معلوم ہوا کہ یہ انسانی طاقت اورقوت کا ثمرہ ونتیجہ مافوق الطاقۃ البشریۃ ہےتو ان کوحق تعالی کی خاص عطااورقوت حاصل ہے، پس یہ نبیٔ برحق ہیں، ان کا نبی ہونا تسلیم ویقین کرو۔

رضائے اِلٰہی کی اہمیت اور قدر و قیمت

تو ایسی عالی شان اور بےنظیر حکومت کے باوجود حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام رضائے اِلٰہی کے بغیر اس حکومت پر راضی نہ ہوئے، آپ حضرات کو یاد ہے یا نہیں؟ ع : تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو مجھے ہے یاد ذرا ذرا۔ الحمدللہ تعالی! مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ والسلام نگرانی لشکر میں

مشغول تھے کہ عصر کا وقت نکل گیا، سورج غروب ہو گیا، جب ادھر توجہ ہوئی تو ڈر گئے، گھبرا گئے، حق تعالیٰ کی ناراضگی کا اندیشہ ہو گیا، تائب ہوئے اور کفارہ ادا کیا: حکم فرمادیا کہ سب گھوڑوں کی کونچیں کاٹ دو، خدا کی رضاء کے لیے سب کو قربان کر دیا اور معافی چاہی: اے اللہ! معاف فرمادیجئے۔ معلوم ہوا کہ رضائے الٰہی اگر نہ ہو تو لاکھوں حکومتیں بھی سراسر ذلت ونکبت ہی ہیں۔

بات اس پر چلی تھی کہ یہودی کہتا ہے کہ منتہائے زندگی رضائے الٰہی تم کو دے دی اور وہ تم سے راضی ہو گیا، تم اس سے، رضاء وہ چیز ہے کہ رضا نہ ہو اور جنت ہو تو منظور نہیں اور دوزخ ہو، رضائے الٰہی کے ساتھ ہو تو منظور ہے۔ گھبرائیں نہیں، ذرا عقل سے کام لیجئے! یہ تصور نہ لائے کہ دوزخ میں جلنا ہوگا۔ نہیں بات یہ ہے کہ دوزخ بھی اس کے قبضے میں ہے۔ جس ذات نے نارِ ابراہیم کو گل زار بنا دیا، وہ نارِ جہنم کو بھی گل زار بنا سکتے ہیں، پس وہ دل اور عقل وسمجھ بے صحت اور بیمار ہیں جو رضائے الٰہی سے بے التفات ہو کر دوسری کسی بھی دولت ونعمت پر قناعت کر بیٹھیں یا اس کو اچھی چیز سمجھیں، دیکھئے فرشتے دوزخ میں ہیں، کبھی بھی ان کو خیال نہیں آتا کہ ہم جنت میں ہوتے یا ہمارا تبادلہ ہو جاتا، اس کا ان کو وہم وخیال بھی نہیں آتا؛ کیوں کہ رضائے الٰہی پر ان کی نظر ہے، وہی مقصود ہے، جو کہ ان کو حاصل ہے۔

ع : با تو دوزخ جنت است اے دل ربا(۱)۔

اس کو میں تفصیل سے بیان کر رہا اور پھیلا رہا ہوں، شاید کہیں وعظ کہنا آجائے تو یہ کام آئے۔

(مولوی صاحب! سو رہے ہیں۔ یہ کیا نیند کی جگہ ہے یا درس گاہیں ہیں؟ نیند ایسی آرہی ہے، جیسے کہ پوری رات شب بیداری کی ہو، حالاں کہ سوئے رہے ہوں گے، جیسے کل پونے بارہ بجے بعض کو دیکھا، رسالہ ''شمع'' مطالعہ

(۱) اے دل ربا تیرے ساتھ دوزخ (بھی) جنت ہے۔

فرما رہے تھے)

تو یہ رضائے الٰہی اکمال واتمام پر متفرع ہے۔ جو یہاں کی زندگی میں اسلام کو اکمال واتمام کے ساتھ حاصل کرے گا اور حاصل رکھے گا تو اس کے لیے باری تعالی کے رضوان اور رضاء کا پیغام ہوگا۔

یہودی کہتا ہے کہ اس کو ہم سالگرہ بنالیتے، بھلا اس سے بڑی دولت اور کیا ہوسکتی ہے؟ پھر اس پر خوش نہ ہوں، خوشی ومسرت کا اظہار کر کے اس کو عید نہ بنالیں، جائے تعجب ہے! ہم پر یہ انعام ہوتا تو ہم تو ضرور عید بنالیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا جواب یہ ہے کہ ہوں! ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنی طرف سے نئی چیز اختیار کریں؟ ضرورت تو جب ہوتی، جب کہ بنا ہوا نہ ملے، ہمیں تو بنی بنائی عید سعید اور بنا بنایا دن مل گیا، تمھارا یہ خیال (کہ ہمیں اس کی قدر نہیں، اس کی عظمت سے واقف نہیں) بالکل غلط ہے، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے، جہاں یہ آیت نازل ہوئی، وہ جگہ بھی معلوم اور وقت بھی معلوم ہے، ہم نے اس کو اچھی طرح جزئی جزئی حیثیت سے جان لیا، کب اور کہاں اور کس کیفیت سے نزول ہوا، سب معلوم ہے، زمان، مکان کیف سب ہمارے علم میں ہے اور ہمیں کیسے نہ معلوم ہو؟ ہم تو گھر کے بھیدی ہیں۔ سنیے! عرفہ مکان تھا، جمعہ دن تھا اور آپ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کھڑے تھے۔

یہودی کے اشکال اور حضرت عمرؓ کے جواب کے درمیان عدمِ مطابقت کا اشکال اور جواب

یہاں حضراتِ شراح فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی بات یہودی کی بات کے مطلب اور اس کے مطابق نہیں، چوں کہ وہ دن کے متعلق سوال نہیں کر رہا، وہ تو یہ

کہتا ہے کہ ہم عید بنالیتے، جواب تب مطابق تھا کہ فرماتے کہ ہم نے اس کو عید بنالیا تو سوال عید بنانے کا اور جواب دن ووقت کی تعیین کا، لہٰذا مطابق نہیں ہوا۔

یہ بات محض سرسری معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ غور کرنے سے بات بالکل ظاہر ہوجاتی ہے کہ حضرت امام بخاریؒ کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ ہر جگہ ایسی ترتیب قائم فرماتے ہیں کہ طریق استنباط اور سلیقۂ اجتہاد سکھاتے ہیں، اس لیے یہاں مبہم ومجمل روایت لائے، اس موقعہ کی جو تفصیلی روایت تھی، اس کو نہیں لائے، جیسا کہ ترمذی شریف میں ہے کہ یوں فرمایا حضرت ابن عباسؓ نے: اس کا دن یوم عرفہ یوم جمعہ ہے، فَإِنَّهَا نَزَلَتْ فِي يَوْمِ عِيدَيْنِ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ، وَيَوْمِ عَرَفَةَ (۱)۔

گویا یوں فرماتے ہیں کہ لکیر کے فقیر نہ بننا، جیسے غیر مقلد ہوئے ہیں، ہم تم کو ذوق پیدا کراتے ہیں اور استنباط اور اجتہاد کا سلیقہ پیدا ہونے کا موقعہ دیتے ہیں، ایسی گول اور مجمل روایت کے لانے سے یہی غرض ہے کہ تمھیں غور وفکر کرنا پڑے اور شدہ شدہ فکرِ صحیح کام کرنے لگے، جب فکر وتجسس اور تلاش کروگے تو پالوگے کہ جواب مطابق ہے، دلالۃً نہیں تو التزاماً ہے کہ جواب میں یوم عرفہ اور یوم جمعہ کا ذکر ہے جو کہ فضیلت کے دن ہیں، رحمتوں اور برکتوں سے بھی بھرپور ہیں، چناں چہ پورے سال میں یومِ عرفہ اور یومِ جمعہ کو جو فضیلت حاصل ہے، وہ اور کسی کو نہیں۔ جیسے تمام مہینوں میں ماہِ رمضان المبارک افضل اور اعلیٰ واشرف ہے، چناں چہ مثل رمضان کے یوم جمعہ کو جو شخص مرجائے، اس کا حساب کتاب معاف ہے (۲) اور یومِ عرفہ میں جس شخص کا انتقال ہوجائے، وہ بھی

(۱) سنن الترمذی، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ الْمَائِدَةِ، رقم الحديث: ۳۰۴۴.

(۲) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رضی الله تعالی عنهما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوتُ يَوْمَ الجُمُعَةِ أَوْ لَيْلَةَ الجُمُعَةِ إِلاَّ وَقَاهُ اللهُ فِتْنَةَ القَبْرِ. (سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْجَنَائِزِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، رقم الحديث: ۱۰۷۴)

گناہوں سے پاک کر دیا جاتا ہے، مقبول ہوتا ہے، ذکر اور دعاء، یادِ الٰہی میں مصروفیت کا مقام ہے، یوم جمعہ میں اجتماع خاص ہوتا ہے اور تمھاری عیدوں میں اگرچہ کھیل تماشے ہوتے ہیں مگر ہماری عید میں یہی ہوتا ہے کہ عباد،ت، ذکر، دعا، استغفار، مغفرت کی کثرت اور اس پر انوار و برکات کا نزول۔

جمعہ کی رونقیں

اس پر ایک بات یاد آئی کہ میری بہن جو ابھی پاکستان میں ہیں، ایک مرتبہ کہنے لگیں کہ بھائی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جمعہ کے دن جو مردوں کے چہروں پر ایک بہار اور رونق ہوتی ہے اور دنوں میں یہ بات نہیں ہوتی، میں نے عرض کیا اور بتلایا کہ جمعہ مردوں کی ہفتہ واری روحانی پیٹھ ہے، جس طرح پیٹھ کے روز لوگوں کو نئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں اور ایک چہل پہل سی ہوتی ہے اور مادی چیزوں کی ایک رونق اور بہار رہوتی ہے، مسجد میں جو روحانی بازار ہے جماعت کے ساتھ نماز ادا ہوتی ہے اور نماز سے پہلے خطبہ ادا کیا جاتا ہے جنگل میں ادا نہیں ہوتا، اگرچہ لاکھوں کا مجمع ہو، ہماری عیدیں کھیل، تماشوں اور لغو مشغلوں سے مبرا ہیں، ہماری خوشیاں منانا بھی عبادات اور مذہبی رنگ کے ساتھ رنگین ہوتا ہے، چناں چہ حکم ہے کہ کوئی گھر خالی نہ رہے کہ بچے خوشیاں نہ منا رہے ہوں، دوسروں کے ساتھ یک جہتی، ہم دردی، تعاون ہو، خوب کھانا پینا ہو، تین دن تک روزہ رکھنا عید الاضحیٰ کے موقعہ پر منع فرما دیا گیا، گوشت کھاؤ، ملنا جلنا مصافحہ، معانقہ سے اظہار محبت کرو، یہاں کیا عیدیں ہیں؟ جمعات میں دارالاسلام والمسلمین میں دیکھنا چاہیے، کیا عجیب غریب چہل پہل ہوتی ہے، ہم نے بیت اللہ حرم شریف میں یہ منظر دیکھا ہے مگر فقیروں کی عادت ہے کہ ہر جگہ بعد میں ہی نمازیں شامل ہوتے ہیں، تاہم اس قدر ریل پیل ہوتی ہے کہ جگہ ملنا مشکل ہوتا ہے، جب بھی جُوں توں

کر کے میں تو بیت اللہ شریف میں آگے چلا گیا، دو دفعہ جمعہ بھی دروازہ پر رہا، غرض دار المسلمین میں خواہ داڑھی مونچھ نہ ہو، اس معنی میں تو زنانہ ہیں مگر ویسے کاروں پر، کار اس قدر ہجوم ہوتا ہے نمازیوں کا کہ مسجدیں اوپر اور نیچے سے لبریز ہوتی ہیں، ٹوپیاں سر پر نہیں ہوتیں، مسجدوں میں ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں بروقت ان ہی کو استعمال کیا اور وہیں رکھ دیں، بات دور پہنچ گئی۔

یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ گویا ہمیں تو عیدیں بنی بنائی مل گئیں، اب اپنی طرف سے سے نئی ایجاد کی کیا ضرورت باقی رہ گئی؟ تم نے اپنے یہاں کی عید نہ دیکھ کر ہمارے اوپر اعتراض کر دیا اور سمجھ لیا کہ ہمیں اس سے غفلت ہے، اس کی خوشی اور قدر دانی کا اظہار نہیں کر رہے ہیں، سو تمہارا یہ سمجھنا غلط ہے، ہمارے یہاں جمعہ عید ہفتہ واری ہے اور عرفہ کا زبردست اجتماع اور عبادات اذکار و ادعیہ سے لبریز ہے، وہ بھی عید، یہ بھی مستقل عید(۱)۔

عرفہ کو عرفات بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام اور حضرت حواء رضی اللہ تعالی عنہا کی جنت سے دنیا میں ہبوط کے بعد آپس میں پہچان ہوئی تھی (۲)، ایک نے دوسرے کو پہچانا تھا اور ہبوط

---

(۱) وقول عمر رضي الله عنه: (قَدْ عَرَفْنَا ذَلِكَ اليَوْمَ وَالْمَكَانَ الذِي نَزَلَتْ فِيهِ). معناه: أنا لم نهمل هذا، ولا خفي علينا زمن نزولها ومكانها، ولا تركنا تعظيم ذَلِك اليوم والمكان: أما المكان وهو عرفات فهو معظم (الحج) الذي هو أحد أركان الإسلام. وأما الزمان فيوم الجمعة ويوم عرفة، وهو يوم اجتمع فيه فضلان وشرفان، ومعلوم تعظيمنا لكل واحد منهما، فإذا اجتمعا زاد التعظيم، فقد اتخذنا ذَلِك اليوم عيدًا وأي عيد، فعظمناه وعظمنا مكان النزول. (التوضيح لشرح الجامع الصحيح لابن الملقن رحمه الله: ۳/ ۱۲۹)

(۲) وقيل: للتعارف فيه بين آدم وحواء. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۵/ ۱۷۹۹)

حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کا سراندیپ میں ہوا تھا(۱)۔ پس ہندوستان ہمارا آبائی اور قدیم وطن ہے، ہندو خواہ مخواہ اس کو اپنا کہتے ہیں، ہمارے باوا ہندوستان میں آسمان سے تشریف لائے، یہ آپ کی جائے نزول اور آپ کا وطن بنا، آپ کی پھر بہت سی اولاد ہوئی، ایک صاحب زادے کا نام ہند بھی تھا، اس سے اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ ہندوستان ہمارا مسلمانوں کا ملک و وطن ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے قبضہ سے نکال دیا نکل گیا تو جنت ہماری، دنیا ہماری، ہندوستان ہمارا، ساری دنیا ہمارے طفیل سے کھاتی ہے، جس دن ہم نہ ہوں گے، سب ختم ہو جائیں گے، کوئی باقی نہ رہے گا۔

عرفات ایک ایسی جگہ ہے جو معظم و محترم و متبرک ہے، زندگی کا موقوف علیہ بنا دیا گیا۔ چوں کہ حج کا موقوف علیہ ہے اور وہاں جا کر غیر اختیاری طریقہ سے قبولیت آجاتی ہے، بس کسی طرح وہاں پہنچ جائے اور قبولیت ورضا ہی مقصودِ زندگی ہے تو ثابت ہو گیا کہ یہ زندگی کا موقوف علیہ ہے یعنی مقصد زندگی رضائے الٰہی وہاں حاصل ہو جاتی ہے، بیت اللہ شریف سے قریب ہے اور قریب شئے بحکم شئے ہوتی ہے، وہاں دھوپ میں کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں، تلبیہ اور استغفار کی کثرت ہوتی ہے، یہ عرفات میں وقوف نویں ذی الحجہ کو ہوتا ہے، اس سے اگلے دن متصل قربانی کا دن آتا ہے، عصر کے بعد کا وقت رات میں شمار اور رات اگلے دن میں شمار ہے تو اس طرح زمان و مکان مقرب کا قرب عرفہ و عرفات کو حاصل ہے۔

تو گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ دو دن یہ اور عین متصل بس، بنی بنائی عید ہم کو دی گئی ہے تو یہ سب ایام خوشی کے ہیں تم تو ایک ہی دن کی عید کے لیے کہتے ہو، ہماری یہ کئی دنوں کی عید مسلسل ہے اور نہایت پاکیزگی کے

---

(۱) ولما هبطوا وقع آدم بأرض الهند على جبل سرنديب. (روح البيان: ۱/۱۱۱، فی تفسیر قوله تعالى: فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ)

ساتھ پر لطف اور پر نور و برکات، برخلاف تمہاری عیدوں کے، پس اگر تم پر ایسی آیت نازل بھی ہوتی تو کیا خاک قدر کرتے، جو باتیں بناتے ہو۔ غرض آیتِ اکمال سے نسخ ادیانِ سابقہ معلوم ہو گیا، اب کوئی نئی چیز نکال کر تراش کر دین کے نام سے اس کو اختیار کرنا بد دینی ہے، اس لیے حدیث شریف میں ہے: ''كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّار''(۱)۔

مٹھائی والا ذکرِ رسول

پس ذکرِ رسول فی نفسہ باعث برکت اور مستحسن اور ذی فضیلت چیز ہے لیکن اس میں جو مٹھائی کی قید لگا رکھی ہے اور اس کے بغیر ذکرِ رسول ہوتا ہی نہیں، اسی طرح یہ کہ پڑھنے والا کچھ اشعار پڑھے، اس کو ہدیہ بھی دیا جائے، اس میں ذرا کھڑا ہونا بھی ضروری ہے، سب کا مل کر ایک ساتھ تو اگر کھڑے ہو کر تنہا رسول ﷺ کا ذکر کروں اور ۲۴ گھنٹے تک آپ کے اوصاف اور کمالات بیان کروں جس میں مٹھائی نہ ہو، سلام وصلوٰۃ کے اشعار نہ ہوں تو اس کو ذکرِ رسول نہیں کہیں گے، جب مٹھائی نہیں تو ثواب بھی نہیں، برکات بھی نہیں، سب باتوں کی ان کے نزدیک نفی ہوگی، ان حضرات کے خیال اور گمان میں بس خود ہی یہ دین دار ہیں اور مولانا صاحب جو نہ ہدیے لیتے ہیں، نہ مٹھائی کے روادار ہیں، ان کا اوصافِ حمیدہ اور آپ کے کمالاتِ اصلیہ بیان کرنا ذکرِ رسول نہیں اور وہ دین دار بھی نہیں، یہ کس قدر ظلم اور بے دینی ہے اور کھلم کھلا دین میں کمی ثابت کر رہے ہیں؟ اس لیے کہ قرآن اور حدیث میں تو ان چیزوں کا نشان نہیں اور نہ تعامل صحابہؓ سے یہ بات ثابت ہے، پھر بھی یہ اس کو دین اور اس کے خلاف کو درست نہیں سمجھتے تو گویا یوں دعوی کر رہے ہیں کہ دین میں تا ہنوز کمی تھی، جس کو ہم پورا کر رہے ہے۔

(۱) سنن النسائی، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضی الله تعالی عنهما، كِتَابُ صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ، كَيْفَ الْخُطْبَةُ، رقم الحديث: ۱۵۷۸.

اہل بدعات کے لیے پانچویں دلیل

بس دین کی تو چار ہی دلیل ہیں، جو ان کو نہ مانے تو اس کے لیے پانچویں دلیل ایک اور ہے مگر وہ حاکم کے پاس ہے، حکومت جس کی بھی ہے اور وہ نعل دار جوتا ہے کہ بس اگر کسی نئی بات کو ثواب سمجھ کر کیا جائے تو وہ بدعت اور بلا نیت ثواب کرنا محض رسم ہے، جو بدعت سے کم درجہ کی ہے مگر ترک کرنا مسلمان کو اس کا بھی ضروری ہے، بس بدعتی عدمِ اکمالِ اسلام کا مدعی اور حامی ہے، معلوم ہو گیا کہ ذکرِ رسول کے ساتھ یہ قیودات لگانا ذکرِ رسول کو کم کرنا ہے، لینا دینا اور کھانا، کھلانا ہو تو الگ یوں ہی کر لو لیکن رسول اللہ ﷺ کے ذکر کے ساتھ ان کو کیوں چپکاتے ہو۔

اہل بدعت بہ زبانِ حال اکمالِ دین کے نافی اور منکر ہیں

یہ بھی کہتے ہیں کہ پاک صاف ہو کر ذکرِ رسول کرنا ہے، ورنہ نامِ نبی اور یہ زبان گندی! ہرگز ہرگز نہیں، بھلا بقول شخصے: نہ ۹ رمن تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی، نہ وضو وغیرہ ہو، نہ ذکر رسول ہو، موٹی سی بات ہے کہ اللہ کا نام اعلی اور ارفع ہے، حضور ﷺ کا درجہ تو خدا کے بعد ہی ہے تو جب اللہ کا نام بے وضو جائز ہے اور بلا صاف شفاف ہوئے ذکر اللہ جائز ہے، عقل کیا کہتی ہے؟ نیز یہ قرآن کلامِ اِلٰہی ہے قطعی اور یقینی طور سے، کیوں صاحب! تلاوت کلامِ اِلٰہی تو بے وضو جائز ہے اور درود شریف بلا وضو ناجائز ہو جائے؟ آیتِ صلوۃ پر بڑا زور لگاتے ہیں، فقہائے کرام اور مفتیانِ شرع فرماتے ہیں کہ خطیب کو زور لگا کر نہ پڑھنا چاہیے، ورنہ یہ درود کا حکم کرنا ہوگا، جو کہ منع ہے تو ایسی صورت میں گویا اس حالت میں درود پڑھنا ثواب کا دعوی کرنا ہوا، یہ بددینی ہے، مامور بہ کو تو کچھ چیزوں میں منہی عنہ اور منہی

عنہ کو مذکور اس مسئلہ میں مامور بہ بنا دیا، یہ سراسر ''أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ'' کے خلاف ہے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ بدعت اور اہل بدعت بہ زبانِ حال اکمال کے قائل کے بہ جائے نافی اور منکر ہیں۔

اجماع وقیاس کی حجیت کی بحث

دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں تمام چیزیں کلیاً، جزئیاً، فروعاً، تفصیلاً اگر قرآن پاک میں صراحۃً موجود ہوتیں تو بعض اشیاء میں حضرات صحابہؓ میں کیوں اختلاف ہوا؟ پھر کلیات سے استنباط، اجماع کیا ہوا؟ معلوم ہوا کہ غور وفکر کے بعد معاملاتِ جدیدہ کو داخل کرے۔ دلیل حدیث معاذؓ ہے: ''أَجْتَهِدُ رَأْيِي، وَلَا آلُو'' (۱)، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز بعبارۃ النص نہیں ہے، اسی لیے نص میں ایسے اصول بھی بیان ہوئے ہیں جو کہ مستلزم اجتہاد وقیاس ہیں، معلوم ہوا کہ اجتہاد وقیاس عبارۃ النص ہی سے ثابت ہیں۔

حضرت عمرؓ امیر المؤمنین نے رِبا کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ کیا اچھا ہوتا کہ تفصیل سے بیان کر جاتے (۲)۔ پھر شافعی، حنبلی حنفی کا اس میں اختلاف ہے کہ اعتبار جنس کا ہے یا موزونی، تفصیل کتابوں میں ملے گی، ہمارے یہاں جنس اور

(۱) پورا واقعہ ملاحظہ فرمائیے: عَنْ أُنَاسٍ مِنْ أَهْلِ حِمْصٍ، مِنْ أَصْحَابِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَبْعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ قَالَ: كَيْفَ تَقْضِي إِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟«، قَالَ: أَقْضِي بِكِتَابِ اللهِ، قَالَ: فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللهِ؟، قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَلَا فِي كِتَابِ اللهِ؟ قَالَ: أَجْتَهِدُ رَأْيِي، وَلَا آلُو فَضَرَبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ صَدْرَهُ، وَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ، رَسُولِ اللهِ لِمَا يُرْضِي رَسُولَ اللهِ. (سنن أبي داود، كِتَاب الْأَقْضِيَةِ، بَابُ اجْتِهَادِ الرَّأْيِ فِي الْقَضَاءِ، رقم الحديث: ۳۵۹۲)

(۲) عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، قَالَ: قَالَ عُمَرُ إِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ آيَةُ الرِّبَا، وَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيبَةَ (مسند أحمد، عقم الحديث: ۲۴۶)

موزونی، مکیلی کا اعتبار ہے، مجتہدین نے آیات واحادیث سے قواعد کا استنباط کیا تو غیر مقلدوں کا فقہ اجماع، قیاس سے انکار کرنا اور ہنسنا محض باطل اور احمقانہ وسفیہانہ حرکت ہے، اس آیت سے ان کے استدلال کا کوئی مس نہیں، صحابہؓ کے قدیم زمانہ، عشرہ مبشرہ کے زمانے سے قرآن وحدیث سے استنباطات ثابت ہیں حضرات صحابہؓ نے استنباطات کیے اور اجماع وقیاس کا وہیں سے ثبوت ہے۔

باب سے اس حدیث کو مناسبت اس طرح ہے کہ آیت میں اکمالِ دین کو ثابت وبیان فرمایا اور کمال کی دوسری جہت نقصان ہے کہ جو شخص پوری طرح سے دین پر نہیں چلے گا، اس کا دین ناقص ہوگا۔ جیسے امام بخاریؒ نے ''أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ'' پر ''فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ'' متفرع فرمایا تھا، پس مناسبت بالکل ظاہر وواضح ہے (۱)، اللہ تعالی توفیق تکمیل ایمان عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

۞ ۞ ۞

(۱) وقال ابن بطال :هذه الآية يعني قوله تعالى :{اليوم أكملت لكم دينكم} (المائدة :٣) حجة في زيادة الإيمان ونقصانه، لأنها نزلت يوم كملت الفرائض والسنن واستقر الدين، وأراد الله عز وجل قبض نبيه، فدلت هذه الآية أن كمال الدين إنما يحصل بتمام الشريعة، فتصور كماله يقتضي تصور نقصانه.(عمدة القاري/١/٢٥٨)

الدرس الخمسون

بَابٌ :الزَّكَاةُ مِنَ الإِسْلاَمِ

وَقَوْلُهُ:{وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلاَةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِك دِينُ الْقَيِّمَةِ} [البينة:۵]

تلاوتِ آیت ختم فرما کر ترجمہ فرمایا اور لفظ ''حُنَفَاءَ'' پر ارشاد فرمایا کہ اس کے معنی کفریات اور شرکیات و اخلاقِ رذیلہ سے پاک اور تمام مخلوق کی محبت کے غلبہ سے، غرض غیر کی شرکت سے خالص کرنا، خالص ہونا، یہ معنی ہیں، اسی کو خلوص کہتے ہیں (۱) تو تمامی اعمال میں خلوص ملحوظ رکھنا ''حُنَفَاءَ'' کے اندر رکھا ہے۔

خلوص کے تین درجے ہیں: (۱) ایک یہ کہ تمام ضروریات کا مالک حق کو جان کر اس کا استحضار کر کے عبادت ہو۔ (۲) منفعت کا یقین اور مضرت کا دفع ضروری سمجھ کر عبادت کی جائے، سمجھتا ہے کہ اگر عبادت نہ کی جائے تو اس پر انتہائی مضرت دوزخ (جس کے مقابلہ دنیا کی مضرت کچھ نہیں اس) کا عذاب ہوگا تو دوزخ سے بچنے اور نجات پانے کے لیے عبادت کرے اور تا کہ اعلی منفعت یعنی جنت حاصل ہو۔

(۳) تیسرا یہ کہ حصولِ منفعت اور حصولِ نجات کا کوئی خیال نہیں، قطع نظر منفعت اور مضرت سے کرتے ہوئے اور حاجت روائی سے بھی قطع نظر اس کے قلب میں یہ جا گزیں ہے کہ میں غلام اور الہ حق میرا آقا ہے، اس کا ذاتی حق مجھ پر ہے کہ اس کی غلامی اور تابع داری، فرماں برداری اور شکر گزاری میں رہوں، ہمہ وقت اسی کے دھیان اور خیال میں رہوں، کوئی آن اور کوئی سانس اس سے غفلت نہ ہو، کوئی گھڑی اس کی رضا سے خالی نہ گذرے، مجھے دنیا اور مال طلبی، جاہ طلبی،

(۱) حُنَفاءَ لِلّٰهِ ای مخلصین له الدين من الحنف محركة وهو الاستقامة كذا في القاموس والاستقامة على الحق هو الإخلاص لله والاعراض عما سواه غَيْرَ مُشْرِكِينَ به في العبادة ولا في اثبات وجوب الوجود والالوهية.(التفسير المظهري:۳۱۸/۶،فی تفسير قوله تعالى :حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ.[الحج:۳۱])

شہرت اور مخلوق کی نظر میں بڑا بننا اور حصولِ راحت وجنت اور مضرت سے بچنے کا خیال نہیں، بس مطمح نظر ہر وقت اس کی رضاء ہو، بیماری، تن درستی اور کھانا کھلانے اور نہ کھلانے ہر حال میں راضی ہوں، یہ اخلاص کا اعلی درجہ ہے(۱)۔

اخلاص کے مقابل ریا ہے، کسی عبادت کے وقت مخلوق کی نظر میں بڑا بننا اور مال طلب کرنا یا شہرت ہوجانا خیال میں ہو، یا مخلوق کی نظر میں اعتمادیت واعزاز حاصل ہو کر ان سے اپنے کاموں میں نصرت اور سہولت حاصل ہو، اس طرح ان اغراض کے ساتھ عبادت کرنا ریا ہے، ارادۂ امور مذکورہ سے رِیا ہوتی ہے اور عبادت کے اثناء ان امور میں سے کوئی خیال اور تصور میں آجائے تو وہ ریاء نہیں، فقط وسوسۂ ریا ہے اور وسوسۂ رِیا اور چیز ہے، رِیا اور چیز ہے(۲)،حنفیت اخلاص

---

(۱) ومراتب الإخلاص ثلاث :الأولى:إخلاص الانبياء والمرسلين والتابعين لهم بإحسان وهو العمل لله وحده دون ملاحظة أي غرض دنيوي ولا أخروي بل لمجرد الحب لله وطاعة أمره.والثانية :العمل لله وحده ليمنح الله العامل المخلص حظا أخرويا، مثل تكفير الذنوب، والظفر بالجنة.والثالثة :العمل لله وحده رغبة في حظ دنيوي مباح، كتوسعة الرزق، ودفع المؤذيات.(مكفرات الذنوب وموجبات الجنة لابن الديبع الشافعي علیہ الرحمۃ:ص ۹۹)

(۲) اس کی دلیل یہ حدیث ہے:عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ:قِيلَ:يَا رَسُولَ اللهِ، الرَّجُلُ يَعْمَلُ الْعَمَلَ يَسُرُّهُ، وَإِذَا اطَّلِعَ عَلَيْهِ سَرَّهُ ذَلِكَ وَأَعْجَبَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ " لَهُ أَجْرَانِ، أَجْرُ الْعَلَانِيَةِ، وَأَجْرُ السِّرِّ "۔(شعب الإيمان،بَابُ فِي السُّرُورِ بِالْحَسَنَةِ وَالِاغْتِمَامِ بِالسَّيِّئَةِ،رقم الحديث:۶۶۰۶) بعض علماء نے یہ تفصیل بیان فرمائی ہے:فإذا عقد الإنسان نيته على العمل مخلصا لله، ثم طرقه الرياء أثناء العمل فلذلك حالتان : الأولى:أن يكون العمل مما يرتبط آخره بأوله، كالصلاة والصوم ونحوهما، وهذا إذا صحح الإنسان نيته في أوله، ثم طرقه الرياء، فلا شيء عليه إذا حاول دفع الرياء والتخلص منه قدر طاقته.الثانية:أن يكون العمل مما تستقل اجزاؤه، كالقراءة والأذكار، بدأها مخلصا، ثم طرقه، فلا ثواب لما بعد طروق الرياء وإذا عمل العمل مخلصا كما يجب عليه، وبعد الانتهاء منه أثنى الناس عليه فلا يضره، لحديث مسلم :تلك عاجل بشرى المسلم۔(مكفرات الذنوب وموجبات الجنة لابن الديبع الشافعي علیہ الرحمۃ:ص ۱۰۱)

کے درجات ہی کی تکمیل اور اعلیٰ درجہ اخلاص کا نام ہے کہ تمامی ماسوا اللہ سے تمامی اوقات میں قلب کو خالی اور حق کے ساتھ مشغول رکھا جائے۔

آیت میں عبادت کے ساتھ باوجود اخلاص کے ذکر ہونے کے اس کی یعنی حنفیت کی قید اس واسطے لگائی کہ بدون اس کے اگرچہ اخلاص ہو کہ ادنی درجہ اخلاص کفر وشرک سے خالص ہونا ہے، یہ تو حاصل ہو لیکن اس کے علاوہ دیگر علائق وخلائق سے تخلیۂ قلب وصفائے قلب نہ ہو تو اعمال کے انقطاع کا ہمہ وقت اندیشہ ہے اور یوں اگرچہ باوجود صفاء وجلائے قلب کے بھی اس کی بے نیازی کے پیش نظر خطرہ ہے لیکن اس کے ہوتے ہوئے ان کی عادت نہیں، شمول فضل ہی رہتا ہے، تاہم عجز ونیاز ضروری ہے، نازنا زیبا ہے، اس لیے اخلاص کے ساتھ حنفیت بھی ضروری ہے۔

اس باب سے مقصد امام بخاریؒ کا مرجیہ کی اس بات کی تردید ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی، یہ سلسلہ پہلے سے چلا آرہا ہے، مختلف عنوانات اور مختلف دلائل کے ساتھ ان کے باطل مذہب کا استیصال فرمارہے ہیں اور اس کا بے بنیاد ہونا واضح فرمارہے ہیں اور مذہب حق کا احقاق واثبات مکمل ومدلل فرمارہے ہیں۔

چناں چہ اس باب کو منعقد فرمایا اور ترجمۂ باب کو بہ حیثیت دعوی اور حسبِ عادت آیت شریفہ کو دلیل اور اور پھر حدیث کو مسند دلیل میں پیش فرمایا، فرماتے ہیں زکوٰۃ اسلام سے ہے یعنی اسلام کا جزء ہے اور اسلام وایمان ایک چیز ہے، پس ایمان کا بھی جزء ہوا اور ترتیب نہایت عجیب اختیار فرمائی کہ اس سے قبل عبادات بدنیہ کو ذکر فرمایا، اب یہاں عبادت مالیہ کو ذکر فرمارہے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

وصلى الله على سيدنا خير خلقه محمد وأله وأصحابه أجمعين

☆☆☆

ادارہ فیض مسیح الامت

بڑوت باغپت (یوپی) الہند

اجمالی تعارف ۱۴۴۳ھ/ ۲۰۲۲ء

بیاد : مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ

بانی : مفکر ملت رأس العلماء حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

مہتمم : حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب زید مجدہم

ناظم اعلیٰ: حضرت مولانا محمد کامل صاحب دامت فیوضہم

نظام وخصوصیات :

دار العلوم دیوبند کے طرز اور حضرات اکابر کے منہج پر تعلیمی معیار کی بلندی کے ساتھ اخلاقی وتہذیبی، فکری اور لسانی تربیت پر خصوصی توجہ۔

ارتباط : رابطۂ مدارس عربیہ دار العلوم دیوبند

دینی تعلیم: از ابتدائی درجات، حفظ قرآن کریم مع تجوید، فارسی تا عربی دوم

عصری تعلیم: شعبۂ نرسری سے پانچویں کلاس تک (حکومت ہند سے منظور شدہ)

جمعیۃ اوپن اسکول: دسویں کلاس تک

شعبۂ نشریات: حضرت مسیح الامت وحضرت مفکر ملت کی تالیفات کی اشاعت وحفاظت

تعداد اساتذہ وملازمین: ۱۲

تعداد بیرونی طلبہ (کرونائی صورت حال کے پیش نظر) ۵۰

تعداد مقامی طلبہ وطالبات: ۲۶۰

کل طلبہ وطالبات (داخل شدہ) ۳۱۰

سالانہ اخراجات: ۲۳۴۸۵۱۸

سالانہ غلہ خرچ: ۴۰/ کونٹل

اشد ضروریات اور عزائم ومنصوبے

درس گاہیں... ۱۰/ عدد برائے تعلیم

تعمیر دار الاساتذہ... ۱۰/ کمروں پر مشتمل

تعمیر برآمدہ موجودہ عمارت کے سامنے

تعمیر نصیریہ لائبریری... مع دفاتر

بیت الخلا اور غسل خانے: ۱۲ عدد

دار الاقامہ : دو منزلہ عمارت

۳۰/ کمروں پر مشتمل

تذکرۂ نصیر اکابرین کی نظر میں

اکابر کی سوانح عمری سے جہاں ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا تعارف حاصل ہوتا ہے، وہیں پس آئندگان کو اپنے علمی وعملی سفر حیات میں روشنی بھی حاصل ہوتی ہے..... حضرت مفتی نصیر احمد صاحبؒ بلند پایہ علمی شخصیت کے حامل تھے، خاص طور پر فقہ وفتاویٰ میں ان کو رسوخ حاصل تھا، ساتھ ہی طویل مدت تک درس حدیث کی ذمہ داری بھی ادا کی.... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، اور حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کو نسلِ نو کے لیے نمونۂ عمل بنائے۔

حضرت الاستاذ مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب زید مجدہم
مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

"تذکرۂ نصیر" حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کا مفصل تذکرہ ہے، یوں تو ہمارے زمانے میں سرسری طور پر بہت سے افراد واشخاص کے بارے میں تحریریں سامنے آتی رہتی ہیں؛ لیکن زیر نظر تذکرہ ایک باقاعدہ مفصل کتاب اور سوانح عمری ہے، جس کا تعلق ایک ایسی شخصیت سے ہے جن کی زندگی میں بہت کچھ انفرادیت اور سبق آموزی کا سامان موجود ہے۔

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری نقشبندی
استاذ حدیث وفقہ ومدیر اعلی ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

"تذکرۂ نصیر" مرتب ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے، جو بہت ہی خوشی وفرحت کا باعث ہے، اور احقر اس پر خوشی وفرحت کے جن جذبات واحساسات کو اپنے اندر پا رہا ہے، ان کو بیان کرنے کے لیے میں ذخیرۂ الفاظ وتعبیرات کو ناقص

ومحدود سمجھ رہا ہوں ، اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر میں اس عظیم کام(جس کو کارنامہ کہنا مناسب ہے) کو حضرت الاستاذؒ کے باصلاحیت صالح نوجوان نواسے مولانا محمد کلیم نعمانی قاسمی کے حق میں لکھ دیا تھا؛ چناں چہ موصوف نے اس کام کو بڑی دل چسپی اور عرق ریزی کے ساتھ انجام دیا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب
مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

مرتب کتاب کی زبان بہت اچھی اور بیان میں سلاست ہے، اس لیے پڑھنے والا دل چسپی کے ساتھ کتاب پڑھنے پر مجبور ہوگا ، اس کا مجھے یقین ہے ، قاری جب کتاب پڑھے گا تو یقیناً علم وعمل کے راستے پر اس کی خوب رہنمائی بھی ہوگی ، مبارک باد پیش ہے مولانا محمد کلیم نعمانی صاحب کی خدمت میں کہ وہ اپنے نام ور نانا کا یہ تذکرہ لانے میں کامیاب ہوئے اور جلد لے آئے .... ایسے تذکرے ترتیب دیے جانے چاہئیں اور ایسے شہرۂ آفاق افراد کی زندگی کے گوشوں کو ابھارنا چاہیے، جو دوسروں کے لیے عمل کی تمہید بنیں۔

حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب
استاذ و ادیب دارالعلوم وقف دیوبند

☆☆☆

ہماری اہم مطبوعات



Design By: Suhail Graphics Ph: 8791972418

MADINA ACADEMY, SWINDON ROAD, DEWSBURY,
WEST YORKSHIRE ,WF13 2PA, ENGLAND
Tel: 00 44 7852 762 632 / Website: madinaacademy.org.uk

IDARA FAIZ-E-MASIHUL UMMAT
Baraut, Dist. Baghpat U.P India

زیر نظر جدید ترتیب حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب لاجپوری — دامت فیوضہم — کی سر پرستی و نگرانی میں متعدد حضرات کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ و نتیجہ ہے، جو آج ہمارے سامنے ایک خوب صورت و حسین گل دستے کی شکل میں موجود ہے اور اس میں ان حضرات نے ماشاء اللہ متعدد امور کا لحاظ واہتمام فرمایا ہے:

(۱) پوری کتاب کو از سر نو کمپیوٹر سے کتابت کرا کر اس کے ظاہری حسن کو بھی دوبالا کر دیا گیا ہے۔

(۲) احادیث کی تخریج کا اہتمام کر کے اس کے باطنی جمال کو مزید نکھار دیا ہے۔

(۳) احادیث کے علاوہ جہاں فنی موضوعات پر کلام ہے، اس کو بھی متعلقہ کتابوں سے مدلل کیا گیا ہے۔

(۴) کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے، ان کا مختصر و جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

(۵) بعض جگہ علمی موضوعات پر مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ان امور کی وجہ سے کتاب کی افادیت دوبالا ہو گئی اور لوگوں کے لیے اس سے استفادے و انتفاع میں بھی سہولت ہو گی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم و مدت فیوضہم
(بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور)

حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب کے قدم اٹھاتے ہی توفیق ایزدی شامل حال ہوئی اور رفقائے کار کی ایک جماعت مل گئی، جس نے اس کام کو خوب سے خوب تر بنانے میں جہد مسلسل اور محنتیں صرف کیں، رفقائے کار کی اس جماعت (مولانا خلیل احمد قاضی صاحب لاجپوری ، مولانا محمد کلیم نعمانی نواسۂ گرامی حضرت مفکر ملتؒ، مولانا عظیم الدین صاحب تراج گجرات) کا یہ کام (جس کی مکمل تفصیل حضرت مولانا نے اپنے مقدمے میں بڑی جامعیت کے ساتھ رقم فرمائی ہے) حوصلہ افزا، قابل تحسین اور لائق مبارک باد ہے، خاص طور پر مسرت پر میں اضافہ کا باعث ہے کہ نوجوان فاضل عزیز گرامی مولانا محمد کلیم نعمانی حفظہ اللہ کی مساعی جمیلہ سے فضل الباری کا غیر مطبوعہ حصہ بھی اس میں شامل ہو گیا، جس سے اس کی افادیت میں یقیناً مزید اضافہ ہوگا ان شاء اللہ۔

حضرت مولانا محمد وصی اللہ خان صاحب (آرزو میاں) مدظلہ
ناظم جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد شاملی
